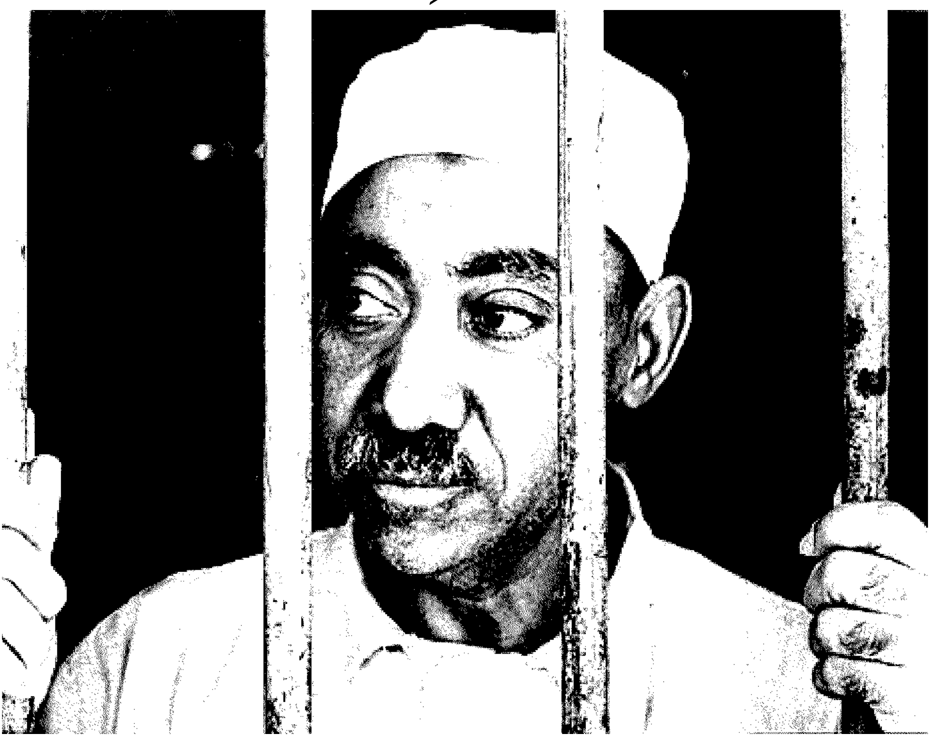
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معالم فی الطریق

نشانِ راہ



سید قطب شہید رحمہ اللہ

فہرست مضامین

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مصنف اور تصنیف

سید قطب شہید رحمہ اللہ اور ان کے دوسرے ساتھیوں پر جب قاہرہ کی فوجی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا تو دوران مقدمہ سرکاری وکیل کی طرف سے ہر ملزم سے یہ سوال کیا گیا کیا اُس نے ''معالم فی الطریق'' کا مطالعہ کیا ہے۔ اس مقدمہ کی فردِ قرار دادِ جُرم اسی کتاب کے مضامین پر مشتمل تھی۔ چنانچہ یہی کتاب سید قطب رحمہ اللہ اور ان کے ساتھیو کو تختۂ دار پر لے جانے کا موجب ہوئی (روزنامہ المنار، اردن شمارہ ۳۰ اگست ۱۹۶۶ء) لیکن یہ کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے۔ تاریخ میں متعدد ایسی کتابیں ملتی ہیں جو اپنے مصنفین کے لیے پیغام اجل لے کر آئیں۔ خود پاکستان کی تاریخ بھی اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ پیش آ چکا ہے۔

مصر کا ایک دور وہ تھا جب وہاں بادشاہت کا سکہ رواں تھا اور جسے اب تاریخ مصر کے سیاہ باب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سیاہ دور کا واقعہ ہے کہ مصر کے نامور مصنف عباس محمود العقاد نے ۱۹۳۱ء میں پارلیمنٹ میں شاہ مصر احمد فو اُد پر شدید تنقید کی، چنانچہ انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ مگر زیادہ دن نہ گزرنے پائے کہ انہیں رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد عقاد کے ایک دوست نے اُن سے دریافت کیا کہ ''کیا یہ خبر صحیح ہے کہ احمد فو اُد نے وزیر اسماعیل صدقی کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ آپ کو یہ مشورہ دے کہ آپ کچھ نہ کچھ معذرت پیش کر دیں تا کہ اُسی کی بناء پر آپ کو رہا کر دیا جائے؟ عقاد نے اس خبر کی تصدیق کرتے ہوئے کہا: ''دراصل احمد فو اُد اس بات سے ڈر گیا کہ تاریخ کے صفحات پر یہ ثبت ہو جائے گا کہ اُس کے عہد میں ایک اہل قلم کو آزادیٔ فکر کی پاداش میں نذرِ زنداں کر دیا گیا'' (مقالہ ''محنۃ الفکر'' از قلم یوسف حنا، شائع شدہ روزنامہ الدفاع، اردن شمارہ ۳۱ اگست ۱۹۶۶ء)۔ اُس سیاہ دور کے بعد مصر میں ۲۶ جولائی ۱۹۵۲ء کی صبح ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے جسے ''اجتماعی مساوات'' کے عہد سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی

''عہدِ زریں'' کا یہ واقعہ ہے کہ ایک ایسی کتاب کی تصنیف پر، جس میں نہایت جچے تُلے انداز میں اصولی بحثیں کی گئی ہیں اور کسی شخصیت کو زیرِ بحث نہیں لایا گیا، مصنف کو پھانسی دی جاتی ہے۔ ہم اسی جاوداں کتاب کا اردو ترجمہ اپنے مُلک کے اہل علم کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں ۔اور چاہتے ہیں کہ قارئین تصنیف سے پہلے خود مصنف کا تعارف حاصل کر لیں۔

مصنف کے حالاتِ زندگی اُردو میں کسی نہ کسی حد تک منتقل ہو چکے ہیں۔ لیکن مصنف کی عبقری شخصیت کا تقاضا ہے کہ ان کے حالات کو زیادہ تفصیل اور جامعیت کے ساتھ ہند و پاک کے اہلِ علم و دعوت کے سامنے لایا جائے۔

خاندانِ قطب

مصنف کا اصل نام سیّد ہے۔ قطب ان کا خاندانی نام ہے۔ ان کے آباء اجداد اصلاً جزیرۃ العرب کے رہنے والے تھے۔ ان کے خاندان کے ایک بزرگ وہاں سے ہجرت کر کے بالائی مصر کے علاقے میں آباد ہو گئے ۔انہی کی اولاد میں سے سید قطب اور محمد قطب ،اور تین لڑکیاں حمدہ قطب اور امینہ قطب ،تیسری لڑکی کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ ان میں پانچوں بہن بھائیوں میں سید سب سے بڑے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی محمد قطب بھی بڑے صاحبِ علم وفضل ہیں ۔ان کے قلم سے اب تک ۱۱ سے زائد ضخیم کتابیں مختلف اسلامی موضوعات پر نکل چکی ہیں اور علمی وتحریکی حلقوں سے غیر معمولی داد وستائش حاصل کر چکی ہیں۔ امینہ قطب بھی بڑی پڑھی لکھی خاتون ہیں ،اور دعوت و جہاد میں اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ سرگرمِ کار رہی ہیں۔ ان کے اصلاحی اور معاشرتی مضامین بھی مختلف جرائد میں چھپتے رہتے ہیں ۔ان کے اِصلاحی افسانوں کو ایک مجموعہ ''فی تیار الحیاۃ'' کے نام سے چھپ گیا ہے۔ ان کی دوسری بہن حمیدہ قطب بھی میدان جہاد میں اپنے بھائیوں سے پیچھے نہیں رہی ہیں۔ یوں خاندان قطب کا ہر فرد گوہر یک دانہ نظر آتا ہے۔ اور اس مثل کا صحیح مصداق ہے کہ ایں خانہ ہمہ آفتاب است ۔صبر و عزیمت

اور آزمائش و ابتلاء میں بھی اسی خاندان نے بیسویں صدی میں جس اعلیٰ کردار کا نمونہ پیش کیا ہے اس نے آلِ یاسر کی مثال زندہ کر دی ہے۔ سیّد قطب رحمہ اللہ نے تختۂ دار کو چوم لیا۔ محمد قطب جیل میں ڈال دیئے گئے اور تعذیب و تشدد کا نشانہ بنے۔ حمیدہ قطب کو بھی سات سال قید با مشقت کی سزا ملی۔ امینہ قطب بھی ایسے ہی انجام سے دوچار ہوئی۔ تیسری بہن نے بھی جن کا صحیح نام معلوم نہ ہوسکا سید رفعت نامی اپنا ایک لختِ جگر راہِ حق میں قربان کر دیا۔ اور جلاد کے تازیانوں نے اُسے شہید راہِ الفت کے خطاب سے نواز دیا۔

سید رحمہ اللہ کے حالاتِ زندگی

سید قطب ۱۹۰۶ء میں مصر کے ضلع اُسْیُوط کے موشا نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ سید قطب کی والدہ کا اسم گرامی فاطمہ حسین عثمان تھا۔ موصوفہ بڑی دیندار اور اللہ پرست خاتون تھیں۔ انہیں قرآن مجید سے بڑا شغف تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے بچے قرآن کے حافظ ہوں۔ سید قطب اپنی کتاب (التصویر الغنی فی القرآن) کا انتساب اپنی والدہ محترمہ کی طرف کرتے ہوئے موصوف کی قرآن سے محبت و شیفتگی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

> ''اے میری ماں! گاؤں میں رمضان کا پورا مہینہ جب ہمارے گھر پر قاری حضرات قرآن کی دل نشیں انداز میں تلاوت کیا کرتے تھے تو تُو گھنٹوں کان لگا کر، پوری محویت کے ساتھ پردے کے پیچھے سنا کرتی تھی۔ میں تیرے پاس بیٹھا جب شور کرتا تھا جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے تو مجھے اشاروں کنایوں سے باز رہنے کی تلقین کرتی تھی اور پھر میں بھی تیرے ساتھ کان لگا کر سننے لگ جاتا۔ میرا دل الفاظ کے ساحرانہ لحن سے محفوظ ہوتا اگرچہ میں اس وقت مفہوم سے ناواقف تھا۔''
>
> ''تیرے ہاتھوں میں جب پروان چڑھا تو تُو نے مجھے بستی کے ابتدائی مدرسہ میں بھیج

دیا۔ تیری سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ اللہ میرے سینے کو کھول دے اور میں قرآن حفظ کرلوں اور اللہ مجھے خوش الحانی سے نوازے اور میں تیرے سامنے بیٹھا ہر لمحہ تلاوت کیا کروں۔ چنانچہ میں نے قرآن حفظ کرلیا اور یوں تیری آرزو کا ایک حصہ پورا ہوگیا۔''

''اے ماں! تیرا ننھا بچہ، تیرا نوجوان لختِ جگر آج تیری تعلیم و تربیت کی طویل محنت کا ثمرہ تیری خدمت میں پیش کررہا ہے، اگر حسن ترسیل کی اس میں کمی ہے تو حسنِ تاویل کی نعمت سے وہ ضرور بہرہ ور ہے۔''

سید کے والد بڑے باخدا اور درویش منش انسان تھے۔ان کا پیشہ زراعت تھا۔سید نے اپنی کتاب(مشاهد القيامة فى القرآن) کا انتساب اپنے مرحوم والد کی طرف کیا ہے۔اس انتساب میں وہ اپنے والد کے تعلق باللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اے باپ! یہ کاوش تیری روح کی نذر کرتا ہوں۔میں بچہ ہی تھا کہ تو نے میرے احساس ووجدان پر یوم آخرت کا خوف نقش کردیا۔تو نے مجھے کبھی نہیں جھڑکا تھا۔ بلکہ تو میرے سامنے اس طرح زندگی بسر کررہا تھا کہ قیامت کی باز پرس کا احساس تجھ پر طاری رہتا تھا۔ ہر وقت تیرے قلب وضمیر میں اور تیری زبان میں اس کا ذکر جاری رہتا تھا۔تو دوسروں کا حق ادا کرت وقت اپنی ذات کے ساتھ تشدد برتتا اور دوسروں سے اپنا حق وصول کرتے وقت تسامح سے کام لیتا تھا۔اس کی وجہ تو یہ بتایا کرتا تھا کہ اصل حساب روز قیامت کو ہوگا۔تُو تو برائیوں سے درگزر کرتا تھا حالانکہ تجھ میں ان کو جواب دینے کی قدرت ہوتی تھی، کیونکہ تو انہیں قیامت کے روز اپنے لیے کفارہ سمجھتا تھا، بسا اوقات تو اپنی ضرورت اشیاء دوسروں کو پیش کردیتا حالانکہ تو خود ان کا شدید حاجت مند ہوتا تھا۔لیکن تو کہا کرتا تھا کہ زادِ آخرت جمع کررہا ہوں۔ تیری

صورت میں میرے تخیل پر مرتسم ہے۔عشاء کے کھانے سے جب ہم فارغ ہو جاتے تو تو قرآن کی تلاوت کرنے لگ جاتا اور اپنے والدین کی روح کو ثواب پہنچاتا۔ہم چھوٹے چھوٹے بچے بھی تیرے ساتھ اِدھر اُدھر کی چند آیات گنگنانے لگتے جو ہمیں پوری طرح یاد نہ ہوتی تھیں۔''

سید رحمہ اللہ کی تعلیمی زندگی

سید کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے سادہ اور محدود ماحول میں ہوئی۔انھوں نے اپنی والدہ محترمہ کی دلی آرزو کے مطابق بچپن میں قرآن حفظ کرلیا۔اس زمانے میں مصر کے دیندار گھرانوں میں حفظِ قرآن کا عام رواج تھا۔اور خاص طور پر جو خاندان اپنے بچوں کو ازہر میں تعلیم دلانے کا شوق رکھتے تھے انہیں لازماً بچوں کو قرآن حفظ کرنا پڑتا تھا۔سید کے والدین اپنے اس ہونہار اور اقبال مند بچے کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بڑے متفکر تھے۔چنانچہ قدرت کی طرف ایسا اتفاق ہوا کہ سید کے والدین گاؤں چھوڑ کر قاہرہ کی ایک نواحی بستی حلوان میں آباد ہوئے۔اور یوں سید کے لیے اللہ تعالیٰ نے تعلیمی ترقی اور عروج کی راہ ہموار کردی۔سید قاہرہ کے ثانوی مدرسہ سے (تهجيزية دار العلوم) میں داخل ہوگئے۔اس مدرسہ میں ان طلباء کو داخل کیا جاتا تھا جو یہاں سے فارغ ہو کر ''دارالعلوم'' (موجودہ قاہرہ یونیورسٹی) میں تکمیل تعلیم کرنا چاہتے تھے۔اس دور میں جس طرح دینی و شرعی علوم کی اعلیٰ تعلیم گاہ ازہر یونیورسٹی تھی۔اسی طرح دارالعلوم جدید علوم وفنون کا اعلیٰ تعلیمی ادارہ تھا۔سید نے ''تہجیز یہ دارالعلوم'' سے فراغت حاصل کرتے ہی ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم قاہری میں داخلہ لے لیا۔اور ۱۹۳۲ء میں یہاں سے بے اے ایجوکیشن کی ڈگری حاصل کی۔اور اپنی خداداد ذہانت کی وجہ سے اسی کالج میں پروفیسر لگا دیئے گئے۔

سرکاری ملازمت اور سفر امریکہ

کچھ عرصہ تک دارالعلوم قاہرہ میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے رہے۔پھر انہیں وزارت تعلیم میں انسپکٹر آف اسکولز لگا دیا گیا۔مصر میں یہ عہدہ بڑے اعزاز وافتخار کا منصب سمجھا جاتا رہا ہے۔تاریخ التشریع الاسلامی کے مؤلف علامہ محمد الخضری بک جیسے فقیہہ مورخ بھی اسی عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں ۔اسی دوران انہیں وزارت تعلیم کی طرف سے جدید طریقہ تعلیم وتربیت کے مطالعہ کے لیے امریکہ بھیجا گیا۔اوردوسال قیام کے بعد امریکہ سے لوٹے امریکہ میں ان کا قیام تھوڑے عرصہ کے لیے مختلف کالجوں میں ہوا۔واشنگٹن کے وِلسن ٹیچرس کالج،گریلی کولوراڈ کے ٹیچرس کالج۔اورکیلیفورنیا میں اسٹان فورڈ یونیورسٹی میں ان کا قیام رہا۔اس کے علاوہ نیویارک،شکاگو،،سان فرانسسکو،لاس اینجلز اور دوسرے شہروں میں بھی جانے کا موقع ملا۔امریکہ سے واپسی پر انھوں نے انگلستان،اٹلی اور سوئٹزرلینڈ میں بھی چند ہفتے گزارے (ملاحظہ ہو''اسلام کا عدلِ اجتماعی''مقدمہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی)۔امریکہ کا مختصر قیام اُن کے لیے بڑے خیروبرکت کا موجب ہوا۔موصوف نے مادّی زندگی کی تباہ کاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔چنانچہ انہیں اسلام کی حقانیت وصداقت پر مزید اطمینان ہوا۔اوروہ یہ یقین لے کر واپس آئے کہ انسانیت کی اصل فلاح صرف اسلام میں ہے۔

''اخوان المسلمون''میں شمولیت

امریکہ سے واپس آتے ہی انھوں نے اخوان المسلمون کی طرف توجہ دی،ان کی دعوت کا مطالعہ کیا اور بالآخر ۱۹۴۵ء میں وہ اخوان سے وابستہ ہوگئے (ملاحظہ ہو''الشہید سید قطب''ص ۲۷ مقالہ یوسف العظم)۔یہ وہ دور تھا جب دوسری عالمی جنگ ختم ہوچکی تھی اور اخوان المسلمون کی تحریک نے عوامی پیمانے پر سیاسی مسائل میں حصہ لینا شروع کردیا تھا۔دورانِ جنگ انگریزوں نے آزادیٔ مصر کا جو وعدہ

کیا تھا اخوان نے اسے پورا کرنے کا مطالبہ کرر کھا تھا۔اس سے ایک طرف اگر اخوان کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا تھا تو دوسری طرف انگریزی استعمار اور شاہی استبداد کی ملی بھگت سے ان کے لیے تکالیف ومصائب کے نئے دروازے بھی کھل گئے تھے۔اخوان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دو سالوں کے اندر اندران کے صرف کارکنوں کی تعداد ۲۵ لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔اور عام ارکان اور ہمدردوں اور حامیوں کی تعداد اس سے بھی دوگنی تھی (الاخوان المسلمون والمجتمع المصری تالیف محمد شوق زکی ص ۲۱)۔۱۲ فروری ۹۴۹۱ء میں اخوان کے مرشد عام استاذ حسن البناء شہید کر دیئے گئے،اور جماعت کو خلافِ قانون قرار دیا گیا۔آزمائش کا یہ مرحلہ مصر میں فوجی انقلاب کے قیام تک جاری رہا۔جولائی ۱۹۵۲ء میں فوجی انقلاب برپا ہوا جس نے بے شک اخوان المسلمون کی آزمائش کے ایک دور کو ختم کر دیا مگر ساتھ ہی آلام ومصائب کا ایک ایسا دور شروع ہوا کہ بقول غالب ؎

درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

اس آزمائش کے بعد اخوان کے اندر جن لوگوں کو نمایاں اہمیت حاصل ہوئی ان میں ایک حسن الہضیبی ہیں جو بعد میں اخوان المسلمون کے مُرشد عام منتخب ہوئے اور دوسرے عبدالقادر عودہ شہید ہیں جو جماعت کے جنرل سیکریٹری (وکیل) مقرر ہوئے۔اور تیسرے جناب سید قطب جنھوں نے فکری میدان میں جماعت کی عظیم الشان خدمات سرانجام دیں۔

۲۵۹۱ء کے وسط میں اخوان المسلمون کی تحریک دوبارہ بحال ہوئی۔فاروق کا دور جبر ختم ہوا۔اخوان کے رہنما اور کارکن جیلوں سے رہا ہوئے،اور حسن الہضیبی کی قیادت میں میں قافلہ تحریک نئے ولولوں سے وقفِ سفر ہوا۔استاذ سید قطب اخوان کے مکتب الارشاد (مجلس عاملہ) کے رکن منتخب ہوئے۔جماعت کے مرکزی دفتر می انہیں شعبہ توسیع دعوت کا رئیس (انچارج) مقرر کر دیا گیا۔۵۲ء سے پہلے تو وہ جماعت کے ایک عام رکن تھے مگر اب ان کا شمار رہنماؤں میں ہونے لگا۔اور انھوں نے اپنی زندگی ہمہ تن دعوت وجہاد کے لیے وقف کر دی۔اور مختلف پہلوؤں اور مختلف طریقوں سے اس تحریک کی خدمت

کی ۔مارچ ۱۹۵۳ء میں مصر کے معاشرتی بہبود کے سرکل نے سید قطب کو معاشرتی بہبود کانفرنس میں شرکت کے لیے دمشق بھیجا۔سید موصوف نے اس کانفرنس میں متعدد لیکچرز دیئے جن میں قابل ذکر لیکچر یہ تھا''التربية الخلقية كوسيلة لتحقيق التكافل الاجتماعى ''(اخلاقی تربیت اجتماعی کفالت کو بروئے کار لانے کا ایک ذریعہ ہے)۔کانفرنس سے فارغ ہوکر سید موصوف اردن کی زیارت کو روانہ ہوئے۔مگر اردنی حکام نے انہیں سرحد پر روک لیا اور اردن میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔اردنی حکام کا یہ اقدام گلپ پاشا کے احکام کی بناء پر عمل میں آیا جو ان دنوں اردن کے سیاہ وسفید کا مالک تھا۔دسمبر ۱۹۵۳ء میں سید قطب کو اخوان کے مکتب الارشاد کی طرف سے بیت المقدس میں منعقد ہونے والی اسلامی کانفرنس میں بھیجا گیا۔اس مرتبہ چونکہ سید قطب عالم اسلامی کے وفود کے ہمراہ اردن میں داخل ہوئے تھے اس لیے اردنی حکام کی طرف سے ان سے تعرض نہیں کیا گیا ورنہ سید قطب کی آتشیں تحریروں سے گلب پاشا کو جو چڑ تھی اس کی بنا پر ان کا اردن میں قدم رکھنا آسان نہ تھا۔جولائی ۵۴ء میں اخوان کی ''مجلس دعوت اسلامی'' نے سید قطب کو جریدۃ ''اخوان المسلمون'' کا رئیس التحریر مقرر کیا۔موصوف نے صرف ۲ ماہ تک اس جریدے کی ایڈیٹری کے فرائض سرانجام دیئے ۔۱۰ستمبر ۱۹۵۴ءکو یہ اخبار کرنل ناصر کی حکومت کی طرف سے بند کر دیا گیا، کیونکہ اس اخبار نے اخوان المسلمون کی پالیسی کے تحت اس اینگلو مصری پیکٹ کی مخالفت کی تھی جو ۷ جولائی ۱۹۵۴ء کو جمال عبدالناصر اور انگریزوں کے مابین ہوا تھا۔اس پیکٹ کے بعد اخوان اور ناصر کے مابین کشمکش کا آغاز ہوگیا۔اور اخوان شدید تر دور ابتلاء میں گھر گئے ۔ایک جعلی سازش کے الزام میں حکومت مصر نے اخوان المسلمون کو خلاف قانون قرار دے دیا۔اخوان کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔انہیں موت کی سزائیں دی گئیں (جن لوگوں کو موت کی سزائیں دی گئیں (۷نومبر ۱۹۵۴ء) ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

① عبدالقادر عودہ۔

② محمد فرغلی۔

(۳) یوسف طلعت۔

(۴) ابراہیم الطیب۔

(۵) ہنداوی دویر۔

(۶) محمود عبداللطیف۔

ان کے ہزار ہا کارکنوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا، اور ایسا محشر خیز ہنگامہ برپا ہوا کہ ہر اُس شخص کی عزت وآبرو اور جان ومال پر دست درازی کی گئی جو اخوان کے ساتھ کسی نہ کسی نوعیت کا تعلق رکھتا تھا (مصر کے نامور اخبار المصری کے ایڈیٹر احمد ابوالفتح کا بیان ہے کہ چند ہفتوں کے اندر اندر گرفتار شدگان کی تعداد ۵۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ ملاحظہ ہو کتاب ''جمال عبدالناصر'' تالیف احمد ابوالفتح ص ۲۰۵)

ابتلاء کا آغاز

ان گرفتار شدگان میں سید قطب بھی تھے۔ انہیں مصر کی مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔ کبھی قلعہ کی جیل میں کبھی فوجی جیل میں اور گاہ ابوزعبل کی ہولناک جیل میں۔ سید موصوف کر گرفتاری اور تعذیب کی داستان بڑی زہرہ گداز ہے۔ شام کے ہفت روزہ الشہاب کے حوالے سے ہم اس کی تلخیص نقل کرتے ہیں:

''فوجی افسر جب سید قطب کو گرفتار کرنے کے لیے ان کے گھر میں داخل ہوئے تو سید اس وقت شدید بخار میں مبتلا تھے۔ انہیں اسی حالت میں پابند سلاسل کرلیا گیا۔ اور پیدل جیل تک لے جایا گیا۔ راستے میں شدت کرب کی وجہ سے بیہوش ہوکر زمین پر گر جاتے۔ اور جب ہوش میں آتے تو ان کی زبان پر اللہ اکبر وللہ الحمد (یہ اخوان کا نعرہ) کے الفاظ جاری ہو جاتے۔ انہیں جب سجن حربی (فوجی جیل) میں داخل کیا گیا تو جیل کے دروازے پر ان کی ملاقات جیل کے کمانڈر حمزہ بسیونی (۵ جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد یہ شخص غداری کے الزام میں خود گرفتار ہو چکا ہے) اور

خفیہ پولیس کے افسروں سے ہوئی۔ جوں ہی سید قطب نے جیل کے اندر قدم رکھا تو جیل کے کارندے ان پر ٹوٹ پڑے اور پورے دو گھنٹے تک ان کو زدوکوب کرتے رہے۔ جیل کے اندر ان پر ایک سدھایا ہوا گرگ نما فوجی کتا بھی چھوڑا گیا۔ جو ان کی ران منہ میں لے کر انہیں اِدھر اُدھر گھسیٹتا رہا۔ اس تمہیدی کاروائی کے بعد انہیں ایک کوٹھری میں لے جایا گیا، اور ان سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا اور مسلسل سات گھنٹے تک جاری رہا۔ سید قطب کی جسمانی طاقت اگر چہ جواب دے چکی تھی مگر قلبی حرارت اور اطمینان وصبر کی طاقت انہیں پتھر کی چٹان میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان پر گونا گوں اذیتوں کی بارش ہوتی رہی مگر وہ ''اللہ اکبر وللہ الحمد'' کے سرورِ جاودانی میں مستغرق رہتے۔ رات کو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں ڈال دیئے جاتے اور صبح کے وقت بلا ناغہ انہیں پریڈ کروائی جاتی۔ ان مالا یطاق مشقتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ متعدد بیماریوں میں مبتلا ہو گئے (یہاں تک الشہاب کے بیانات کی ہم نے تلخیص نقل کی ہے۔ الشہاب ان دنوں شام کی جماعت الاخوان المسلمون کے زیر انتظام دمشق سے نکلتا تھا۔ اور مصری جیل خانوں کی تعذیب کی داستانوں سے دنیا کو آگاہ کرتا رہتا تھا)۔ ۳ مئی ۱۹۵۵ء کو انہیں فوجی اسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت موصوف امراض سینہ، قلبی ضعف، جوڑوں کے درد اور اسی نوعیت کی دوسری بیماریوں میں مبتلا تھے (الشہید سید قطب ص:۳۰)

موصوف کے ایک شاگرد جناب یوسف العظم لکھتے ہیں:

''تعذیب کے گونا گوں پہاڑ سید قطب پر توڑے گئے۔ انہیں آگ سے داغا گیا، پولیس کے کتوں نے انہیں کچلیوں میں لے کر گھسیٹا، ان کے سر پر مسلسل کبھی گرم اور کبھی ٹھنڈا پانی انڈیلا گیا، انہیں لاتوں اور گھونسوں سے مارا گیا، دِل آزار الفاظ اور

اشاروں سے ان کی توہین کی گئی۔ مگر ان سب چیزوں نے سید کے ایمان واذعان میں اضافہ کیا اور حق پر ان کے قدم مزید جم گئے (ایضاً ص ۳۱)

عزیمت کی ایک مثال

۱۳ جولائی ۱۹۵۵ء کو مصر کی ''عوامی عدالت'' (محکمہ الشعب) کی طرف سے سید قطب کو ۱۵ سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ ''عوامی عدالت'' کا یہ فیصلہ ان کی غیر حاضری میں سنایا گیا۔ کیونکہ موصوف اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ وہ عدالت میں حاضر نہ ہو سکتے تھے۔ ۱۵ سالہ قید بامشقت کا ابھی ایک سال گزرا تھا کہ جمال عبدالناصر کی طرف سے ایک نمائندہ سید قطب کے پاس جیل خانے میں بھیجا گیا۔ اس نے سید قطب کو یہ پیشکش کی کہ ''اگر آپ چند سطریں معافی نامہ کی لکھ دیں جنہیں اخبارات میں شائع کیا جا سکے تو آپ کو رہا کر دیا جائے گا، اور جیل کے مصائب سے نجات پا کر آپ گھر کی آرام دہ زندگی سے متمتع ہو سکیں گے۔'' اس پیشکش کے جواب میں اس مردِ مومن نے جو جواب دیا اُسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ انھوں نے کہا:

> ''مجھے ان لوگوں پر تعجب آتا ہے کہ جو مظلوم کو کہتے ہیں کہ ظالم سے معافی مانگ لے۔ خدا کی قسم، اگر معافی کے چند الفاظ مجھے پھانسی سے بھی نجات دے سکتے ہوں تو میں تب بھی کہنے کے لیے تیار نہ ہوں گا، اور میں اپنے رب کے حضور اس حال میں پیش ہونا پسند کروں گا کہ میں اس سے خوش ہوں اور وہ مجھ سے خوش ہو۔'' (ایضاً ص ۵۰، ۵۱)

جیل میں جب کبھی اُن سے اس پیش کش کا ذکر کیا گیا اور معافی کا مشورہ دیا گیا تو انھوں نے ہمیشہ یہ کہا: ''اگر میرا قید کیا جانا برحق ہے تو میں حق کے فیصلہ پر راضی ہوں، اور اگر باطل نے مجھے گرفتار کر رکھا ہے تو میں باطل سے رحم کی بھیک مانگنے کے لیے تیار نہیں ہوں (روزنامہ النہار بیروت شمارہ ۱۱۵ ستمبر ۱۹۶۶ء

مقالہ احمد شومان)عوامی عدالت (محکمۃ الشعب) کی کاروائی حکومت کی طرف سے کتابی شکل میں شائع کی جاچکی ہے۔اس کاروائی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ سید قطب کو حکومت کی طرف سے وزارت تعلیم کی پیش کش بھی کی گئی تھی۔لیکن انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کردی کہ وزارت کا قبول کرنا اس وقت تک لاحاصل ہے جب تک مصر کے پورے نظام تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا اختیار نہ ہو۔

رہائی

۱۹۶۴ء کے وسط میں سید قطب مصر کے مختلف جیل خانوں میں رہے۔ابتداء کے ۳ سال تو انھوں نے انتہائی اذیت اور عذاب میں گزارے۔مگر بعد میں جبر وتشدد کا سلسلہ ہلکا کردیا گیا۔اوران کے اعزّ ہ وا قارب کو بھی ملاقات کی اجازت مل گئی۔اور خود انہیں بھی جیل کے اندر اپنے علمی مشاغل جاری رکھنے کی سہولت کسی حد تک مہیا ہوگئی۔اس جزوی سہولت سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' کی تکمیل پر متوجہ ہوگئے۔۱۹۶۴ء کے وسط میں جب کہ ان کی قید کو تقریباً دس سال ہوگئے تھے اور بالعموم ۱۵ سال کی سزا پانے والا قیدی عملاً دس یا گیارہ سال گزار کر رہا ہو جاتا ہے،عراق کے صدر عبدالسلام عارف نے قاہرہ کا دورہ کیا اور صدر ناصر سے سید قطب کی رہائی کی درخواست کی ۔چنانچہ صدر ناصر نے جو عبدالسلام عارف کے ساتھ خوشگوار تعلقات کے قیام کے متمنی تھے اس درخواست کے جواب میں سید قطب کو رہا کردیا (یہ روایت راقم الحروف نے مصر اور کویت کے ثقہ لوگوں سے سنی ہے۔کسی سرکاری دستاویز یا اخباری بیان میں اس کا ذکر نہیں ہے)۔مگر اس رہائی سے عملاً کوئی فرق نہ پیدا ہوا۔کیونکہ وہ برابر پولیس کی نگرانی میں رہتے تھے۔اور انہیں آزادانہ نقل وحرکت کی اجازت نہ تھی۔

دوبارہ گرفتاری اور سزا

اس مقید آزادی کو ایک سال بھی نہ گزرنے پایا کہ سید قطب کو دوبارہ گرفتار کرلیا گیا۔ اُن پر الزام تھا کہ وہ طاقت کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ چنانچہ نہ صرف انہیں بلکہ ان کے بھائی محمد قطب اور امینہ قطب کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ اور ان کے علاوہ اور بھی کثیر تعداد کو گرفتار کرلیا گیا۔ ڈیلی ٹیلیگراف کی رپورٹ کے مطابق گرفتار شدگان کی تعداد بیس ہزار سے تجاوز کرگئی (ڈیلی ٹیلیگراف ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۵ء)۔ ان میں سات سو کے قریب عورتیں تھیں۔ اس پکڑ دھکڑ کا آغاز اس وقت ہوا جب اگست ۱۹۶۵ء میں صدر ناصر نے روس کا دورہ کیا اور ماسکو میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ ''اخوان المسلمون'' نے میرے قتل کی سازش تیار کی ہے جو طشت از بام ہوچکی ہے۔ ماضی میں میں نے انہیں معاف کردیا تھا لیکن اب میں معاف نہیں کروں گا۔'' اس اعلان سے ایک سال پیشتر (۲۴ مارچ ۱۹۶۴ء) مصر کے ایک نئے قانون (نمبر ۱۱۹ مجریہ ۱۹۶۴ء) کے ذریعہ صدر کو یہ اختیارات دیئے گئے تھے کہ وہ جسے چاہے بغیر مقدمہ چلائے گرفتار کرسکتا ہے، جائیداد کی ضبطی اور دوسری انتظامی کاروائیوں کو روبہ عمل لاسکتا ہے، اور صدر کی ایسی تمام کاروائیوں کے خلاف عدالتی چارہ جوئی اور اپیل نہیں کی جاسکے گی۔ صدر ناصر کے اس اعلانِ ماسکو کے بعد گرفتاریوں کا وسیع پیمانے پر سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور جیلوں کے اندر تعذیب وتشدد کی بھٹیاں گرم ہوگئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد خاص فوجی عدالتوں میں ان کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا۔ پہلے اعلان ہوا کہ مقدمہ کی کاروائی ٹیلی ویژن پر دکھائی جائے گی۔ لیکن جب ملزموں نے اقبالِ جرم سے انکار کردیا اور تشدد اور مظالم کی داستانیں بیان کیں تو فوری طور کاروائی ٹیلی ویژن سے روک دی گئی اور بند کمرے میں مقدمہ چلنے لگا۔ ملزموں کی طرف سے کوئی وکیل مقدمہ کی پیروی کرنے والا نہ تھا۔ ملک کے باہر کے وکلاء نے مقدمہ کی پیروی کرنا چاہی مگر انہیں اجازت نہیں دی گئی۔ فرانس کی بار ایسوسی ایشن کے سابق صدر ولیم تھارپ اور ہیگ کے مشہور وکیل اے۔ جے۔ ایم ویندال اور

مراکش کے وکلاء نے باقاعدہ اجازت طلب کی جسے ردّ کر دیا گیا۔سوڈان کے دووکیل ازخود قاہرہ پہنچ گئے اور وہاں کی ایسوسی ایشن میں اپنے آپ کو رجسٹر کرا کر پیروی کے لیے عدالت پہنچے لیکن پولیس نے دھکے دے کرانہیں نکال دیا۔اور فی الفور مصر چھوڑنے پر انہیں مجبور کیا گیا۔جنوری اور فروری ۱۹۶۶ء میں ٹریبونل کے سامنے جو کاروائی ہوئی اس میں ملزموں نے بتایا کہ زبردستی اقبال نامے (Confession) حاصل کرنے کے لیے ان کو جبر وتشدد اور اعضاء شکنی (Torture) کا نشانہ بنایا گیا ہے۔خود سید قطب نے بھی جو اس مقدمہ کی مرکزی شخصیت تھی یہی الزام لگایا۔ٹریبونل کے صدر نے ملزم کا منہ فوراً بند کر دیا اور ان کی شہادت سننے سے انکار کر دیا۔ان دل روز واقعات کی توثیق لندن میں وکلاء کے غیر جانب دار عالمی ادارے (Amnesty Intenational) کی اس رپورٹ سے ہوتی ہے جو مسٹر پیٹر آرکر (Peter Archer) لندن کی پارلیمنٹ کے ممبر نے مصر کا دورہ کرنے کے بعد پیش کی ہے۔مسٹر آرکر نے واقعات وحقائق بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

> ''ملزمین کے جرم یا ان کی معصومیت کے بارے میں کوئی رائے زنی کے بغیر ایمنسٹی انٹرنیشل بڑے افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتی ہے کہ ان مقدمات کے حالات وحقائق ان الزامات کی تائید کرتے ہیں جو ملزمین کے ساتھ جبر وتشدد کا سلوک کرنے کے بارے میں لگائے گئے ہیں ۔اور یہ صورت حال مصری انصاف کی غیر جانب داری کو قطعاً مشکوک بنا رہی ہے۔ایمنسٹی انٹرنیشنل حکومت مصر سے مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت ملزمین کے بنیادی انسانی حقوق کا احترام کرتے اور انہیں کھلے طور پر منصفانہ مقدمہ کا موقع دے کر بین الاقوامی ساکھ میں اضافہ کرے (بحوالہ رپورٹ جاری کردہ ایمنسٹی انٹرنیشنل فلیٹ اسٹریٹ لندن مورخہ ۱۵، اپریل ۱۹۶۶ء)''

تختۂ دار پر لٹکا دیئے گئے

اگست ۱۹۶۶ء کو سید قطب اور ان کے دو ساتھیوں کو فوجی ٹریبونل کی طرف سے موت کی سزائیں سنائی گئیں۔ان سزاؤں پر پوری دنیا کے اندر شدید ردّ عمل ہوا۔دینی رہنماؤں، سیاسی شخصیتوں، مذہبی اور اصلاحی تنظیموں اور اخبارات ورسائل کی طرف سے شنوائی نہ ہوسکی اور بالآخر ۲۵ اگست ۱۹۶۶ء کی صبح کو یہ سزائیں نافذ کردی گئیں۔اور یہ بے نظیر شخصیت، جو مصر اور عرب دنیا کے الحاد پرست اور لادین عناصر کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی ''اپنے رب سے راضیاً مرضیاً'' جا ملی۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شُد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

سید قطب رحمہ اللہ ادب وعلم کے میدان میں

سید قطب مصری معاشرے کے اندر ایک ادیب لبیب کی حیثیت سے ابھرے، سیاسی اور اجتماعی نقاد کے عنوان سے انھوں نے نام پیدا کیا اور بالآخر اسلام کے عظیم مفکر اور داعی اور مفسر قرآن کے روپ میں وہ دنیا سے جامہ شہادت پہنے رخصت ہوئے۔

اخوان المسلمون کے ساتھ منسلک ہونے سے پہلے ان کے ذہن وفکر نے تغیرات کے کئی مرحلے طے کیے: انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بچوں کے لیے تاریخی اور اسلامی لٹریچر کی تصنیف سے کیا۔اور اپنے ایک قلمی رفیق عبدالحمید جودہ السحار کے ساتھ مل کر انبیاء کرام علیہم السلام کے قصوں اور کہانیوں پر مشتمل ایک سلسلہ شائع کیا۔اس سلسلہ کو انھوں نے کہانی کے نہایت پرکشش اور دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے۔خدا کی برگزیدہ شخصیتوں کے واقعات واحوال کے ذریعہ سے وہ بچوں کے اندر بلند کرداری اور اخلاقی فضیلت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ نژادنو جب معرکہ زندگی میں قدم رکھے تو اس کے سامنے انسانیت واخلاق کا صرف وہ نمونہ ہو جو اللہ کے پیغمبروں اور نبیوں نے پیش کیا ہے۔اس رنگ میں مصر کے دوسرے ادباء نے بھی اپنے قلم کی جولانیاں دکھائیں ہیں۔کامل کیلانی تو ساری زندگی

''بچوں کے مصنف'' کہلاتے رہے۔مگر سید قطب کے انداز میں جو سلاست و لطافت اور جذبہ و اخلاص جھلکتا ہے اس میں وہ منفرد نظر آتے ہیں۔اس دور میں انھوں نے بچوں کے لیے اسلامی اور وطنی گیت بھی لکھے ہیں۔

قلم نے جب مزید ترقی کی طرف قدم اٹھائے تو اظہار خیال کے زاویے بھی بدل گئے ۔جوانی کی پنکھڑیاں کھل رہی تھیں کہ ان کا پہلا افسانہ ''اشواک''(کانٹے)دنیائے ادب کے اندر نمودار ہوا۔اس افسانے کے اندر انھوں نے ایک ایسی پاکیزہ محبت کی داستان بیان کی ہے جس کا انجام ناکامی ہوا ہے۔اس افسانہ کو پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ وہ ایک ایسے کردار کے ساتھ ہمسفر ہے جو انتہائی کریم النفس اور بلند اخلاق ہے۔موصوف افسانے کے انتساب میں لکھتے ہیں:

''اس کے نام جو میرے ساتھ وادیٔ پرخار میں ہمسفر رہی۔میں بھی آبلہ پا ہوا اور وہ بھی آبلہ پا ہوئی ۔میں بھی سوختہ نصیبی سے سے دوچار ہوا اور وہ بھی سوختہ ارماں نکلی ۔پھر وہ الگ راستے پر چل پڑی اور میں الگ راستے پر چل پڑا۔اس حال میں کہ معرکۂ سوز و ساز میں ہم دونوں زخمی ہو چکے تھے۔نہ اس کی جان کو قرار ملا اور نہ میری جان آشنائے سکوں ہوئی۔''

اشواک کے بعد افسانوی طرز کی دو اور کتابیں انھوں نے لکھیں۔ایک طفلِ من القریۃً (گاؤں کا بچہ)اور دوسری المدینۃ المسحورہ (سحرزدہ شہر) پہلی کتاب میں انھوں نے داستان کے رنگ میں اپنی بچپن کی زندگی اور دیہاتی ماحول کا نقشہ کھینچا ہے۔دیہاتی زندگی کی سادگی اور طہارت ۔دیومالائی کہانیاں، بیماریاں، جہالت، سخاوت، رواداری اور جوش انتقام الغرض ہر ہر پہلو کو بڑے لطیف اسلوب میں بیان کیا ہے۔جس زمانے میں سید قطب نے یہ کتاب لکھی تھی اس زمانے میں وہ مصر کے نامور ادیب طٰہٰ حسین کے حلقہ سے وابستہ تھے۔طٰہٰ حسین کے طرز سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے اپنی یہ کتاب بھی ہو بہو طٰہٰ حسین کے ''الایام'' کے رنگ میں لکھی۔اور اسے منسوب بھی طٰہٰ حسین کے نام سے کیا کہ ''امید ہے کہ وہ کہانی کو بھی ''الایام'' کے چند ایام کی حیثیت سے قبول فرمائیں گے''المدینہ

المسحورۃ محض ایک ادبی داستان ہے۔اورعہد ماضی کے شاہی محلات کاعکس پیش کرتی ہے۔سید نے اپنی زندگی میں صرف یہ تین افسانے رقم کیے ہیں۔

اس دور کی ایک اور بے نظیر کتاب الاطیاف الاربعۃ ہے۔اس کتاب کی تالیف میں چاروں بہن بھائی (سید قطب،محمد قطب،حمیدہ قطب اورامینہ قطب)شریک ہیں۔ان میں سے ہرایک نے انسان دوست اہلِ قلم کی حیثیت سے انسانی زندگی کی واردات کو بیان کیا ہے۔انسان کی خدمت،انسان سے محبت اورانسانیت کے لیے قربانی کا جذبہ چاروں کے اندرقدرمشترک ہے۔

سید موصوف کو طالب علمی کے دور میں شعروادب اورصحافت سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔دارالعلوم قاہرہ میں ان کی طالب علمی اور پھر پروفیسری کا جو زمانہ گزراوہ ان کے ادب ذوق کونکھارنے اوراسے ترقی دینے میں بڑا ممدثابت ہوا۔اس دورمیں انھوں نے قاہرہ کے چوٹی کے ادباءاورارباب صحافت سے راہ رسم پیدا کرلی تھی۔پہلے طٰہٰ حسین کے حلقۂ ارادت سے منسلک ہوئے بلکہ طٰہٰ حسین کے پرائیویٹ سکریڑی بھی رہے۔اورپھرعباس محمودالعقاد کی مجلس ادب وعلم کے گلِ سرسبد بنے،مصطفیٰ صادق الرافعی کی طٰہٰ حسین اورعقاد کے ساتھ ٹھنی رہتی تھی۔مصطفیٰ صادق الرافعی بیسویں صدی کے جاحظ تھے۔ان کی انشاپردازی میں قرآنی ادب کی چاشنی ہوتی تھی۔قرآن کی بلاغت وایجاز اورقرآن کی ادبی ومعنوی مقام کورافعی نے جس قدرت وندرت اورعربی مبین کے ساتھ بیان کیا ہے اس کی وجہ سے انہیں ''قرآنی ادیب'' کیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔طٰہٰ حسین اورعقادان کے مقابلے میں ہیچ نظرآتے ہیں۔رافعی اور عقاد کے مجادلات میں سید قطب عقاد کا دفاع کرتے رہے۔یہ دفاع ناکام تھامگرسید قطب کواس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ ان کے ادب وانشاء کا رشتہ خداوند عالم کی کتاب اعجاز کے ساتھ بندھ گیا۔انھوں نے ادبی ذوق کی سیرابی اوراسالیب وبلاغت اوراصول ایجاز کی جستجو میں قرآن کا مطالعہ کیا۔اوراسی مطالعہ کے دوران اللہ تعالیٰ نے ان پراپنی حکمت وہدایت کے دروازے بھی واکردیے۔یہ سید کے اخلاص اورپاکیزگی اورطلبِ صادق کا کرشمہ ہے کہ قرآن نے ان کوادب کے لازوال خزانے بھی

عطا کیے اور ہدایت کا ابدی نور بھی ارزانی فرمایا ؎

جمیع العلم فی القرآن لکن

تقاصــر عنــه افهام الـرجال

نئے ذہن و ذوق کے تقاضے میں سید قطب کے قلم سے جو گوہر ہائے بے بہا دنیائے ادب کی زینت میں اضافہ کا موجب ہوئے وہ یہ ہیں:

① **مشاهد القيامة فى القرآن** : اس کتاب میں سید قطب نے مناظر قیامت بیان کیے ہیں ۔ یہ مناظر قرآن کی ۱۱۴ سورتوں میں سے ۸۰ سورتوں میں ۱۵۰ مواقع پر بیان کیے گئے ہیں ۔موصوف لکھتے ہیں: اس کتاب میں میں نے جو چیز بیان کی ہے اسے میں نے ''مناظرہ'' کا نام دیا ہے۔ منظر میں تصویر، حرکت اور تاثیر کے پہلو بھی شامل ہوتے ہیں ۔ چنانچہ مصنف نے آخرت کے مناظر کی جو نقشہ کشی کی ہے اور جس حیرت انگیز اور مؤثر اسلوب میں واقعہ نگاری کی ہے وہ تعریف و توصیف سے بالا ہے ۔ پڑھنے والا صرف الفاظ سے ہی محفوظ نہیں ہوتا بلکہ آیاتِ جنت کو پڑھتے ہوئے جنت کے لذائذ اور آیات دوزخ پڑھتے ہوئے دوزخ کی شعلہ سامانیوں کو بھی محسوس کرتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف دعوت کے نقطۂ نظر سے مثال ہے بلکہ ادب و فن کا بھی شاہکار ہے ۔سید قطب نے ماہرانہ انشا پرداز اور تخلیقی صلاحتیوں سے مالا مال فن کار کے موقلم سے اس کتاب کو زندۂ جاوید صحیفہ بنا دیا ہے۔

② **التصوير الغنى فى القرآن**: یہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل کتاب ہے۔سید قطب کا قلم قرآن کے موضوع پر بڑی پختگی، خود اعتمادی اور دقتِ رسی کے ساتھ چلتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قرآن ان کا اصل موضوع ہے۔التصویر الغنی میں انھوں نے قرآن کی ادبی قدر و قیمت اجاگر کی ہے۔قرآن کی جادو بیانی، جادو بیانی کا منبع، قرآن کیسے سمجھا گیا، قرآن کے مناظر کی فنّی نقشہ کشی، حسّی تخیّل، فن کے لحاظ سے نظم کلام، قرآنی قصے، قصوں کے اغراض و مقاصد، قصہ گوئی میں فن اور دین کا امتزاج، قصہ میں واقعہ نگاری کا جز، قرآن کے انسانی نمونے، وجدانی منطق اور قرآن کا طریق العربی (عربک اکیڈمی) کے

تبصرہ کی رو سے آج تک اس طرز کی کوئی کتاب اس جامعیت کے ساتھ نہیں لکھی گئی۔ یہ دونوں کتابیں مصر کے مشہور ادارے دارلمعارف نے شائع کیں اور علمی وادبی حلقوں میں انہیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مراکش کے مشہور عالم وادیب علال فاسی کے الفاظ میں: ''یہ دونوں کتابیں بتاتی ہیں کہ مصنف عربی زبان وادب میں بہت اونچا مرتبہ رکھتا ہے اور قرآن کے اعجازی اسلوب کا اسے پختہ مذاق حاصل ہے۔'' اسی دور میں ادبی نقد ونظر پر بھی ان کی دو کامیاب کتابیں سامنے آئیں۔ النقد الادبی: اصوله ومناهجه (تنقید کے اصول ومناہج)۔ اور طٰہٰ حسین کی کتاب ''مستقبل الثقافة'' پر تنقید۔ عربی ادبیات کا طالب علم ان دونوں کتابوں سے صرف نظر کر کے عربی ادب کے جدید رجحانات کا کامل احاطہ نہیں کر سکتا۔ مصنف نقاد کے فرض اور غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: نقاد کا اصل کام فن کے لحاظ سے ادبی کام کی اصلاح ہے۔ نقاد یہ واضح کرتا ہے کہ جس ادبی کوشش کا وہ نقد وحساب کر رہا ہے موضوع کے لحاظ سے اس کی قدر وقیمت کیا ہے، اظہار وبیان اور احساس ووجدان کی رو سے اس کا کیا معیار ہے، چمنستانِ ادب میں اس کا کیا مقام ہے، ادبی ذخیرے میں اس سے کیا کچھ اضافہ ہوا ہے، ادیب ماحول سے کس حد تک اثر پذیر اور ماحول پر کس حد تک اثر انداز ہوا ہے، ادیب کی وجدانی اور بیانی خوبیاں کیا ہیں، وہ نفسیاتی اور خارجی عوامل کیا ہیں جو ادیب کی تربیت وساخت میں حصہ لے رہے ہیں۔''

صحافت کی طرف رخ

سید قطب اس دور میں اگرچہ صرف بحر ادب میں شناوری کر رہے تھے مگر ان کے احساس ووجدان کی دنیا، ماحول کی ہر لہر سے متاثر ہو رہی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب مصر کے سینہ پر انگریزی استعمار دندناتا پھر رہا تھا۔ ایک طرف انگریزوں اور پاشاؤں نے لوٹ کھسوٹ مچا رکھی تھی اور دوسری طرف فلاحین اور عمال طرح طرح کے ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ یہ تمام حالات ان کے ذہن ووجدان کی دنیا پر اپنی

پر چھائیاں ڈال رہے تھے۔چنانچہ انہی جذبات کو لیے ہوئے سید موصوف نے پہلے ماہنامہ ''العالم العربی'' کی ادارت کا کام ہاتھ میں لیا اور پھر ''الفکر الجدید'' کے نام سے اپنا ایک ماہ نامہ جاری کیا۔جس کی مالی پشت پناہی مصر کے ایک نیک دل کتب فروش محمد حلمی المنیاوی نے کی ۔اسی پرچے کے اندر سید قطب کے رجحانات سوشلزم کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔جو اس وقت کے حالات کی پیداوار تھے ۔چنانچہ اس پرچے میں انھوں نے متواتر مصر کے جاگیرداری نظام اور پاشاؤں کی دھاندلیوں پر حملے کیے۔اور سرمایہ دارانہ استحصال کو چیلنج کیا۔حالانکہ اس وقت جاگیرداری نظام پوری قوت کے ساتھ قائم تھا۔پاشاؤں کا طبقہ اوج کمال پر تھا اور سرماداریت ملک کی زمامِ اقتدار پر قابض تھی ۔الفکر الجدید جس سوشلزم کا داعی تھا وہ سوشلزم اس مفہوم کا حامل نہ تھا جس مفہوم کے ساتھ وہ آج اپنے آپ کو متعارف کرا رہا ہے ۔ان کا سوشلزم سرمایہ داریت اور جاگیرداری کے ظلم وستم کے خلاف تھا اور اسلام کی تلوار سے ان کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔دولت کی ذخیرہ اندوزی اور اجارہ داری کو قرآن کی آیات کی روشنی میں ناجائز ثابت کرتا تھا۔اور قرآن کے اقتصادی نظام کی طرف رجوع کی دعوت دیتا تھا۔اس کا بنیادی نصب العین عدل وانصاف کا قیام ،غربا اور مساکین کی دستگیری اور زیردستوں کو زبردستوں کے مظالم سے نجات دلانا تھا۔(الشہید سید قطب ص٢٦، ٦٧)

سفر امریکہ کے نتائج

اسی زمانے میں سید موصوف کو امریکہ جانے کا موقع مل گیا۔وہاں انھوں نے مغرب کی مادی تہذیب اور اس کی قیامت سامانیوں کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ان کے سامنے مغرب کا مصنوعی جمہوری نظام تھا ۔جس میں رنگ ونسل کی بنیاد پر انسان میں تفریق روا رکھی جارہی تھی اور گورا انسان کالے انسان پر انسانیت سوز مظالم توڑ رہا تھا۔چنانچہ انہیں یقین ہوگیا کہ جس مغرب کی جمہوریت نوازی کا دنیا میں ڈھول پیٹا جارہا ہے وہ انسانیت سے کوسوں دور ہے۔اور صرف اسلام ہی وہ دین حق ہے جو انسانیت کو

فلاح وکامرانی سے ہمکنار کرسکتا ہے۔وہ جب امریکہ سے واپس آئے تو ان کے دل میں نسلی امتیاز ،کھوکھلے جمہوری نظام،اورانصاف وحریت کے جھوٹے مدعیوں کے خلاف جذبات کا شدید تلاطم برپا تھا ۔اوردوسری طرف ان کے دل میں اسلام کی قدروقیمت بڑھ گئی اوراسلامی اقداراورتعلیمات سے ان کی شیفتگی دوبالا ہوگئی۔امریکہ سے واپسی پر انھوں نے اپنے ان تاثرات کو''امریکا التی رأیت''(امریکہ،جسے میں نے دیکھا)نامی کتاب میں پیش کیا۔امریکہ کا سفران کے لیے زندگی کا زبردست انقلاب بن کرآیا۔واپسی پروہ ہمہ تن اسلام کے مطالعے میں مصروف ہوگئے۔اوراسلام کے اصل مآخذ سے تشنگی بجھانے میں مشغول ہوگئے۔ان کے مطالعہ وجستجو کا یہ حال تھا کہ ان کے یومیہ مطالعہ کے اوقات دس گھنٹوں سے کم نہ ہوتے تھے۔اِسی مطالعہ کی بدولت ان کا تعلق مصر کی اسلامی تحریک سے قائم ہوا۔اور یوں ذہنی انقلاب کا سفر جو مشاہد القیامۃ فی القرآن کی تصنیف سے شروع ہوا تھا اخوان المسلمون کی عملی تحریک سے وابستگی پر منتج ہوا(ایضاً ص ۲۷)۔ان کی مشہور اور معرکۃ الآراء کتاب **العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام** (اسلام کا عدلِ اجتماعی)اسی دور کی تصنیف ہے۔

العدالۃ الاجتماعیۃ کی تالیف

العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام ۱۹۴۸ء میں پہلی مرتبہ منظرعام پرآئی ہے۔اب تک اس کے سات ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ہر ایڈیشن میں سید موصوف اپنے تازہ مطالعہ کی بناپر ترمیم واضافہ کرتے رہے ہیں (علال الفاسی لکھتے ہیں:سید کی اس تصنیف پر میں نے بعض مقامات پر گرفت کی۔چنانچہ دوسرے ایڈیشن میں انھوں نے ان مقامات پر تبدیلی کردی (روزنامہ المعلم ،مراکش ،شمارہ ۲ ستمبر ۱۹۶۶ء)اس کتاب کے ساتویں باب میں سید موصوف نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور بنوامیہ کے بارے میں جس نقطہ نظر کا اظہار کیا تھا ساتویں ایڈیشن میں انھوں نے اس میں مکمل تبدیلی کردی تھی۔اورکوئی قابل اعتراض بات نہیں رہنے دی ہے۔یہ تبدیلی ایام اسیری میں کردی گئی تھی مگر حالات کی وجہ سے اس

کی طباعت کی کوئی سبیل پیدا نہ ہوسکی۔ان کی شہادت کے بعد یہ ترمیم شدہ ایڈیشن چھپ چکا ہے۔اور عرب ممالک میں وسیع پیمانے پر تقسیم ہورہا ہے۔اس کتاب کے دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمے ہوچکے ہیں۔اس کا انگریزی ترجمہ ''سوشل جسٹس اِن اسلام'' کے نام سے امریکن کونسل آف لرنڈ سوسائٹیز واشنگٹن کی جانب سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوچکا ہے۔فارسی،ترکی،انڈونیشی اور اردو میں بھی تراجم چھپ چکے ہیں۔اس کا اردو ترجمہ ''اسلام کا عدلِ اجتماعی'' کے نام سے اسلامک پبلیکیشنز لاہور نے شائع کیا ہے۔یہ ترجمہ ہمارے دوست ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب (بھارت) نے کیا ہے۔

تفسیر فی ظلال القرآن

سید قطب کا سب سے عظیم کارنامہ ان کی تفسیر قرآن ہے جو ''فی ظلال القرآن'' کے نام سے ۸ جلدوں میں چھپ چکی ہے۔دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہورہے ہیں۔فارسی میں ''درسایۂ قرآن'' کے نام سے اس کے دس پارے چھپ چکے ہیں۔اس تفسیر کا آغاز انھوں نے ۱۹۵۴ء کی اسیری سے پہلے کردیا تھا اور جیل میں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچادیا۔یہ اصطلاحی معنی میں تفسیر نہیں ہے۔اور نہ متداول تفاسیر کے اسلوب میں اسے لکھا گیا ہے۔یہ دراصل ان تاثرات سے عبارت ہے جو مطالعہ قرآن کے دور میں ان پر طاری ہوئے ہیں لیکن ان تاثرات کو مصنف نے اس طرح پیش کیا ہے کہ قرآن کی ایک ایک آیت کے اندر دعوت واصلاح اور تنبیہ وتذکیر اور نور وعرفان کے جو سمندر موجزن ہیں ان کا عکس کاغذ کے صفحات پر منتقل ہوگیا ہے۔''فی ظلال القرآن'' (قرآن کے زیرسایہ) چھ بنیادی خوبیوں کی حامل ہے:

① بلند پایہ ادبی اسلوب،جس میں سید قطب اکثر قدیم مفسرین اور محدثین سے بھی بڑھ گئے ہیں۔

② تمام تفاسیر سے انھوں نے استناد کیا ہے۔اور ان سے اخذ کردہ معلومات کو اپنی تفسیر میں اس

عالمانہ انداز سے سمودیا ہے کہ یہ تفسیر ادبی مقالات کا مجموعہ نہیں بلکہ معلومات کا دائرۃ المعارف بن گئی ہے۔

③ اسرائیلیات سے یہ تفسیر مکمل طور پر خالی ہے۔

④ معتزلہ وخوارج اور اشاعرہ اور ماتریدیہ اور فقہ کے مختلف مکاتب فکر کے نزاعات سے جو عام عربی تفسیروں کے اندر ملتے ہیں یہ تفسیر خالی ہے۔

⑤ پوری جامعیت اور تفصیل کے ساتھ ہر ہر بحث کو ادا کیا ہے۔اس کے بعد کسی اور کتاب کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

⑥ پوری تفسیر کے اندر ایک ایسی شفافیت اور پاکیزہ روح جلوہ گر نظر آتی ہے جو یقین واذعان کی دولت اور ایمان وعقیدہ کی گہرائی اور وعزیمت کی نعمت سے لبریز ہے۔اس چیز نے تفسیر کو ایک متحرک زندگی اور رواں دواں اسلامی تحریک کی کتاب ہدایت کی شکل دے دی ہے۔یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام علماء نے اس تفسیر کی بڑی تعریف وتوصیف کی ہے۔اور باوجودیکہ یہ مکمل طور پر چھپ چکی ہے اور مکتبوں سے بآسانی مل سکتی ہے مگر عرب ممالک کے اخبارات ورسائل اسے مسلسل اپنے کالموں میں نقل کررہے ہیں۔

تمام تصانیف ایک نظر میں

سید موصوف کی تمام تصانیف کی تعداد ۲۲ ہے۔جن کی مکمل فہرست یہ ہے:

۱۔ فی ظلال القرآن. (قرآن کے زیر سایہ)

۲۔ العدالة الاجتماعية فی القرآن. (اسلام کا عدلِ اجتماعی)

۳۔ مشاهد القيامة فی القرآن. (قرآن میں قیامت کے مناظر)

۴۔ التصوير الغنی فی القرآن. (قرآن کے فنّی پہلو)

۵۔ معركة الاسلام و الرأسمالية. (اسلام اور سرمایہ داری کی کشمکش)

۶۔ السلام العالمی و الاسلام. (عالمی امن اور اسلام)(''السلام العالمی و الاسلام'' اپنے موضوع کی نہایت بے نظیر اور عمیق کتاب ہے۔ مراکش کے مجاہد کبیر علال الفاسی لکھتے ہیں: ''اے کاش، یہ میری تصنیف ہوتی'' روزنامہ العلم' مراکش، شمارہ ۲ستمبر ۱۹۶۶ء)

۷۔ السلام اسلامیه. (اسلامی مقالات)

۸۔ النقد الادبی: اصوله و مناهجه. (ادبی تنقید کے اصول و مناہج)

۹۔ نقد کتاب مستقبل الثقافة. (''مستقبل الثقافة'' پر تنقیدی نظر)

۱۰۔ کتب و شخصیات. (کتابیں اور شخصیتیں)

۱۱۔ نحو مجتمع اسلامی. (اسلامی معاشرہ کے خدوخال)

۱۲۔ امریکه التی رأیت. (امریکہ جسے میں نے دیکھا)

۱۳۔ اشواك. (کانٹے)

۱۴۔ طفل فی القرية. (گاؤں کا بچہ)

۱۵۔ المدينة المسحورة. (سحر زدہ شہر)

۱۶۔ الاطیاف الاربعة. (چاروں بہن بھائیوں کے افکار و تخیلات کا مجموعہ)

۱۷۔ القصص الدينية. (انبیاء کے قصے، باشتراک جودہ السحّار)

۱۸۔ قافلة الرقيق. (مجموعہ اشعار)

۱۹۔ حلم الفجر. (مجموعہ اشعار)

۲۰۔ الشاطئ المجهول. (مجموعہ اشعار)

۲۱۔ مهمة الشاعر فی الحياة. (زندگی کے اندر شاعر کا اصل وظیفہ)

۲۲۔ معالم فی الطريق. (نشانِ راہ ہم نے اس کا نام جادہ منزل تجویز کیا ہے)

شعروسخن سے شغف

سید موصوف کی طبع رسا نے شعروسخن کے اندر بھی جولانیاں دکھائی ہیں۔ان کے اشعار کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔شعروسخن سے ان کا لگاؤ ان کی ادبی زندگی کے آغاز میں ہوگیا تھا۔بڑے بڑے اساتذہ کی صحبت نے اس جذبہ کو مہمیز کا کام دیا۔اس کی شاعری میں تمام اصناف سخن ملتی ہیں البتہ قصیدہ سرائی اورمدح گوئی کو انہوں نے ہاتھ نہیں لگایا۔یہ صنف ان کی طبع بیباک اورفطرت پاکیزہ سے ہم آہنگ نہ تھی۔وہ شروع سے ریاکاری اور تملق پیشگی سے متنفر تھے۔ان کا سب سے پہلا مجموعہ اشعار قافلۃ الرقیق (غلاموں کا کارواں) ہے۔وہ اپنے اس مجموعہ سے زیادہ خوش نہ تھے۔آخری ایام میں وہ اس مجموعہ کو اپنی ''دور جاہلیت'' کی یادگار کہتے رہے۔ان کی تمنا تھی کہ اگر اس مجموعہ کے تمام نسخے ان کے ہاتھ لگ جائیں تو ان کے اندر وہ تخیل،موضوع اور مقصد وغایت کے لحاظ سے جوہری تبدیلی کرڈالیں۔سید موصوف کی آخری نظم جو انھوں نے اپنے آخری ایام اسیرہ میں کہی ہے۔بڑی مؤثر اور دلنشین ہے،اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں (یہ اشعار ہم نے ایک طویل نظم سے لیے ہیں جو ماہنامہ الایمان،مراکش،بابت اکتوبر ونومبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی ہے)

اخی انت حروراء القیود　　　اخی انت حر بتلك السدود

اذا كنت باللّٰه مستعصما　　　فماذا بضيرك كـيد الـعبيـد

اے میرے ہمدم تو طوق وسلاسل کے اندر بھی آزاد ہے۔اے میرے دمساز! تو آزاد ہے،رکاوٹوں کے باوجود اگر تیرا اللہ پر بھروسہ ہے۔تو ان غلام فطرت انسانوں کی چالیں تیر کچھ نہیں بگاڑسکتیں۔

اخی ستبيد جيوش الظلام　　　ويشرق فی الكون فجر جديد

فاطلـق لـروحك اشراقهـا　　　تـرى الـفجـر يـرمقنا من بعيد

برادرم! تاریکی کے لشکر مٹ کر رہیں گے۔اور دنیا میں صبح نوطلوع ہو کر رہے گی۔تو اپنی روح کو ضوفشاں ہونے دے۔وہ دُور دیکھ صبح ہمیں اشارے کر رہی ہے۔

اخی قد سرت من یدیك الدماء ابـــت ان تشل بقید الامـــاء

ســرفـــع قـربـــانـهـا للسماء مخضبـــة بـرسام الخلـود

مگر تیرے ہاتھوں سے خون کے فوارے چھوٹے۔مگر تیرے ہاتھوں نے کمترین مخلوق کی زنجیروں کے اندر بھی شل ہونے سے انکار کر دیا۔تیرے ان ہاتھوں کی قربانی آسمان پر آٹھ جائے گی (منظور ہوگی)۔اس حالت میں کہ یہ ہاتھ حنائے دوام سے گلرنگ ہوں گے۔

اخـی ان ذرفت علی الـدمـوع وبللت قبری بھا من خشوع

فاوقد لھم من رفاتی الشمـوع وسیروا بھا نحـو مجـد تلید

میرے ہمسفر اگر تو مجھ پر آنسو بہائے۔اور میری قبر کو ان سے تر کر دے۔تو میری ہڈیوں سے ان تاریکی میں رہنے والوں کے لیے شمع فروزاں کرنا۔اوران شمعوں کو ابدی شرف کی جانب لے کر بڑھنا۔

اخی ان امت دون احبانا فروضـات ربّی اعـدت لنا

واطیارھا رفـرفـت حولنا فطوبی لنا فی دیار الخلود

میرے ربّ کے باغات ہمارے لیے تیار ہیں۔ان کے مرغان خوشنوا ہمارے اردگرد محو پرواز ہیں۔اس ابدی دیار کے اندر ہم خوش وخرم ہیں۔

اخی اننی ماسمئت الکـفاح الا انا القیت عنّی السلاح

وان طوقتنی جیوش الظـلام فانـی عـلی ثقـة بالصباح

میرے دوست معرکہ عشق سے میں ہرگز نہیں اکتایا۔اور میں نے ہرگز ہتھیار نہیں ڈالے اگر تاریکی کے لشکر مجھے چاروں طرف سے گھیر بھی لیں۔تو بھی مجھے صبح کے طلوع کا پختہ یقین ہے۔

فان انا مـت فاني شـهيـد　　　وانت ستمضى بنصر جديد

قم اختارنا الله في دعوتـه　　　وانـا سنمضى عـلى سـنتـه

اگر میں مر جاؤں تو مجھے شہادت کا درجہ نصیب ہوگا۔اور تو ان شاء اللہ نئ کامرانی کے جلو جانب منزل رواں دواں رہے گا۔اللہ تعالیٰ نے اپنی دعوت کے لیے ہمارے نام قرعہ فال ڈالا ہے۔بے شک ہم سنّت الٰہی پر گامزن رہیں گے۔

فمنا الذين قضوا نحبهم　　　ومنا الحفيظ على ذمته

ہم میں کچھ لوگ تو اپنا فرض انجام دے گئے۔اور کچھ اپنے عہد و پیمان پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

سأفدى ولكن لرب و دين　　　وامضى على سنتي في يقين

فاما الى النصر فوق الانام　　　واما الى الله في الخالدين

میں بھی اپنے آپ کو نچھاور کروں گا،لیکن صرف پروردگار اور دین حق پر۔اور یقین واذعان میں سرشار اپنے راستے پر چلتا رہوں گا۔یہاں تک کہ یا تو اس دنیا پر نصرت سے بہرہ یاب ہوجاؤں۔اور یا اللہ کی طرف چلا جاؤں اور زندگی پانے والوں میں شامل ہوجاؤں۔

معالم فی الطریق

''معالم فی الطریق'' سید موصوف کی آخری تصنیف ہے،جس میں ان کی نئ تحریروں کے ساتھ کچھ پرانی تحریریں بھی ترمیم واضافہ کے بعد شامل کی گئی ہیں۔اسی کتاب کو ہم نے جادہ ومنزل'' کے نام سے اردو دان احباب کی خدمت میں پیش کررہے ہیں۔یہی وہ کتاب ہے جس نے سید قطب کو تختہ دار تک پہنچایا ہے۔جہاں تک سید قطب کی انقلابی شخصیت اور تحریکی جوش وولولہ کا تعلق ہے بے شک اس میں وہ اپنے دور کے چند گنے چنے لوگوں میں سے ہیں جب مصر میں فوجی انقلاب برپا ہوا تھا اس میں سید قطب نے جو کردار ادا کیا تھا۔اس کی بنا پر بعض مصری مصنفین نے ان کا ''انقلاب مصر کا میرابوٗ'' کا لقب دیا ہے

۔ ''میرابو'' سے ان کا اشارہ اس فرانسیسی رائٹر کی طرف ہے جو فرانس کے اندر جاگیرداری اور استبداد کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے لیے عوام کو اکساتا رہا ہے۔ سید قطب کی کتاب ''معــركة الاسـلام والـرأسمالية ''میں یہ انقلابی روح صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ اور یہ اس دور میں لکھی گئی ہے جب وہ تمام بڑے بڑے جغاوری جو اس وقت ''اشتراکیت'' اور ''مساوات'' اور اسی نوعیت کے دوسرے نعروں سے ہنگامہ نشور برپا کیے ہوئے ہیں منقار زیر پر تھے۔ ''معالم فی الطریق'' میں انھوں نے اسلامی نظریہ اور اسلامی تنظیم کے بنیادی خدوخال بیان کیے ہیں ۔اس کتاب کی پوری اسکیم جس بنیادی نقطہ نظر پر مرکوز ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح اسلام کے صدر اول میں اسلامی معاشرہ ایک مستقل اور جداگانہ معاشرہ کی صورت میں ''ترقی ونمو'' کے فطری مراحل طے کرتا ہوا بام عروج کو پہنچا اسی طرح آج بھی ویسا صحیح اسلامی معاشرہ وجود میں لانے کے لیے اسی طریق کار کو اختیار کیا جانا لازم ہے۔ اس اسلامی معاشرے کو اردگرد کے جاہلی معاشروں سے الگ رہ کر اپنا تشخص قائم کرنا ہوگا۔

فرد قرارداد جُرم

لیکن مصری حکام نے سید قطب کی اس صحیح اسلامی دعوت کو یہ معنی پہنائے کہ اس میں حکومت وقت کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے لیے لوگوں کو اکسایا گیا ہے۔ کتاب میں سید قطب نے جو کچھ کہا ہے وہ قارئین کتاب کے مطالعہ سے معلوم کرلیں گے ۔اس لیے کتاب کے مختلف اقتباسات سے جو فرد جرم تیار کی گئی ہے، وہ ہم ہو بہو نقل کیے دیتے ہیں ۔ یہ فرد جرم ''مسلح افواج کے میگزین'' (مـجـلة الـقـوات المسلحة) کے نمبر ۴۴۶ ،شمارہ یکم اکتوبر ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے کہ سید قطب کے خلاف فوجی ٹریبونل میں مقدمہ چل رہا تھا۔ اس میگزین نے پہلے تو سید قطب کا باغی اور غدار کہا ہے۔ اور ان پر الزام عائد کیا ہے کہ وہ مصر کے اندر وسیع پیمانے پر توڑ پھوڑ کرنا چاہتے تھے اور مصری حکام اور مصر کے نامور ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو قتل کرنے کی اسکیم تیار کررہے تھے۔ اس کے بعد میگزین نے ان

الزامات کے ثبوت کے لیے ''معالم فی الطریق'' کی عبارتوں کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے اور لکھا ہے:

''مصنف (سید قطب) کا دعوٰی ہے کہ مغرب میں جمہوریت کا قریب قریب دیوالیہ نکل چکا ہے۔ لہٰذا اب اس کے پاس ایسی ''اقدار'' باقی نہیں رہی ہیں جو وہ انسانیت کی خدمت میں پیش کر سکے۔ مارکسزم کے بارے میں بھی اس کی یہ رائے ہے کہ مشرقی کیمپ کا یہ نظریہ بھی اب پسپا ہو رہا ہے۔ یہ نظریہ صرف پامال شدہ اور زبوں ماحول کے اندر پنپ سکتا ہے۔ اس کے بعد مصنف یہ فیصلہ دیتا ہے کہ اب انسانیت کو نئی لیڈرشپ کی ضرورت ہے جو مادی تہذیبوں کو جس تک انسانیت یورپ کے عبقری ذہین کی بدولت پہنچی ہے قائم اور بحال رکھ سکے اور اسے مزید نشو ونما دے سکے۔ وہ کہتا ہے: یورپ کی علمی تحریک بھی اب اپنا رول ادا کر چکی ہے اور اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران میں وہ اپنے کمال کو پہنچ گئی تھی۔ اب اس کے پاس کوئی سرمایہ حیات باقی نہیں رہا ہے۔ یہی حال قطنی اور قومی نظریات کا ہے۔ لہٰذا امت مسلمہ کے وجود کو بحال کیا جانا ناگزیر ہے۔ ان خیالات کے بعد مصنف یہ دعوٰی کرتا ہے کہ آج دنیا جاہلیت کے اندر غرق ہے۔ اس جاہلیت نے دنیا کے اندر ایک اللہ کے اقتدار پر اور اللہ کی حاکمیت پر جو الوہیت کی صفت خاص ہے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔''

''مصنف قرآن کو عقیدہ اساسی کا مآخذ قرار دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم جاہلی معاشرے کے تسلط سے نجات حاصل کریں، اور اس کے ساتھ مصالحت کی روش اختیار نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ وفاداری کا موقف پسند کریں۔ ہمارا دشمن موجودہ جاہلی نظام کو بنیادی طور پر تبدیل کر ڈالنا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی اقدار اور تصورات میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہ کرنین چاہئیے۔ اور نہ جاہلی نظام کے ساتھ کسی مقام پر سودا بازی کا خیال تک کرنا چاہیئے۔ یہ مہم سرانجام دینے کے لیے ہمیں غیر معمولی قربانیاں دینا ہوں گی۔''

''اس فیصلے کے بعد مصنف مختلف اسالیب اختیار کر کے یہ دعوت دیتا ہے کہ ارضی اقتدار کے

خلاف انقلاب برپا کردو جس نے الوہیت کی صفت پر غاصبانی قبضہ کر رکھا ہے۔اس کا بیان ہے کہ محمد (ﷺ) بھی عرب قومیت کی تحریک برپا کر کے قبائل عرب کو اپنے گرد جمع کر سکتے تھے ۔اور عربوں کے سلب شدہ علاقوں کو استعماری سلطنتوں (رومن اور فارسی امپائرز) سے آزاد کرانے کے لیے ان کے قومی جذبات بھڑکا سکتے تھے،لیکن یہ صحیح راستہ نہیں تھا کہ دنیا رومی اور فارسی طاغوتوں کے چنگل سے نکل کر عربی طاغوت کے چنگل میں گرفتار ہو جائے۔''

''طاغوت سے مراد ہر وہ معبود ہے جو اللہ کے ماسوا ہو۔طاغوت کا لفظ بت کدوں کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔اسی مفہوم کی بناء پر طاغوت ''گمراہی کے سرغنوں''اور الٰہی اقتدار پر دست درازی کے لیے استعمال کیا گیا۔''

''مصنف کا بیان ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) دین اسلام لے کر آئے تھے۔اس وقت عرب معاشرہ انتہائی حد تک بگڑ چکا تھا۔تقسیم دولت اور عدل و انصاف کا نظام تباہ ہو چکا تھا۔محدود اقلیت مال و دولت اور تجارت کی اجارہ داری بنی ہوئی تھی۔اور سودی کاروبار کے ذریعہ اپنی دولت میں مزید اضافہ کرتی جارہی تھی۔رہی اکثریت تو اس کے پاس بھوک اور افلاس کے سوا کچھ نہ تھا۔اس پر مصنف یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جانتا ہے کہ معاشرے کے اندر اجتماعی عدل کا نظام ایک ایسے عقیدہ پر استوار ہونا چاہیے جو ہر معاملے کا فیصلہ اللہ کی طرف لوٹاتا ہو۔اور معاشرہ تقسیم دولت کے بارے میں اللہ کے عادلانہ فیصلوں کو خوش دلی کے ساتھ قبول کرتا ہو۔ایسا نظام اس صورت میں خالصتاً الٰہی نظام بن کر نمودار ہو سکتا تھا اگر اسلام قومی نعرے یا اجتماعی تحریک (یعنی لادینی تحریک) سے اپنی دعوت کا آغاز کرتا۔''

''مصنف کا یہ نظریہ ہے کہ عقیدہ فوری طور پر ایک متحرک معاشرے کی شکل میں ابھر آنا چاہیے ۔ایک اور مقام پر وہ لکھتا ہے کہ جس جاہلیت سے رسول اللہ (ﷺ) کو سابقہ درپیش تھا وہ ایک ''مجرد نظریہ'' نہ تھی ، بلکہ ایک متحرک اور توانا معاشرہ تھی ،اور معاشرے کی لیڈرشپ کے آگے

سرنگوں تھی ۔لہٰذا انسان کی پوری کی پوری زندگی اللہ کی طرف لوٹ جانی چاہیے ۔انسان زندگی کے کسی معاملے اور کسی پہلو میں اپنی خودمختاری کی بناپر کوئی فیصلہ نہ کریں ۔نیز جاہلی معاشرے کے اندر ایک نیا متحرک اور توانا معاشرہ ابھرآنا چاہیے جو جاہلی معاشرے سے بالکل الگ تھلگ اور مستقل ہو۔اور اس جدید معاشرے کا محور ایک نئی قیادت ہو۔رسول اللہ (ﷺ) کے عین حیات یہ قیادت آپ کے لیے مخصوص تھی اور آپ ﷺ کے بعد ہر وہ قیادت یہ منصب سنبھال سکتی ہے جو انسانوں کو صرف اللہ کی الوہیت ،حاکمیت ،اقتدار اور شریعت کے آستانہ پر جھکائے ۔جو شخص یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں وہ جاہلیت کے متحرک معاشرے سے قطع تعلق کرے جس سے وہ نکل کر اسلامی معاشرے میں داخل ہورہا ہے ،اسی طرح جاہلی قیادت سے بھی رشتہ منقطع کرلے۔چاہے وہ کاہنوں ،پروہتوں ،جادوگروں اور قیافہ شناسوں کی مذہبی قیادت ہو یا سیاسی ،اجتماعی اور اقتصادی قیادت ہو جیسا کہ قریش کو حاصل تھی۔وہ اپنی تمام تر وفاداریاں نئے اسلامی معاشرے یا اسلامی جماعت کے لیے مخصوص کردے۔مسلم معاشرہ ایک کھلا ہوا معاشرہ ہوتا ہے اس میں ہر نسل وقوم اور ہر رنگ ولسان کے لوگ شامل ہوسکتے ہیں ۔چنانچہ اسلامی تہذیب کبھی بھی محض ''عربی تہذیب'' یا ''قومی تہذیب'' نہ تھی بلکہ وہ ہمیشہ اسلامی اور نظریاتی تہذیب تھی۔''

''مصنف یہ تسلیم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (ﷺ) کو حکم دیا ہے کہ جو قتال کے لیے آئے اس سے قتال کیا جائے۔اور جو قتال سے دست بردار ہوجائے اس سے ہاتھ روک لیا جائے۔لیکن بایں ہمہ مصنف یہ بھی کہتا ہے کہ اسلام نے صرف دفاع کے لیے جہاد نہیں کیا ۔بلکہ اسلام روز اوّل سے یہ نصب العین رکھتا ہے کہ ان تمام نظاموں اور حکومتوں کو ختم کیا جائے جو انسان پر انسان کی حاکمیت کو قائم کرتی ہیں۔اسلام کے غلبہ کے بعد افراد کو فکری آزادی نہیں ہوگی کہ وہ اپنی منشا سے جس دین کو چاہیں اختیار کریں۔''

''مصنف نے قرآن کی آیات سے ثابت کیا ہے کہ اگر ''اسلامی معاشرے'' کے قیام کے راستے میں مادّی موانع حائل ہورہے ہوں تو ان کا طاقت کے ذریعہ ازالہ ضروری ہے۔ یہ مصنف کی طرف سے ایک گھپلا ہے۔قرآن کی جن آیات سے اس نے استشہاد کیا ہے وہ قتال فی سبیل اللہ کی دعوت دیتی ہیں نہ کہ قتل و غارت پر اکساتی ہیں۔لیکن بایں ہمہ مصنف نے باصرار کئی مقامات پر ''طاقت'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔اور بار بار اس سے یہ مراد لیتا ہے: ''رکاوٹوں کا ازالہ''۔''رائج الوقت نظام کا خاتمہ''۔''قوانین کا ابطال'' وہ کہتا ہے: اگر اللہ تعالیٰ نے ایک مخصوص وقت میں جماعت مسلمہ کو جہاد سے روک دیا تھا تو یہ صرف منصوبہ بندی کا تقاضا تھا۔اصولی فیصلہ نہ تھا۔مصنف ہر حکمران کو ''شریک خدا'' تصور کرتا ہے،اور انسان کے انفرادی حقوق کی پرزور حمایت کرتا ہے(اس بارے میں مصنف نے العدالة الاجتماعية میں تفصیل سے بحث کی ہے)''

''دوسری طرف مصنف یہ بیان کرتا ہے کہ وہ معاشرہ میں لوگوں کی اجتماعی زندگی رائے وانتخاب کی آزادی پر استوار ہو وہ متمدن ومہذب معاشرہ ہوتا ہے۔لیکن جس معاشرے کی تشکیل میں لوگوں کی ازادانہ رائے کا حصہ نہ ہوتا ہو وہ معاشرہ پس ماندہ ہے یا اسلامی اصطلاح میں وہ جاہلی معاشرہ ہے۔''

یہ ہے وہ فرد جرم جو سید قطب پر لگائی گئی ہے۔اور اسے معالم فی الطریق کے مضامین سے کشید کیا گیا ہے۔اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سید قطب نے اس کتاب میں انقلاب کی اسکیم پیش کی ہے اور اپنے بہن بھائیوں اور رفقاء کی مدد سے وہ اس اسکیم کو نافذ کرنا چاہتے تھے۔

سید قطب اور مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہما

مصر کے ماہ نامہ الکاتب نے جو مصر کے کمیونسٹ عناصر کا ترجمان ہے۔سید قطب اور ان کے ساتھیوں کے خلاف ''عدالتی کاروائی'' کے دوران ایک مفصل مضمون شائع کیا تھا۔اس مضمون کا عنوان ہے:''اخوان کے تشدد پسندانہ نظریات کے مآخذ''۔اس مضمون کے آغاز میں مضمون نگار نے لکھا ہے کہ:

''فوجی ٹریبونل نے ''معالم فی الطریق'' کے مآخذ پر بھی بحث کی ہے۔چنانچہ ایک موقع پر ٹریبونل کے صدر نے سید قطب سے یہ سوال کیا کہ ''کیا یہ خیالات تم نے ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیفات سے نہیں نقل کیے۔''سید قطب نے جواب دیا:''میں نے مولانا مودودی کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے''عدالت کی طرف سے پھر یہ سوال کیا گیا کہ:''تمہاری دعوت اور ابوالاعلیٰ مودودی کی دعوت میں کیا فرق ہے؟''سید نے کہا:لا فرق، (کوئی فرق نہیں ہے)۔اس کے بعد مضمون نگار جو مصر کی کمیونسٹ پارٹی کا اہم رکن ہے لکھتا ہے:

''اسلامی اتحاد کا نظریہ برطانوی ستعمار اور امریکی امپریلزم کا ایجاد کردہ ہے اور ۱۹۴۷ء سے اسے اشترا کیت کے خلاف استعمال کیا جارہا ہے۔پاکستان ہی میں یہ پیدا ہوا اور پھلا پھولا ہے۔مودودی اسی ملک میں رہتا ہے۔سعید رمضان نے بھی کئی سال اس ملک میں بسر کیے ہیں۔اس لیے کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے کہ اخوان تحریک کو سنٹو کی طرف سے مالی امداد دی گئی ہے۔اور یہ بھی کوئی نرالی بات نہیں ہے کہ سامراج از سرنو اپنا محبوب مہرہ استعمال کررہا ہے۔یعنی مذہب کا استحصال،اور''اسلامی فوجی معاہدہ'' کی تشکیل ان مقاصد کی تکمیل کے لیے سامراج کا سہارا ان ملکوں کی رجع پسند طاقتیں ہیں۔اور یہ مل جل کر وطن پرستوں اور اشترا کی طاقتوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔''

ان تمہیدی کلمات کے بعد مضمون نگار نے دعوٰی کیا کہ سید قطب نے مولانا مودودی کے نظریات کا سرقہ کیا ہے اور انہیں ''معالم فی الطریق'' کے اندر مدون کر دیا ہے۔ مضمون نگار نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پہلے مولانا مودودی اور سید قطب کے افکار کا موازنہ کیا ہے۔ اور اس کے بعد مولانا مودودی اور سید قطب کے افکار کا موازنہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ سید قطب نے اپنی کتاب میں ''حاکمیت'' اور ''جاہلیت'' اور ایسی دوسری اصطلاحیں استعمال کی ہیں وہ مودودی فکر کا نتیجہ ہیں جنھیں وہ عرصہ دراز سے استعمال کرتے چلے آرہے ہیں۔ چنانچہ مضمون نگار نے اس کے ثبوت میں مولانا مودودی کی مختلف تصنیفات مثلاً اسلامی قانون، دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات، اسلامی تحریک کی اخلاقی بنیادیں، مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل، اسلام کا نظام حیات وغیرہ سے مفصل اقتباسات پیش کیے ہیں۔ اسی طرح پردے اور عورت کے بارے میں اور انفرادی ملکیت کے بارے میں سید قطب کے نظریات کو مولانا مودودی کے نظریات کا چربہ بتایا ہے (قارئین کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یہی الزام یہاں پر چند لوگ مولانا مودودی پر لگا رہے ہیں کہ انھوں نے سید قطب کی نقالی کی ہے، حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ دونوں کے مآخذ ایک ہی ہیں یعنی قرآن وسنت) اور لکھا ہے کہ عورت کے بارے میں مولانا مودودی کا جو نظریہ ہے اسی کی بنا پر سید قطب قاہرہ کی ایکٹرسوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ مضمون نگار نے ساری بحث کے بعد آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سید قطب کی تصنیف ''معالم فی الطریق'' درحقیقت مولانا مودودی کی تحریروں کی تشریح اور تفسیر ہے۔ اور لکھا ہے کہ ''اس کتاب کا ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کی بنیاد اور جڑ مودودی کی تحریروں میں نہ ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ مودودی صاف گو ہے اور سید قطب ایچ پیچ کے ساتھ بات کہتا ہے۔''

بہرحال اب اصل کتاب قارئین کے سامنے ہے، وہ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ سید قطب کی اصل دعوت کیا ہے۔ رہی یہ بات کہ سید قطب اور مولانا مودودی کے افکار میں ہم آہنگی یا توارد ہے تو اس میں کیا تعجب کی بات ہے جو شخص بھی صاف ذہن اور اخلاص وعزیمت کے ساتھ کتاب وسنت کا مطالعہ کرے گا

وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا جس پر سلف صالحین پہنچے تھے۔ یا جو آج مولانا مودودی، سید قطب اور دوسرے علمائے حق بیان کر رہے ہیں۔

و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

خلیل احمد حامدی۔ اچھرہ، لاہور۔ یکم مارچ ۱۹۶۸ء

اِنَّ الَّذِيۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَيۡهِمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّةِ الَّتِىۡ كُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ۝ نَحۡنُ اَوۡلِيٰٓـؤُكُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَ فِى الۡاٰخِرَةِ وَ لَكُمۡ فِيۡهَا مَا تَشۡتَهِىۡۤ اَنۡفُسُكُمۡ وَ لَكُمۡ فِيۡهَا مَا تَدَّعُوۡنَ۝ نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِيۡمٍ۝

''جن لوگوں نے کہا اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ''نہ ڈرو، نہ غم کرو، اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی، وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہی ہوگی، یہ ہے سامان ضیافت اس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے۔''

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ مصنف

انسانیت کی زبوں حالی

آج انسانیت جہنم کے کنارے کھڑی ہے۔اس وجہ سے نہیں کہ ہمہ گیر تباہی کا خطرہ اس کے سر پر منڈلا رہا ہے، کیونکہ یہ خطرہ تو محض ظاہری علامت ہے، اصل مرض نہیں۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ آج انسانیت کا دامن ان اقدار حیات سے خالی ہو چکا ہے، جن سے اسے نہ صرف صحت مندانہ بالیدگی حاصل ہوتی ہے، بلکہ حقیقی ارتقاء بھی نصیب ہوتا ہے۔خود اہل مغرب پر بھی اپنا یہ روحانی افلاس خوب اچھی طرح آشکارا ہو چکا ہے، کیوں کہ تہذیب مغرب کے پاس انسانیت کے سامنے پیش کرنے کے لیے آج کوئی صحت مند قدر حیات باقی نہیں، بلکہ اس کے روحانی دیوالیہ پن کا آج تو یہ حال ہے کہ اسے خود اپنے وجود و بقاء کے لیے کوئی بھی ایسی معقول بنیاد یا وجہ جواز نہیں مل رہی جس سے اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے ضمیر اجتماعی ہی کو مطمئن کر سکتی۔جمہوریت مغرب میں بانجھ ثابت ہو چکی ہے جس کی وجہ سے مغرب مشرقی افکار و نظریات اور نظام ہائے حیات کی خوشہ چینی پر مجبور نظر آتا ہے۔سوشلزم کے پردے میں مشرقی کیمپ کے اقتصادی تصورات کو جس طرح مغرب میں اپنایا جا رہا ہے، وہ اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔

دوسری طرف خود مشرقی کیمپ کا حال بھی پتلا ہے مشرق کے اجتماعی نظریات کو لیجیے، ان میں مارکسزم پیش پیش ہے، یہ نظریہ شروع شروع میں مشرق ہی نہیں، بلکہ خود اہل مغرب کی ایک کثیر تعداد کو بھی، اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب ہو گیا۔اس کی کامیابی کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ محض ایک نظام ہی نہ تھا بلکہ اس پر عقیدہ کی چھاپ بھی لگی ہوئی تھی۔مگر اب مارکسزم بھی فکری اعتبار سے مات کھا چکا ہے۔اور اگر یہ کہا جائے کہ

اب یہ ایک ایسی ریاست کا نظام بن کر رہ گیا ہے جسے مارکسزم سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ بہ حیثیت مجموعی یہ نظریہ انسانی فطرت کی ضد واقع ہوا ہے، اور انسانی فطرت کے تقاضوں سے متحارب ہے۔ یہ صرف خستہ اور زبوں ماحول ہی میں پھل پھول سکتا ہے۔ یا پھر اس کے لیے وہ ماحول سازگار ہوتا ہے جو طویل عرصہ تک ڈکٹیٹر شپ برداشت کرتے کرتے اس سے مانوس ہو چکا ہو۔ لیکن اب تو اس طرح کے پامال اور بے جان ماحول میں بھی اس کا مادہ پرستانہ اقتصادی تجربہ ناکام ثابت ہو رہا ہے۔ حالانکہ یہی وہ واحد پہلو ہے جس پر اس کی پوری عمارت قائم ہے، اور جس پر اسے ناز ہے۔ روس اشتراکی نظام کی علمبردار ملکوں کا سرخیل ہے۔ مگر اس کی غذائی پیداوار روز بروز گھٹتی جا رہی ہے۔ حالانکہ زار کے عہد میں بھی روس فاضل اناج پیدا کرتا رہا ہے۔ مگر اب وہ باہر سے اناج درآمد کر رہا ہے۔ اور روٹی حاصل کرنے کے لیے اپنے سونے کے محفوظ ذخائر تک بیچ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اجتماعی کاشت کا نظام یکسر ناکام ہو چکا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ نظام جو انسانی فطرت کے سراسر خلاف ہے اپنے ہاتھوں شکست کھا چکا ہے۔

قیادتِ نو کی ضرورت

ان حالات کی روشنی میں یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ انسانیت اب ایک نئی قیادت کی محتاج ہے۔ اب تک انسانیت کی یہ قیادت اہل مغرب کے ہاتھ میں تھی مگر اب یہ قیادت روبہ زوال ہے۔ اور جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں، اس قیادت کے زوال کا یہ سبب نہیں ہے کہ مغربی تہذیب مادی لحاظ سے مفلس ہو چکی ہے، یا اقتصادی اور عسکری اعتبار سے مضمحل ہوگئی ہے۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مغربی انسان ان زندگی بخش اقدار سے محروم ہو چکا ہے جن کی بدولت وہ قیادت کے منصب پر فائز رہ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب تاریخ کے اسٹیج پر اس کا رول تمام ہو چکا ہے اور ایک ایسی قیادت کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے جو ایک طرف یورپ کی تخلیقی ذہانت کے نتیجے میں حاصل ہونے والی مادی

ترقی کی حفاظت کرسکے اوراسے مزید نشو ونما دے سکے،اوردوسری طرف انسانیت کوایسی اعلیٰ اوراکمل اقدارحیات بھی عطا کرسکے،جن سے انسانی علم اب تک ناآشنا رہا ہے،اورساتھ ہی انسانیت کوایک ایسے طریقِ زندگی سے بھی روشناس کراسکے جوانسانی فطرت سے ہم آہنگ ہو،مثبت اورتعمیری ہو،اور حقیقت پسندانہ ہو۔یہ حیات آفرین اورمنفردنظام حیات صرف اسلام کے پاس ہے۔اسلام کے سوا کسی اور ماخذ سےاس کی جستجو لاحاصل ہے۔

علمی ترقی کی تحریک بھی اپنی افادیت کھوچکی ہے۔اس تحریک کا آغاز سولھویں صدی عیسوی میں علمی بیداری کےساتھ ہی ہوگیا تھا،اٹھارویں اورانیسویں صدی اس کا زمانہ عروج تھا۔مگراب اس کے پاس بھی کوئی سرمایۂ حیات باقی نہیں رہا۔

تمام وطنی اورقومی نظریات جواس دور میں نمودار ہوئے،اوروہ تمام اجتماعی تحریکیں جوان کی نظریات کی بدولت برپا ہوئیں ان کے پاس بھی اب کوئی نیا حربہ باقی نہیں رہاہے۔الغرض ایک ایک کرکے تمام انفرادی اوراجتماعی نظریات اپنی ناکامی کااعلان کرچکے ہیں۔

اسلام کی باری

اس انتہائی نازک،ہوش رُبا اوراضطراب انگیز مرحلے میں تاریخ کےاسٹیج پراب اسلام اورامت مسلمہ کی باری آئی ہے۔اسلام میں موجودہ مادی ایجادات کا مخالف نہیں ہے۔بلکہ وہ تو مادی ایجادات کا مخالف نہیں ہے۔بلکہ وہ تو مادی ترقی کوانسان کافرض اولیں قرار دیتا ہے۔زمین پر نیابتِ الٰہی کے منصب پر فائز ہونے کے بعد پہلے دن سے ہی اس کو جتا دیا تھا کہ مادّی ترقی کا حصول اس کا فرض اولیں ہے ۔چنانچہ اس سے بھی آگے بڑھ کراسلام چند مخصوص شرائط کےتحت مادّی جدوجہدکوعبادت الٰہی کا درجہ دیتا ہے۔اوراسے تخلیق انسانی کی غرض وغایت کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ تصور کرتا ہے،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَةً. (البقرہ:۳۰)

اور یاد کر جب تیرے رب نے فرشتوں کو کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

وَ مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ.(ذاریات:۵۶)

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔

اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو جس مقصد کے لیے اٹھایا ہے اب وقت آ گیا ہے کہ امت مسلمہ اپنے اس مقصد وجود کو پورا کرے۔اس بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ تَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ.(آل عمران:۱۱۰)

تم دنیا میں بہترین گروہ ہو جسے انسانوں کی ہدایت کے لیے میدان میں لایا گیا ہو،تم نیکی کا حکم دیتے ہو،بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّ سَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡكُمۡ شَهِیۡدًا. (البقرہ:۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک امت وسط بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ اور رسول تم پر گواہ ہو۔

اسلام اپنا رول کیسے ادا کر سکتا ہے

اسلام اپنا رول اس وقت تک ادا نہیں کر سکتا جب تک وہ ایک معاشرے کی صورت میں جلوہ گر نہ ہو۔دوسرے لفظوں میں اپنا صحیح رول ادا کرنے کے لیے اسلام کے لیے ایک امت اور قوم کی شکل اختیار کرنا گزیر ہے۔دنیا نے کسی دور میں،اور بالخصوص دورِ حاضر میں،کبھی ایسے خالی خولی نظریہ پر کان نہیں

دھرا جس کا عملی مظہر اسے جیتی جاگتی سوسائٹی میں نظر نہ آئے۔ اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امت مسلمہ کا ''وجود'' کئی صدیوں سے معدوم ہو چکا ہے کیونکہ امت مسلمہ کسی ملک کا نام نہیں ہے جہاں اسلام بستا رہا ہے، اور نہ کسی ''قوم'' سے عبارت ہے جس کے آباء اجداد تاریخ کے کسی دور میں اسلامی نظام کے سائے میں زندگی گزارتے رہے ہیں بلکہ یہ اس انسانی جماعت کا نام ہے جس کے طور طریق، افکار و نظریات، قوانین و ضوابط، اقدار اور معیار ردّ و قبول سب کے سوتے اسلامی نظام کی منبع سے پھوٹتے ہیں۔ ان اوصاف و امتیازات کی حامل امت مسلمہ اسی لمحہ نہاں خانۂ عدم کی نذر ہو چکی ہے جس لمحہ روئے زمین پر شریعت الٰہی کے تحت حکمرانی و جہانبانی کا فریضہ معطل ہوا ہے۔ لیکن اگر اسلام کو دوبارہ وہ کردار ادا کرنا ہے جس کے لیے آج انسانیت چشم براہ ہے تو ناگزیر ہے کہ پہلے امت مسلمہ کے اصل وجود کو بحال کیا جائے، اور اس امت مسلمہ کو از سر نو زندہ کیا جائے جس پر کئی نسلوں کا ملبہ پڑا ہوا ہے، جو غلط نظریات کے انباروں میں دبی پڑی ہے، جو خود ساختہ اقدار و دساتیر کے ڈھیروں میں پنہاں ہے جن کا اسلام اور اسلام کے طریقۂ حیات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے مگر اس کے باوجود اب تک اس خام خیالی میں مبتلا ہے کہ اس کا وجود قائم و دوائم ہے اور نام نہاد ''عالم اسلامی'' اس کا مسکن ہے!

میں اس بات سے بے خبر نہیں ہوں کہ تجدید و احیاء کی کوشش اور حصول قیادت کے درمیان بڑا طویل فاصلہ ہے۔ ادھر امت مسلمہ کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے اصل ''وجود'' کو عرصۂ طویل سے فراموش کر چکی ہے، اور تاریخ کے اسٹیج سے رخصت ہوئے اسے زمانہ دراز گزر چکا ہے۔ غیر حاضری کے اس طویل وقفے میں انسانی قیادت کے منصب پر مختلف نظریات و قوانین، اقوام اور کچھ روایات قابض پا گئی ہیں۔ یہی وہ دور تھا جس میں یورپ کے عبقری ذہن نے سائنس، کلچر، قانون اور مادی پیداوار کے میدان وہ حیرتناک کارنامے انجام دیئے، جن کے باعث اب انسانیت مادّی ترقی اور ایجادات کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہے۔ چنانچہ ان کمالات پت یا ان کمالات کے موجدین پر بآسانی انگلی نہیں دھری جا سکتی۔ خصوصاً اس حالت میں جبکہ وہ خطۂ زمین بھی جسے ''دنیائے اسلام'' کے نام سے پکارا جاتا ہے

ان ایجادات سے قریب قریب خالی ہے۔مگر ان تمام باتوں کے باوجود اسلام کا احیاء نہایت ضروری ہے۔احیائے اسلام کی ابتدائی کوشش اور حصولِ امامت کے درمیان خواہ کتنی ہی لمبی مسافت حائل ہو اور خواہ کتنی ہی گھاٹیاں سدِّ راہ ہوں،احیائے اسلام کی تحریک سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔یہ تو اس راہ میں پہلا قدم ہے اور ناگزیر مرحلہ!

امامتِ عالم کے لیے ناگزیر صلاحیّت کیا ہے؟

ہمیں اپنا کام علی وجہ البصیرت کرنے کے لیے متعین طور پر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کیا صلاحیتیں ہیں جن کی بنا پر امت مسلمہ امامت عالم کا فریضہ ادا کرسکتی ہے یہ اس لیے ضروری ہے تاکہ ہم تجدید واحیاء کے پہلے ہی مرحلے میں ان صلاحتیوں کی تفصیل اور تشخیص میں کسی غلطی کا شکار نہ ہوجائیں۔

امت مسلمہ آج اس بات پر قادر ہے اور نہ اس سے یہ مطلوب ہے کہ وہ انسانیت کے سامنے مادّی ایجادات کے میدان میں ایسے خارق عادۃ تفوق کا مظاہرہ کرے،جس کی وجہ سے اس کے آگے انسانوں کی گردنیں جھک جائیں،اور یوں اپنی اس مادّی ترقی کی بدولت وہ ایک بار پھر اپنی عالمی قیادت کا سکہ منوالے۔یورپ کا عبقری دماغ اس دوڑ میں بہت آگے جاچکا ہے۔اور کم از کم آئندہ چند صدیوں تک اس امر کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی کہ یورپ کی مادّی ترقی کا جواب دیا جاسکے یا اس پر تفوق حاصل کیا جاسکے۔

لہٰذا ہمیں کسی دوسری صلاحیت کی ضرورت ہے۔ایسی صلاحیت جس سے تہذیب حاضر عاری ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مادی ترقی کے پہلو کو سرے سے نظر انداز کردیا جائے۔بلکہ اس معاملے میں بھی پوری جانفشانی اور جدوجہد لازم ہے۔لیکن اس نقطۂ نظر سے نہیں کہ ہمارے نزدیک موجودہ مرحلے میں یہ انسانی قیادت کے حصول کے لیے کوئی ناگزیر صلاحیت ہے،بلکہ اس نقطۂ نظر سے کہ یہ ہمارے وجود بقا کی ایک ناگزیر شرط ہے۔اور خود اسلام جو انسان کو خلافتِ ارضی کا وارث قرار دیتا ہے،اور چند مخصوص

شرائط کے تحت کارِخلافت کو عبادت الٰہی اور تخلیق انسانی کی غرض وغایت خیال کرتا ہے، مادی ترقی کو ہم پر لازم ٹھہراتا ہے۔

انسانی قیادت کے حصول کے لیے مادّی ترقی کے علاوہ کوئی اور صلاحیت درکار ہے۔اور یہ صلاحیت صرف وہ عقیدہ اور نظامِ زندگی ہوسکتا ہے جو انسانیت کو ایک طرف یہ موقع دے کہ وہ مادّی کمالات کا تحفظ کرے، اور دوسری طرف اس طمطراق کے ساتھ پورا کرے جس طرح موجودہ مادّی ذہن نے پورا کیا ہے۔اور پھر یہ عقیدہ اور نظامِ حیات عملاً ایک انسانی معاشرے کی شکل اختیار کرے یا بالفاظِ دیگر ایک مسلم معاشرہ اس کا نمائندہ ہو۔

عہدحاضر کی جاہلیت

موجودہ انسانی زندگی کی بنیادیں اور ضابطے جس اصل اور منبع سے ماخوذ ہیں اس کی رُو سے اگر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آج ساری دنیا ''جاہلیت'' میں ڈوبی ہوئی ہے۔اور ''جاہلیت'' بھی اس رنگ ڈھنگ کی ہے کہ یہ حیرت انگیز مادّی سہولتیں اور آسائشیں اور بلند پایہ ایجادات بھی اس کی قباحتوں کو کم یا ہلکا نہیں کرسکتیں۔اس جاہلیت کا قصر جس بنیاد پر قائم ہے، وہ ہے اس زمین پر خدا کے اقتدار اعلیٰ پر دست درازی، اور حاکمیت جو الوہیت کی مخصوص صفت ہے اس سے بغاوت۔چنانچہ اس جاہلیت نے حاکمیت کی باگ دوڑ انسان کے ہاتھ میں دے رکھی ہے۔اور بعض انسانوں کو بعض دوسرے انسانوں کے لیے اربابٌ من دون اللّٰہ کا مقام دے رکھا ہے۔اس سیدھی سادی اور بتدائی صورت میں نہیں جس سے قدیم جاہلیت آشنا تھی بلکہ اس طنطنے اور دعوے کے ساتھ کہ انسانوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ خود افکار واقدار کی تخلیق کریں، شرائع وقوانین وضع کریں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے لیے جو چاہیں نظام تجویز کریں۔اور اس سلسلہ میں انہیں یہ معلوم کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے لیے کیا نظام اور لائحہ عمل تجویز کیا ہے، کیا ہدایت

نازل کی ہے اور کس صورت میں نازل کی ہے ۔اس باغیانہ انسانی اقتدار اور بے لگام تصورِ حاکمیت کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ خلق اللہ ظلم و جارحیت کی چکی میں پس رہی ہے چنانچہ اشترا کی نظاموں کے زیرسایہ انسانیت کی جو تذلیل ہو رہی ہے، یا سرمایہ دارانہ نظاموں کے دائرے میں سرمایہ پرستی اور جوع الارضی کے عفریت نے افراد و اقوام پر ظلم و ستم کے جو پہاڑ توڑ رکھے ہیں وہ دراصل اسی بغاوت کا ایک شاخسانہ ہے جو زمین پر خداوند تعالیٰ کے اقتدار کے مقابلے میں دکھائی جا رہی ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو تکریم اور شرف عطا کیا ہے انسان اُسے خود اپنے ہاتھوں پامال کر کے نتائج بد سے دوچار ہے۔

اِسلام اور جاہلیت کا اصل اِختلاف

اس بارے میں صرف اسلامی نظریۂ حیات ہی منفرد خصوصیت کا علمبردار ہے۔اِسلامی نظامِ حیات کے سوا آپ جس نظام کو بھی لیں گے آپ دیکھیں گے کہ اس میں انسان دوسرے انسانوں کی کسی نہ کسی شکل میں عبودیت کرتا نظر آتا ہے۔صرف اسلام ہی ایک ایسا نظام حیات ہے جس میں انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کی عبودیت سے آزاد ہو کر صرف خدائے واحد کی عبودیت اور بندگی کے لیے مخصوص ہو جاتا ہے وہ صرف اللہ کی بارگاہ سے رشد و ہدایت کی روشنی سے رشد و ہدایت کی روشنی حاصل کرتا ہے اور صرف اُسی کے آگے سرافگندہ ہوتا ہے۔

یہی وہ نقطہ ہے جہاں اسلام اور غیر اسلامی طرزِ حیات کی راہیں جدا جدا ہو جاتی ہیں ۔ یہ ہے وہ نیا اور نرالا تصور زندگی جسے ہم انسانیت کی خدمت میں آج پیش کر سکتے ہیں ۔ یہ تصور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر گہرے اثرات ڈالتا ہے۔یہی وہ نادر خزانہ ہے جس سے آج انسانیت محروم ہے۔اس لیے کہ مغربی تہذیب اس سلسلہ میں بانجھ ہے،اور یورپ کی حیران کن تخلیقی صلاحیتیں بھی ،خواہ وہ مغربی یورپ ہو یا مشرقی یورپ اس خزانے تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر ہیں!

یہ بات ہم پورے دعوے سے کہتے ہیں کہ ہم ایک ایسے نظام حیات کے داعی ہیں جو نہایت درجہ کامل

اور ہر لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے۔ پوری نوع انسانی ایسے گنج گراں مایہ سے خالی ہے۔ دیگر مادّی مصنوعات کی طرح وہ اسے ''پیدا'' کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ہے ،اس نظامِ نَو کی خوبی اُس وقت تک نمایاں نہیں ہوسکتی، جب تک اسے عمل کے قالب میں نہ ڈھالا جائے گا۔ پس یہ ضروری ہے کہ ایک امت عملاً اپنی زندگی اس کے مطابق استوار کر کے دکھائے۔ اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے کہ کسی ایک اسلامی ملک میں احیائے دین کی مہم کی طرح ڈالی جائے۔ احیائے نو کی یہی وہ ناگزیر کوشش ہے، جو طویل یا مختصر مسافت کے بعد، بالآخر انسانی امامت وقیادت کے قبضہ پر منتج ہوگی۔

احیائے دین کا کام کیسے ہو؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احیائے اسلام کی مہم کا آغاز کس طرح ہو؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ پہلے ایک ہراول دستہ وجود میں آئے جو اس کارِ عظیم کا عزمِ صمیم لے کر اٹھے۔ اور پھر مسلسل منزل کی طرف پیش قدمی کرتا چلا جائے۔ اور جاہلیت کے اس بیکراں سمندر کو چیرتا ہوا آگے کی جانب رواں دواں رہے جس کی لپیٹ میں پوری دنیا آ چکی ہے۔ وہ اپنے سفر کے دوران میں اس ہمہ گیر جاہلیت سے یک گونہ الگ تھلگ بھی رہے اور ایک گونہ وابستہ بھی۔ یہ ہراول دستہ جس منزل تک پہنچنا چاہتا ہے ضروری ہے کہ اسے اپنے راستے کے نقوش اور سنگ ہائے میل پوری طرح معلوم ہوں، جنہیں دیکھ کر وہ اپنی مہم کے مزاج وطبیعت، اپنے فرض کی حقیقت واہمیت، اپنے مقصد کی کنہ، اور اس سفرِ طویل کا نقطۂ آغاز پہچان سکے، نہ صرف یہ بلکہ اسے یہ بھی شعور حاصل ہونا ضروری ہے کہ کہ اس عالم گیر جاہلیت کے مقابلے میں اس کا موقف کیا ہے؟ کس کس پہلو میں وہ دوسرے انسانوں سے ملے، اور کس کس مقام پر اُن سے جدا ہو؟ وہ خود کن خوبیوں اور صلاحیتوں کا حامل ہے؟ اور ارد گرد کی جاہلیت کن کن خصوصیات وخصائل سے مسلح اور لیس ہے؟ نیز وہ اہل جاہلیت کو کیسے اسلام کی زبان میں خطاب کرے، اور کن کن مسائل

ومباحث میں خطاب کرے؟ اور پھر اُسے یہ بھی معلوم ہونا چاہئیے کہ وہ ان تمام امور میں کہاں سے اور کیسے رہنمائی حاصل کرے؟

ان نقوش راہ سنگ ہائے میل کا تعین اور تشخص اسلامی عقیدہ کے ماخذ اولین کی روشنی میں ہوگا۔ ماخذ اولین سے ہماری مراد قرآن حکیم ہے۔ اس کتاب کی بنیادی تعلیمات ان نقوش راہ کی نشان دہی کریں گی۔ یا پھر وہ تصوراس بارے میں رہنمائی کرے گا، جو قرآن حکیم نے اس پاکیزہ و برگزیدہ جماعت کے دلوں پر نقش کردیا تھا جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اندر اپنی حکمت عملی وقدرت کے محیرالعقول کرشمے کر دکھائے۔ اور ایک مرتبہ تو اس جماعت نے تاریخ انسانی کا دھارا بدل کر اس رخ پر موڑ دیا جو مشیتِ خداوندی کو مطلوب ومقصود تھا۔

حقیقتِ منتظر

اِسی ہراول دستے کے لیے جس میں ''حقیقت منتظر'' سمجھتا ہوں، میں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کے چار ابواب میری ''تفسیر فی ظلال القرآن'' سے ماخوذ ہیں، جن میں میں نے موضوع کی رعایت سے کچھ ترمیم و اضافہ کر دیا ہے۔ اس مقدمہ کے علاوہ بقیہ آٹھ ابواب میں نے مختلف اوقات میں قلمبند کیے ہیں۔ قرآن حکیم کے پیش کردہ ربّانی نظریۂ حیات پر غور وفکر کے دوران میں مختلف اوقات میں مجھ پر جو حقائق منکشف ہوئے، وہ میں نے ان ابواب میں سپرد قلم کردیئے ہیں۔ یہ خیالات بظاہر بے جوڑ اور منتشر معلوم ہوں گے۔ مگر ایک بات ان سب میں مشترک ملے گی، اور وہ یہ کہ یہ خیالات ''معالم فی الطریق'' ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر راستے کی علامات کا یہی حال ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ گزارشات ''معالم فی الطریق'' کی پہلی قسط ہیں۔ اور امید ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کتاب کو پیش کرنے کی توفیق دی ہے، اس موضوع پر اور بھی چند مجموعے پیش کرنے کی توفیق نصیب ہوگی (سید موصوف اپنے اس ارادے کو شرمندۂ تکمیل نہ کر سکے۔ بلکہ معالم فی الطریق ان کی آخری تصنیف ثابت ہوئی

۔مترجم)۔وباللہ توفیق۔

باب اوّل

قرآن کی تیار کردہ لاثانی نسل

اسلام کے نام لیواؤں کو تاریخ اسلام کا ایک نمایاں پہلو خاص طور پر پیشِ نظر رکھنا چاہیئے ۔ کیوں کہ یہ پہلو دعوت کے طریقِ کار اور رجحان پر نہایت گہرا اور فیصلہ کن اثر ڈالتا دکھائی دیتا ہے ۔ لہٰذا ضروری ہے کہ دعوتِ اسلامی کے علمبردار خواہ کسی ملک اور زمانے سے تعلق رکھتے ہوں اس پہلو پر زیادہ سے زیادہ غور کریں ۔ یہ پہلو اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ دعوتِ اسلامی نے ایک زمانے میں ایسی انسانی نسل تیار کی تھی جس کی مثال پوری اسلامی تاریخ ، بلکہ پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی ۔ اس نسل سے مراد رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں ۔ اس نسل کے بعد تاریخی ادوار میں دعوتِ اسلامی کے ہاتھوں اس طرز اور کردار کی جمعیت پھر وجود میں نہیں آئی ۔ اگرچہ تاریخ کے ہر دَور میں اس کردار کے افراد تو بلاشبہ پائے گئے ہیں ، مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک ہی خطے میں بڑی تعداد میں اس طرز اور کردار کے لوگ جمع ہو گئے ہوں ۔ جس طرح اسلام کے اوّلین دور میں جمع ہوئے ۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کا ثبوت تاریخ کے صفحات سے ملتا ہے ۔ اور اس کی تہ میں ایک خاص راز پنہاں ہے ، ہمیں اس بدیہی حقیقت کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنا چاہیئے تا کہ اس راز تک رسائی حاصل کر سکیں ۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد ایسی لا ثانی جمعیت کیوں وجود میں نہ آئی؟

اسلام کی دعوت و ہدایت جس کتاب میں موجود ہے وہ ہمارے ہاتھوں میں ہے ۔اس کتاب کو پیش کرنے والی ہستی رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات واحادیث اور سیرت پاک آج بھی اُسی طرح ہماری نگاہوں کے سامنے ہے جس طرح وہ اسلامی جمعیت کی نگاہوں کے سامنے تھی جس کا تاریخ کے اسٹیج پر دوبارہ اعادہ نہ ہوسکا۔فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس اس جمعیت کے قائد تھے،اوراب یہ صورت حال نہیں ہے۔لیکن کیا یہی فرق اسلام کی مثالی تنظیم کے دوبارہ وجود میں نہ آنے کا سبب ہے؟ رسول اللہ ﷺ کا وجودِ مبارک اگر دعوتِ اسلامی کے قیام اور بارآور ہونے کے لیے حتمی اور ناگزیر ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ہرگز عالمگیر دعوت اور پوری انسانیت کا دین نہ قرار دیا ہوتا،اور نہ اسے انسانیت کے لیے آخری پیغام کی حیثیت دی ہوتی،اور نہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے معاملات ومسائل کی اصلاح کی ذمہ داری قیامت تک کے لیے اس کے سپرد ہوتی۔اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہے۔اس لیے کہ وہ علیم وخبیر جانتا ہے کہ اسلام رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی برپا ہوسکتا ہے،اوراپنے ثمرات سے انسانیت کو بہرور کرسکتا یہ۔چنانچہ اس دعوت کو جب ۲۳ سل گزر گئے۔اور وہ اوج کمال تک پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کو اپنے جوارِ رحمت میں طلب فرمالیا۔اور آپ ﷺ کے بعد اس دین کو زمانۂ آخر تک کے لیے جاری وساری کردیا۔پس رسول مقبول ﷺ کے وجود گرامی کا نگاہوں سے اوجھل ہوجانا معیاری اسلامی جمعیت کے فقدان کے باعث نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اس کی پہلی وجہ

تو پھر ہمیں اس کا کوئی اور سبب تلاش کرنا چاہیئے اس سلسلے میں ہمیں اس چشمۂ صافی پر بھی نگاہ ڈالنی چاہیئے جس سے پہلی اسلامی نسل نے اسلام کا فہم وشعور حاصل کیا۔شاید اس ک اندر ہی کوئی تغیّر واقع ہو چکا ہو!اس طریق کار کا بھی جائزہ لے لینا چاہیئے جس کے مطابق اس نے تربیت حاصل کی،ممکن ہے اس میں تبدیلیوں نے راہ پالی ہو!جس چشمہ سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی احادیث اور تعلیمات اس چشمے سے پھوٹنے والے سوتے تھے۔چنانچہ جب ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ دریافت کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیسے تھے؟تو آپ نے فرمایا: كان خلقه القرآن (آپ کا اخلاق قرآن کا چلتا پھرتا نمونہ تھے)۔الغرض صرف قرآن حکیم ہی وہ واحد سرچشمہ تھا جس سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سیراب ہوتے تھے،یہی وہ سانچہ تھا جس میں وہ اپنی زندگیوں کو ڈھالتے تھے،اسی سے وہ اکتساب فیض کرتے تھے۔صرف قرآن پر ان کا اکتفاء کر لینا اس وجہ سے وہ اکتساب فیض کرتے تھے۔صرف قرآن پر ان کا اکتفاء کر لینا اس وجہ سے نہ تھا کہ اس وقت دنیا میں کسی اور تہذیب وتمدن اور ثقافت کے آثار موجود نہ تھے،علمی تحقیقات اور سائنسی کمالات کا وجود ناپید تھا۔حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام مظاہر گونا گوں شکلوں میں موجود تھے۔مثلاً رومی تہذیب موجد تھی۔رومی علم وحکمت اور رومی قانون ونظام کا ڈنکا بج رہا تھا جو آج بھی یورپ کی تہذیب کی بنیاد ہے یا کم از کم موجودہ یورپ اس کی ترقی یافتہ صورت ہے۔یونانی تہذیب کا ترکہ بھی منطق وفلسفہ اور ادب وفن کے رنگ میں موجود تھا جو آج تک مغرب کے فکر ونظر کا مرجع ہے۔عجمی وتمدن،عجم کا آرٹ،اس کی شاعری،اس کا روایتی ادب اور اس کے عقائد اور نظامہائے حکومت کا غلغلہ تھا۔اور بھی کئی تہذیبیں جزیرۃ العرب کے قریب یا دور پائی جاتی تھیں،مثلاً ہندی تہذیب اور چینی تہذیب۔رومی اور عجمی دونوں تہذیبوں کے دھارے جزیرۃ العرب کے ساتھ ساتھ شمال اور جنوب میں بہہ رہے تھے۔مزید برآں یہودی اور مسیحی آبادیاں خود جزیرۃ العرب کے وسط میں

موجوتھیں۔لہٰذا ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پہلی اسلامی نسل کا صرف کتاب الٰہی پر اکتفاء کرنا اورفہم دین کے خاطر کسی اور چشمہ سے رجوع نہ کرنا فکر ونظر کے جمود اور تہذیب وتمدن سے بیگانگی کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے اور طے کردہ طریق کار کی بناپر تھا۔اس امر کی دلیل خود جناب رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عمل سے ملتی ہے ۔آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تورات کے چند اوراق دیکھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھ کرناراض ہوئے اورفرمایا:((وانــــه واللّٰه لـو كـان موسٰى حيا بين اظهركم ما حل له الا ان يتبعنى)) ''اللہ کی قسم،اگر موسیٰ بھی آج تمہارے اندر موجود ہوتے تو میری ہی اطاعت کرتے''(یہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے،اور اسے حافظ ابو یعلیٰ نے حماد اور شعبی کی سند سے روایت کیا ہے)

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادۃً اسلام کی اس اولین نسل جوابھی دورِتعمیر سے گزر رہی تھی صرف ایک ہی چشمہ سے اکتساب فیض کرنے پر محدود رکھا،اور وہ تھا قرآن حکیم۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا یہ تھا کہ اس جماعت کے دل صرف کتاب اللہ ہی کے لیے خالص ہوجائیں،اور اسی کے پیش کردہ نظامِ حیات کے مطابق وہ اپنے حالات کی اصلاح کریں۔اس لیے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم یہ دیکھ کر غضب آلود ہوگئے کہ عمر رضی اللہ عنہ قرآن کے بجائے ایک دوسرے ماخذ کی طرف مائل ہیں۔دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی لاثانی نسل تیار کرنا چاہتے تھے جس کا دل ودماغ نہایت پاکیزہ اور مطہر ہو،جس کا احساس وشعور انتہائی صاف وشفاف ہو اور جس کی تعمیر میں قرآن کے طریقۂ تربیت وتعلیم کے سوا کسی دوسرے طریقہ کو دخل نہ ہو۔

یہ نسل یا جمعیت تاریخ میں لاثانی اور یکتا تنظیم سمجھی گئی ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے دین کے فہم اور تربیت کا اکتساب صرف ایک ہی ماخذ سے کیا۔مگر بعد کے ادوار میں یہ صورت پیش آئی کہ اس چشمے کے اندر اور متعدد چشموں کی آمیزش ہوگئی۔بعد کی نسلوں نے جس چشمہ سے اخذ واکتساب کیا اس کا یہ حال تھا کہ اس میں یونانی فلسفہ ومنطق،قدیم عجمی قصے کہانیاں،اسرائیلیات،مسیحی الٰہیات اور دوسرے

مذاہب اور تمدنوں کے بچے کچھے آثار مخلوط ہو چکے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم کی تعبیرات پر ان تمام چیزوں کا عکس پڑا، علم الکلام ان سے متاثر ہوا، فقہ اور اصول فقہ ان کے دخل سے نہ بچ سکے۔ نسل اولین کے بعد جتنی نسلیں اٹھیں وہ اسی مخلوط چشمہ سے اکتساب وفیض حاصل کرتی رہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ کرام جیسی کامل وخالص ہیئت اجتماعیہ دوبارہ منصہ ٔظہور پر نہ آسکی۔ اور ہم یہ بات کسی شک وشبہ کے بغیر کہتے ہیں کہ بعد کی نسلوں اور اسلام کی پہلی یکتا وممتاز جمعیت میں جو نمایاں اختلاف نظر آتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ بعد میں اسلام کے اولین منبع رشد وہدایت میں ان مختلف مآخذ اور گوناگوں چشموں کا اختلاط ہو گیا جن میں سے بعض کی جانب ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں۔

دوسری وجہ

اس فرق کو پیدا کرنے میں ایک اور اساسی عامل بھی کارفرما ہے۔ صحابہ کرام نے قرآن سے اکتسابِ فیض کا جو طریقہ اختیار کیا تھا بعد کے ادوار میں اس میں بھی تبدیلی رونما ہو گئی۔ صحابہ کرام قرآن کی تلاوت اور اس میں تدبر اس غرض سے نہیں کرتے تھے کہ اپنی معلومات کو بڑھائیں، یا ادبی ذوق کو تسکین دیں، یا ذہنی تفریح کا سامان مہیا کریں۔ ان حضرات میں سے کوئی فرد بھی کبھی اس غرض کے لیے قرآن نہیں سیکھتا تھا کہ وہ اپنی معلومات عامہ کا دائرہ وسیع کرنا چاہتا ہے، علمی اور قانونی رموز ومسائل میں اپنے سابقہ علم کے اندر اضافہ کرنا چاہتا ہے، یا کسی بھی پہلو سے اپنی علمی کسر کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ وہ قرآن کی طرف اس لیے رجوع کرتا تھا تاکہ وہ یہ معلوم کرے کہ اس کی انفرادی زندگی کے بارے میں مالک الملک نے کیا ہدایات دی ہیں؟ جس معاشرے کے اندر وہ سانس لے رہا ہے اس کی اجتماعی زندگی کے لیے کیا احکام ہیں؟ اس مخصوص نظامِ حیات کے بارے میں جس کا وہ اور اس کی جماعت علمبردار ہے پروردگار عالم کی طرف سے کیا تفصیلات دی گئی ہیں؟۔ اس برگزیدہ جماعت کا ہر فرد میدانِ جنگ میں لڑنے والے سپاہی کی مانند اللہ کے احکام موصول ہوتے ہی ان پر بلاچون وچرا کاربند ہو جاتا تھا۔ وہ

ایک ہی نشست میں قرآن حکیم کی کئی سورتیں نہیں پڑھ ڈالتا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس طرح اس کے کندھوں پر یکدم بہت سے فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ آپڑے گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ دس آیات کی تلاوت کرتا ،انہیں حفظ کرتا ،اوران کو عملی زندگی پر نافذ کرتا۔اس طریقہ تعلیم کی تفصیل ہمیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے ملتی ہے (حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو حافظ ابن کثیر نے اپنے مقدمہ تفسیر میں نقل کیا ہے)۔

احکام الٰہی کی تعمیل کے اس احساس نے ان حضرات پر نہ صرف روحانی لذت وتسکین کے بے شمار افق واکر دیئے بلکہ علم وعرفان کی بے شمار راہیں بھی ان پر کھول دیں۔ وہ اگر صرف کیف ونشاط اور مجرد علم وآگہی کے ارادے سے قرآن کو پڑھتے تو غیر محدود روحانی حظ انہیں ہرگز حاصل نہ ہوسکتا تھا۔اور وہ علم وعرفان کے بحر ناپیدا کنار میں شناوری نہ کر سکتے تھے۔ پھر احساس اطاعت گزاری نے ان کے لیے عمل کو نہایت درجہ آسان کر دیا ،اللہ کے احکام ان کے لیے بوجھ بننے کے بجائے ہلکے پھلکے اور حد درجہ آسان ہو گئے ،قرآن کی تعلیمات ان کے نفوس میں اس طرح اتر گئیں کہ ان کی زندگیاں اسلام کا چلتا پھرتا نمونہ بن گئیں، وہ ایک ایسی ثقافت کا عملی پیکر بن گئے جو ذہن کی تختیوں اور کتاب کے صفحات تک محدود نہیں تھی بلکہ ایک ایسی عملی تحریک کی شکل میں جلوہ گر تھی جس نے انسانی زندگی کا دھارا بدل کر رکھ دیا۔

قرآن اپنے خزانوں کی کنجیاں صرف ان لوگوں کو عطا کرتا ہے جو اس احساس وجذبہ کے ساتھ اُس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں کہ قرآن سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہوں گے۔قرآن اس لیے نہیں نازل ہوا کہ وہ ذہنی لذت اور تسکین ذوق کی کتاب بن جائے ،یا محض ادب وفن کا شہ پارہ قرار پائے ،یا اسے قصے کہانیوں اور تاریخ کا دفتر سمجھا جائے۔ اگر چہ اس کے مضامین ضمنی طور پر ان تمام خوبیوں سے مالا مال ہیں مگر اس کے نزدیک نزول کا مقصد یہ ہے کہ وہ کتابِ زندگی ہو، وہ انسان کا رہنما ہو۔ وہ یہ بتانے کے لیے آیا ہے کہ مالک الملک کو زندگی کا کون سا ڈھب محبوب ہے۔اسی مقصد ومدّعا کے پیشِ نظر وہ صحابہ

کرام کو تدریج کے ساتھ اپنے مخصوص طریقِ زندگی کی تربیت دیتا رہا اور ٹھیر ٹھیر کر وقفوں سے ان پر احکام وہدایات نازل کرتا رہا۔ اِسی تدریجی طریقِ تعمیر وتربیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا.(بنی اسرائیل:١٠٦)

اوراس قرآن کوہم نے تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کیا ہے تاکہ تم ٹھیر ٹھیر کر اسے لوگوں کو سناؤ اوراسے ہم نے (موقع موقع سے) بتدریج اتارا ہے۔

قرآن کریم یکبارگی نازل نہیں ہوا۔ بلکہ اسلامی معاشرے کے اندر جیسے جیسے نو بہ نو ضروریات پیدا ہوتی گئیں ،لوگوں کے فہم وشعور میں بالیدگی اور وسعت رونما ہوتی گئی ،عام انسانی زندگی ارتقاء سے ہمکنار ہوتی گئی ،اوراسلامی جماعت کوعملی میدان میں مشکلات ومسائل سے سابقہ پیش آ گیا اس کے مطابق قرآن کا نزول ہوتا گیا ۔ایک آیت یا چند آیات مخصوص نوعیت کے حالات اورمخصوص واقعات کی مناسبت سے اتریں،اوران بعض الجھنوں کوحل کرتیں جولوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتیں،ان حالات کی نوعت واضح کرتیں اوران سے نبٹنے کے لیے لائحہ عمل متعین کرتیں جن میں وہ گھرے ہوتے تھے ۔ان کے شعورواحساس کی لغزشوں اورمعاملات کی غلطیوں کی تصحیح کرتیں۔ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ سے ان کے تعلق کواستوار کرتیں ،اورانہیں اپنے پروردگار سے ان کی ان صفات کی روشنی میں متعارف کراتیں جواس کائنات پر ہمہ پہلو اثر انداز ہورہی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس حقیقت کا اچھی طرح احساس کرلیا تھا کہ وہ زندگی کا ہرلمحہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اورنگرانی اورملاء اعلیٰ کی معیت میں بسر کررہے ہیں۔اوررحمت خداوندی کے سایۂ عاطفت میں سفرِ حیات طے کررہیں ہیں ۔اس احساس کی وجہ سے ان کی عملی زندگی اس مقدس قانون حیات کے مطابق ڈھل جاتی تھی جواللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں تعلیم کیا جارہا تھا۔

پس معلوم ہوا کہ ’’تعلیم برائے تعمیل‘‘ کے اس مخصوص طریقِ کار بے صحابۂ کرام کی لاثانی ،مبارک

اور منفرد تنظیم تیار کی۔اور بعد کی نسلیں جس طریقِ کار کی روشنی میں تیار ہوئیں وہ ''تعلیم برائے تحقیق وتفریح'' سے عبارت تھا۔اور لاریب یہ وہ دوسرا اساسی عامل ہے جس نے بعد کی نسلوں کو پہلی لاثانی اسلامی نسل سے بالکل مختلف کردیا۔

تیسری وجہ

ایک تیسرا عامل بھی اسی تاریخی حقیقت میں کارفرما نظر آتا ہے۔اس کا جائزہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ عہد رسالت میں ایک شخص جب حلقہ بگوشِ اسلام ہوجاتا تو وہ اپنے دور جاہلیت کو یک قلم ترک کردیتا تھا۔دائرہ اسلام میں قدم رکھتے ہی وہ یہ محسوس کرتا کہ وہ کتابِ حیات کا ایک نیا ورق الٹ رہا ہے،اور ایک نئے دور میں داخل ہورہا ہے جو گزشتہ جاہلی زندگی سے یکسر مختلف ہے،وہ جاہلی زندگی کے تمام معمولات کو شک وشبہ اور خائف نگاہوں سے دیکھتا۔اُس پر یہ خیال طاری رہتا کہ یہ تمام ناپاک اور پلید کام تھے،ان میں اور اسلام میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔پھر اسی احساس اور قلبی دھڑکن کے ساتھ وہ اسلام کی طرف لپکتا تاکہ وہاں سے نورِ ہدایت حاصل کرے۔اور کبھی اس کا نفس امّارہ غالب آجاتا یا ترک شدہ عادات کی کشش اس پر غالب آجاتی یا اسلام کے احکام کی تعمیل میں اس سے کوئی تساہل ہوجاتا تو وہ احساسِ گناہ ولغزش سے بے چین ہوجاتا اور فوراً توبہ کرتا،وہ اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اپنے گناہ کی تلافی اور روح کی تطہیر کی ضرورت محسوس کرتا۔اور دوبارہ قرآنی ہدایت کے مطابق مکمل طور پر ڈھل جانے کے لیے کوشاں ہوجاتا۔

دامنِ اسلام میں پناہ لینے کے بعد ایک مسلمان کی یہ کیفیت ہوجاتی تھی کہ اس کے جاہلی دور اور نئی اسلامی زندگی کے درمیان کامل انقطاع واقع ہوجاتا تھا۔یہ انقطاع پورے شعور اور سوچے سمجھے فیصلے کے تحت ہوتا۔اس کے نتیجے میں اردگرد کے جاہلی معاشرے کے ساتھ اس کے تمام اجتماعی روابط ٹوٹ جاتے۔وہ اپنی کشتیاں جلاکر اس جذبہ وولولہ کے ساتھ اسلام کے ساتھ مکمل طور پر وابستہ ہوجاتا کہ

جاہلی ماحول کے ساتھ اس کا ایک ایک رشتہ کٹ جاتا۔اگرچہ تجارت اور روزانہ لین دین میں مشرکوں کے ساتھ اس کا واسطہ قائم رہتا تھا مگر اس سے اس امر واقع میں کوئی فرق نہ پڑتا تھا کیوں کہ احساس وشعور کا تعلق اور محض کاروباری تعلق دو مختلف اور الگ الگ چیزیں ہیں، جاہلی ماحول، جاہلی رسوم ورواج ،جاہلی افکار ونظریات اور جاہلی عادات واطوار سے یہ کلی دستبرداری درحقیقت اُس عظیم فیصلے کا مظہر تھی جس کی رو سے ایک شخص شرک سے دست بردار ہوکر دامنِ توحید میں پناہ لیتا تھا،زندگی وکائنات کے بارے میں اہل جاہلیت کے تصور کو تج کر اسلام کے تصور کو اپناتا تھا،اور ایک نئی قیادت کے زیر سایہ جدید اسلامی تنظیم سے منسلک ہوجاتا تھا اور اپنی تمام وفاداریاں اور اطاعت گزاریاں اس نئے معاشرے اور نئی قیادت کے لیے وقف کر دیتا تھا۔

یہی وہ فیصلہ تھا جو اس کی شاہراہ حیات کو دوسری تمام راہوں سے الگ کر دیتا تھا۔اس فیصلہ کے بعد وہ زندگی کے نئے سفر کا آغاز کر دیتا تھا۔آزاد سفر، جاہلی معاشرہ کی گھٹی میں پڑی ہوئی روایات کے بوجھ ،اور جاہلی اقدار ونظریات کے دباؤ سے آزاد سفر اس سفر میں اگر کسی بوجھ سے مسلمان کو سامنا تھا تو وہ آزمائش واذیت تھی جو جاہلیت کے ہاتھوں اُسے پہنچتی تھی۔لیکن وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں ہر امتحان اور ہر صعوبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے اور راہ حق پر گامزن رہنے کا عزم صمیم کر چکا ہوتا تھا۔اس لیے جاہلیت کے تصورات اور جاہلی معاشرے کی روایات کا دباؤ اس کی سخت جانی پر کوئی اثر نہ ڈال سکتے تھے۔

ہمارے لیے صحیح طریقہ کار؟

آج بھی ہم جاہلیت میں گھرے ہوئے ہیں۔یہ جاہلیت بھی اسی خُو بُو کی ہے جس سے اسلام کو صدرِاول میں سابقہ پیش آیا تھا۔بلکہ اس سے بھی تاریک تر جاہلیت۔یوں نظر آتا ہے کہ ہمارا تمام ماحول جاہلیت کے چنگل میں گرفتار ہے۔ہمارے افکار وعقائد، ہماری عادات واطوار، ہماری ثقافت اور اس کے مآخذ

،ادب اورآرٹ ،مروجہ نظام اورقوانین ان سب میں جاہلیت کی روح سرایت کیے ہوئے ہے۔ یہاں تک کہ جن چیزوں کوغلطی سے اسلامی ثقافت ،اسلامی مآخذ ،اسلامی فلسفہ اوراسلامی فکر سمجھا جاتا ہے وہ سب بھی جاہلیت کی مصنوعات ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اسلامی اقدار ہمارے دلوں میں گھر نہیں کرتیں ،ہمارے اذہان وقلوب اسلام کے پاکیزہ اوراجلے تصور سے منور نہیں ہوتے ،اور ہمارے اندرانسانوں کی ویسی پاکیزہ مثالی تنظیم برپا نہیں ہوتی جسے اسلام نے صدراوّل میں برپا کیا تھا۔

پس ہم پرلازم ہے اوراسلامی تحریک کامخصوص طریقِ کار بھی یہی تقاضا کرتا ہے کہ تحریک کے دورتربیت وتعمیر ہی میں ہم جاہلیت کے ان تمام اثرات وعناصر سے پاک رہیں جن میں ہم رہ بس رہے ہیں بلکہ اخذ واستفادہ تک کررہے ہیں۔ہم پرلازم ہے کہ ابتدا سے ہم اس خالص سرچشمہ ہدایت کی طرف رجوع کریں جس سے اسلام کے پہلے لاثانی معاشرے کے افراد نے فہم دین حاصل کیا تھااور جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ ضمانت دی ہے کہ وہ ہرگونہ اختلاط وآمیزش سے محفوظ ہوگا۔ہمیں کائنات اورحیاتِ انسانی کی حقیقت ،اوران دونوں کے باہمی تعلق ،اور پھران تمام چیزوں کے اور وجودکلی (باری تعالیٰ کے وجود) کے باہمی تعلق کاصحیح تصوراس سرچشمہ سے حاصل کرنا ہوگا۔اوراسی ضمن میں یہ بھی معلوم کرنا ہوگا کہ زندگی کا صحیح تصور کیا ہے؟ہماری قدریں اور اخلاق کس نوعیت کے ہوں؟ ہمارانظامِ حکمرانی کس ڈھب کا ہو؟ ہماری سیاست اوراقتصاد کن اصولوں پر قائم ہو؟ غرضیکہ زندگی کے پر ہر پہلو کے بارے میں اس کتاب ہدایت سے ہمیں رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔ یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ جب ہم ان مسائل کے بارے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اسلام کے چشمۂ صافی (قرآن کریم) کی طرف رجوع کریں تو ''علم برائے عمل'' کے احساس وجذبہ کے ساتھ اسے پڑھیں نہ کہ لطف اندوزی،تسکین ذوق اور بحث وتحقیق کے شوق کی بناپر۔ہم یہ معلوم کرنے کے لیے اس کی طرف رجوع کریں کہ وہ ہم سے کیسا انسان بننے کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ ویسا انسان ہم بن کر دکھائیں،یہ الگ بات ہے کہ مقصدِ حقیقی کے حصول کے دوران ہم پرقرآن کافنی کمال اورادبی حسن بھی

آشکار ہو جائے گا، اس کے حیرت انگیز قصے ہمارا دامنِ دل پکڑیں گے، مناظر قیامت بھی آنکھوں کے سامنے جھلکیں گے، اور اس کے وجدانی منطق کی بھی ہم گلگشت کریں گے۔ الغرض وہ سب لذتیں ضمناً ہمیں حاصل ہوں گی جن کی تلاش جویانِ علم کو ہوتی ہے اور جن کی طلب میں اربابِ ذوق سرگرداں رہتے ہیں۔ بے شک ان سب فوائد ولذائذ سے ہم ہمکنار ہوں گے لیکن یہ چیزیں ہمارے مطالعہ کا اصل مقصد نہ ہوں گی۔ ہمارا مقصد صرف یہ معلوم کرنا ہوگا کہ قرآن ہم سے کس طرح کی عملی زندگی کا مطالبہ کرتا ہے؟ زندگی کے بارے میں وہ اجمالی تصور کیا ہے جس پر ہمیں قرآن قائم کرنا چاہتا ہے؟ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں کس نوعیت کا شعور اور احساس رکھنے کی تلقین کرتا ہے؟ اسے کس قسم کے اخلاق پسند ہیں؟ اور وہ زندگی میں کس ڈھنگ کا قانونی اور دستوری نظام نافذ کرنے کا خواہاں ہے؟

جاہلیت سے مکمل مقاطعہ

ہمارا یہ بھی فرض ہوگا کہ ہم اپنی ذاتی زندگیوں میں جاہلی معاشرے کے شکنجے سے، جاہلی تصورات کی گرفت سے، جاہلی روایات کے دباؤ اور جاہلی لیڈر شپ کے تسلط سے آزادی حاصل کریں۔ ہمارا مشن جاہلی معاشرے کے عمل کے نظام کے ساتھ مصالحت (Compromise) کرنا نہیں ہے، اور نہ ہم اس کے وفادار بن کر رہ سکتے ہیں۔ جاہلی معاشرہ اپنے جاہلی اوصاف وخصائص کی وجہ سے اس قابل نہیں ہے کہ ہمارے اور اس کے درمیان مصالحت کا رویہ قائم ہو سکے۔ لہٰذا ہمارا کام یہ ہونا چاہئیے کہ ہم پہلے اپنے آپ کو بدلیں تاکہ بالآخر معاشرے کو تبدیل کر سکیں۔ ہمارا اولین مقصد معاشرے کے عملی نظام میں انقلاب ہے۔ جاہلی نظام کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنا ہے جو اسلامی نظام زندگی کے ساتھ بنیادی طور پر متصادم ہے، اسلامی تصورات کی ضد ہے، اور جو ہمیں جبر وتشدد کے وسائل کا سہارا لے کر اس نظام کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے سے محروم کر رہا ہے جس کا مطالبہ ہم سے اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔

زندگی کے اس نئے سفر میں ہمارا سب سے پہلا قدم یہ ہوگا کہ ہم جاہلی معاشرے اور اس کے تمام اقدار ونظریات پر غلبہ پانے کی کوشش کریں۔ اور جاہلی معاشرے کے ساتھ سودے بازی کرنے کے لیے ہم اپنی اقدار حیات اور اپنے نظریات میں سر مُو تبدیلی گوارا نہ کریں۔ ایسی باتیں ہمارے حاشیۂ خیال میں نہ آنی چاہئیں۔ ہمارا راستہ الگ ہے اور جاہلیت کا راستہ الگ! اگر ہم ایک قدم بھی جاہلیت کے ساتھ چلے تو نہ صرف اپنے نظامِ حیات کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوڑ بیٹھیں گے بلکہ راہ حق کو بھی گم کر بیٹھیں گے ۔بے شک اس کٹھن اور دشوار گزار راستے میں ہمیں جبر وتشدد کا اور تکالیف ومصائب کا سامنا کرنا ہوگا اور ہمیں بڑی بڑی قربانیاں بھی دینا ہوں گی۔ لیکن اگر ہم اس راہ کے مسافر ہیں جس پر پہلی بے مثال ومنفرد اسلامی جمعیت چل چکی ہے، اگر ہم ان نفوس قدسیہ کے نقش پا پر چلنا چاہتے ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاکیزہ و برتر نظام کو دنیا کے اندر جاری فرمایا اور اسے جاہلیت پر نصرت وغلبہ بخشا تو پھر ہمیں یہ سب کچھ سہنا ہوگا۔ اور ہم اپنی مرضی کے مالک نہیں ہوں گے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ہم ہر وقت اس امر سے باخبر رہیں کہ ہمارے طریق کار کی فطرت ومزاج کیا ہے، ہمارے مؤقف ومسلک کی روح کیا ہے اور اس راستے کے نشیب وفراز کیا ہیں جس پر چل کر ہم جاہلیت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے اسی کامیابی سے نکل جائیں جس کامیابی کے ساتھ صحابہ کرام کی ممتاز ولا ثانی جماعت نکلی تھی۔

باب دوم

قرآن کا طریقِ انقلاب

مکّی دور کا بنیادی مسئلہ

قرآن کریم کا وہ حصہ جو مکی سورتوں پر مشتمل ہے، پورے تین ۱۳ سال تک رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوتا رہا۔اس پوری مدت میں قرآن کا مدارِ بحث صرف ایک مسئلہ رہا۔اس کی نوعیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی ۔مگر اسے پیش کرنے کا انداز برابر بدلتا رہا۔قرآن نے اسے پیش کرنے میں ہر مرتبہ نیا اسلوب اور نیا پیرایہ اختیار کیا،اور ہر مرتبہ یوں محسوس ہوا کہ گویا اسے پہلی بار ہی چھیڑا گیا ہے۔

قرآن کریم پورے مکی دور میں اسی مسئلہ کے حل میں لگا رہا۔اس کی نگاہ میں یہ مسئلہ اس نئے دین کے تمام مسائل اولین کا حامل تھا،عظیم تر مسئلہ تھا،اساسی اور اصولی مسئلہ تھا،عقیدہ کا مسئلہ تھا۔یہ مسئلہ دو عظیم نظریوں پر مشتمل تھا۔ایک اللہ تعالیٰ کی الوہیت،اور انسان کی عبودیت اور دوسرے ان کے باہمی تعلق کی نوعیت۔قرآن کریم اسی بنیادی مسئلہ کو لے کر انسان سے بحیثیتِ ''انسان'' خطاب کرتا رہا۔کیونکہ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اس سے تمام انسانوں کا یکساں تعلق ہے۔وہ چاہے عرب کے رہنے والے انسان ہوں یا غیر عرب،نزول قرآن کے زمانہ کے لوگ ہوں یا کسی بعد کے زمانہ کے۔یہ وہ انسانی مسئلہ ہے جس میں کسی ترمیم وتغیر کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔یہ اس کائنات میں انسان کے وجود و بقا کا مسئلہ ہے۔انسان کی عاقبت کا مسئلہ ہے۔اسی مسئلہ کی بنیاد پر یہ طے ہوگا کہ انسان کا اس کائنات کے اندر کیا مقام ہے؟اور اس کائنات میں بسنے وال دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟اور خود کائنات اور موجودات

کے خالق کے ساتھ اس کا کیا رشتہ ہے؟ یہ وہ پہلو ہے جس کی وجہ سے اس مسئلے میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی ۔اس لیے کہ یہ اس کائنات اور کائنات کے ایک حقیر جز انسان کے ساتھ براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔

مکی زندگی میں قرآن انسان کو یہ بتا رہا ہے کہ اس کے اپنے وجود اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کی اصل حقیقت کیا ہے؟ وہ انسان کو یہ بتاتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کس غرض کے لیے آیا ہے؟ اور آخرکار وہ کہاں جائے گا؟ وہ معدوم تھا اسے کس نے خلعتِ وجود بخشا؟ کون سی ہستی اُس کا خاتمہ کرے گی؟ اور خاتمہ کے بعد اُسے کس انجام سے دوچار ہونا ہوگا؟ وہ انسان کو یہ بھی بتاتا ہے کہ اس وجود کی حقیقت کیا ہے جسے وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے؟ اور وہ کون سی ہستی ہے جسے وہ پردۂ غیب میں کارفرما محسوس کرتا ہے لیکن دیکھ نہیں پاتا؟ اس طلسماتی کائنات کو کس نے وجود بخشا، اور کون اس کا منتظم ومدبر ہے؟ کون اسے گردش دے رہا ہے؟ کون اسے بار بار نیا پیراہن بخشتا ہے؟ کس کے ہاتھ میں ان تغیرات کا سررشتہ ہے جن کا ہر چشمِ بینا مشاہدہ کررہی ہے؟ وہ اسے یہ بھی سکھاتا ہے کہ خالقِ کائنات کے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہونا چاہیئے؟ اور خود کائنات کے بارے میں اسے کیا روش اختیار کرنی چاہیئے؟ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ انسانوں کے باہمی تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔

یہ ہے وہ اصل اور بنیادی مسئلہ جس پر انسان کی بقا اور وجود کا دارومدار ہے۔اور رہتی دنیا تک اسی عظیم مسئلہ پر انسان کی بقا اور وجود کا انحصار رہے گا۔اس اہم مسئلے کی تحقیق وتوضیح میں مکی زندگی کا پورا تیرہ سالہ دور صرف ہوا۔اس لیے کہ انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ یہی ہے، اور اس کے بعد جتنے مسائل ہیں وہ اسی کے تقاضے میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت اس کی تفصیلات اور جزئیات سے زیادہ کچھ نہیں ۔قرآن نے مکی دور میں اسی بنیادی مسئلے کو اپنی دعوت کا مدار بنائے رکھا، اور اس سے صرف نظر کرکے نظامِ حیات سے متعلق فروعی اور ضمنی بحثوں سے تعرض نہیں کیا۔اور اس وقت تک انہیں نہیں چھیڑا جب تک علمِ الٰہی نے یہ فیصلہ نہیں فرمادیا کہ اب اس مسئلہ کی توضیح وتشریح کا حق ادا ہوچکا ہے، اور یہ اس انتخاب روزگار جماعت کے دلوں میں پوری طرح جاگزیں ہوچکا ہے جسے قدرت الٰہی اقامتِ دین کا

ذریعہ بنا کر اس کے ہاتھوں اس دین کو عملی شکل میں برپا کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

جو لوگ دینِ حق کی دعوت لے کر اٹھے ہیں اور وہ دنیا کے اندر ایک ایسا نظام برپا کرنا چاہتے ہیں جو بالفصل اس دین کی نمائندگی کرے انہیں اس عظیم حقیقت پر پہروں غور کرنا چاہیئے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے راسخ کرنے کے لیے قرآن کریم نے مکی زندگی کے پورے ۱۳ سال صرف کیے، اور اس دوران میں کبھی اس توجہ ہٹا کر نظام زندگی کی دوسری تفصیلات کو نہیں چھیڑا، نہ ان قوانین واحکام بیان کرنے کی حاجت محسوس کی جو آگے چل کر مسلم معاشرے میں نافذ ہونے والے تھے۔

کارِرسالت کا آغاز اِسی مسئلہ سے ہوا۔

یہ عین حکمت خداوندی تھی کہ آغاز رسالت ہی میں اس اہم مسئلہ کو جو عقیدہ وایمان کا مسئلہ ہے دعوت کا محور ومرکز بنایا جائے۔ یعنی اللہ کے رسول ﷺ راہ حق میں پہلا قدم ہی اس دعوت سے اٹھائیں کہ ''لوگو! گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے''، اور پھر اسی دعوت پر اپنا تمام وقت صرف کر دیں ، انسانوں کو ان کے حقیقی پروردگار سے آگاہ کریں، اور انہیں صرف اسی کی بندگی کی راہ پر لگائیں۔

اگر ظاہر بین نگاہ ، اور محدود انسانی عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ عرب اس طریقِ دعوت سے با آسانی رام ہونے والے نہیں تھے۔ عرب اپنی زبان دانی کی بدولت ''الٰہ'' کا مفہوم اور ''لاالٰـہ الااللہ'' کا مدعا خوب سمجھتے تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا الوہیت سے مرادِ حاکمیت اعلیٰ ہے۔ وہ اس امر سے بھی کماحقہ آگاہ تھے کہ الوہیت کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص گردانئے کا صاف معنی یہ ہیں کہ اقتدار پورے کا پورا کاہنوں، پروہتوں، قبائل کے سرداروں اور امراء وحکام کے ہاتھ سے چھین کر اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے۔ ضمیر وقلب پر، مذہبی شعائر ومناسک پر، معاملاتِ زندگی پر، مال ودولت اور عدل وقضاء پر، الغرض ارواح واجسام پر بہمہ وجوہ اللہ اور اللہ کا اقتدار ہو۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ''لاالٰـہ الااللہ'' کا اعلان درحقیقت اس دنیاوی اقتدار کا خلاف ایک چیلنج ہے جس نے الوہیت

کی سب سے بڑی خصوصیت (حاکمیت) کوغصب کر رکھا ہے، یہ ان تمام قوانین اور نظاموں کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے جو اس قبضۂ غاصبانہ کی بنیاد پر وضع کیے جاتے ہیں، اور تمام ان قوتوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے جو خانہ ساز شریعتوں کی بدولت دنیا میں کوسِ لمن الملک بجاتی ہیں۔عرب اپنی زبان کے نشیب وفراز سے بخوبی آگاہ تھے اور وہ ''لاالٰہ الااللہ'' کے حقیقی مفہوم کو پوری طرح سمجھ رہے تھے ان سے یہ امر بھی پوشیدہ نہ تھا کہ ان کے خودساختہ نظاموں اور ان کی پیشوائی اور قیادت کے ساتھ یہ دعوت کیا سلوک کرنا چاہتی ہے۔اسی وجہ سے انہوں نے اس دعوت کا یا بالا فاظ دیگر اس پیامِ انقلاب کا اُس تشدد اور غیض وغضب کے ساتھ استقبال کیا، اور اس کے خلاف وہ معرکہ آرائی کی کہ جس سے ہر خاص وعام واقف ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دعوت کا آغاز اس انداز سے کیوں ہوا؟ اور حکمت الٰہی نے کس بنا پر یہ فیصلہ کیا کہ اس دعوت کا افتتاح ہی مصیبتوں اور آزمائشوں سے ہو؟

رسول اللہ ﷺ نے قومیت کے نعرہ سے کیوں نہ کام کا آغاز کیا

رسول اللہ ﷺ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے دینِ حق کو لے کر مبعوث ہوئے تو اس وقت حالت یہ تھی کہ عربوں کے سب سے زیادہ شاداب وزرخیز اور مال دار علاقے عربوں کے ہاتھ میں نہیں تھے بلکہ دوسری اقوام ان پر قابض تھیں۔شمال میں شام کے علاقے رومیوں کے زیرنگیں تھے، جن پر عرب حکام رومیوں کے زیرسایہ حکومت چلا رہے تھے۔جنوب میں یمن کا پورا علاقہ اہل فارس کے قبضہ میں تھا۔جنھوں نے اپنے ماتحت عرب شیوخ کو فرائض حکمرانی سونپ رکھے تھے، عربوں کے پاس صرف حجاز اور تہامہ اور نجد کے علاقے تھے۔یا وہ بے آب وگیا صحرا تھے جن میں اکادکا نخلستان پائے جاتے تھے ۔یہ بات بھی محتاج دلیل نہیں ہے کہ محمد ﷺ اپنی قوم میں صادق اور امین کی حیثیت سے معروف تھے ۔آغازِ رسالت سے ۱۵ سال قبل اشرافِ قریش حجرِ اسود کے تنازعہ میں آپ کو اپنا حکم بنا چکے تھے، اور آپ کے فیصلہ کو بخوشی مان چکے تھے۔نسب کے لحاظ سے بھی آپ بنوہاشم کے چشم وچراغ تھے جو قریش

کا معزز ترین خاندان تھا۔ ان حالات و اسباب کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس بات پر پوری طرح قادر تھے کہ اپنے ہم وطنوں کے اندر عرب قومیت کے جذبہ کو بھڑکاتے، اور اس طرح ان قبائل عرب کو اپنے گرد جمع کر لیتے جنہیں باہمی جھگڑوں نے پارہ پارہ کر رکھا تھا اور کشت و خون اور انتقام در انتقام کی چکی میں بری طرح پسے ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اگر چاہتے تو ان سب عربوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر کے انہیں قومیت کا درس دیتے، اور شمال کے رومی اور جنوب کے ایرانی استعمار کے تسلط سے عرب سرزمین کو آزاد کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے، عرب قومیت اور عربیت کا پرچم بلند کرتے اور جزیرۂ عرب کے تمام اطراف واکناف کو ملا کر متحدہ عرب ریاست کی داغ بیل ڈال دیتے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ قوم پرستی کے نعرہ کو لے کر اٹھتے تو عرب کا بچہ بچہ اس پر لبیک کہتا ہوا لپکتا، اور آپ کو وہ مصائب و آلام نہ سہنے پڑتے جو آپ ﷺ کو ۱۳ سال تک صرف اس بنا پر سہنے پڑے کہ آپ کی دعوت اور نظریہ جزیرۃ العرب کے فرماں رواؤں کی خواہشات سے متصادم تھا۔ مزید برآں یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ جب عرب آپ ﷺ کو قیادت کا منصب سونپ دیتے، اور اقتدار کی ساری کنجیاں پوری طرح آپ ﷺ کے قبضے میں آجاتیں، اور رفعت وعظمت کا تاج آپ ﷺ کے مبارک سر پر رکھ دیا جاتا تو آپ ﷺ نے اپنے اس بے پناہ طاقت اور اثر کو عقیدۂ توحید کا سکہ رواں کرنے کے لیے استعمال کرتے اور لوگوں کو اپنے انسانی اقتدار کے سامنے سرنگوں کرنے کے بعد بالآخر لے جا کر خدا کے آگے سرنگوں کر دیتے۔ لیکن اللہ علیم و حکیم نے اپنے رسول ﷺ کو اس راستے پر نہیں چلایا۔ بلکہ انہیں حکم دیا کہ صاف صاف اعلان کر دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اور ساتھ ہی متنبہ بھی کر دیا کہ اس اعلان کے بعد آپ ﷺ خود اور وہ مٹھی بھر افراد جو اس اعلان پر لبیک کہیں ہر قسم کی تکلیف و اذیت برداشت کرنے کے لیے بھی تیار رہیں۔

قومی نعرے کو اختیار نہ کرنے کی وجہ

آخر یہ کٹھن راستہ اللہ تعالیٰ نے کیوں منتخب فرمایا؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اوران کے اہلِ ایمان ساتھیوں کے حق میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ تشدد اور ظلم کا نشانہ بنیں۔لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ اس دعوت کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔اور نہ ہی یہ کوئی صحیح بات ہوتی کہ مخلوق اللہ رومی یا ایرانی طاغوت کے پنجے سے نجات پا کر عربی طاغوت کے پنجہ میں گرفتار ہو جائے ۔طاغوت خواہ کوئی ہو وہ طاغوت ہی ہے۔یہ ملک اللہ تعالیٰ کا ہے۔اور وہ اس پر صرف اللہ کا ہی اقتدار قائم ہونا چاہیئے ۔اور اللہ کا اقتدار صرف اس صورت میں قائم ہوسکتا ہے کہ اس کی فضاؤں میں صرف ''لاالٰـــہ الااللہ'' کا پرچم لہرائے۔یہ بات کیوں کر مقبول اور درست ہوسکتی تھی کہ اللہ کی زمین پر بسنے والی مخلوق رومی اور ایرانی طاغوتوں سے نجات پاتے ہی عربی طاغوت کا طوقِ غلامی اپنے گلے میں ڈال لے۔طاغوت جس قبا میں بھی ہو وہ طاغوت ہے،انسان صرف اللہ واحد کے بندے اور غلام ہیں۔اور وہ صرف اس صورت میں بندے اور غلام رہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگیوں میں صرف اللہ کی الوہیت کا بول بالا ہو۔ایک عرب''لاالٰـہ الااللہ'' کا لغوی لحاظ سے جومفہوم سمجھتا تھا وہ یہ تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو،اللہ کے سوا کوئی اور ہستی قانون اور شریعت کا منبع و ماخذ نہ ہو،اور انسان کا انسان پر غلبہ واقتدار باقی نہ رہے کیونکہ اقتدار بہمہ وجوہ اللہ ہی کے لیے ہے،اور اسلام انسانوں کے لیے جس ''قومیت'' کا علمبردار ہے وہ اسی عقیدہ کی بنیاد پر طے ہوتی ہے۔تمام اقوام خواہ وہ کسی رنگ ونسل کی ہوں،عربی یا رومی اور ایرانی،سب کی سب اس عقیدہ کی نگاہ میں پرچم الٰہی کے تحت مساویانہ حیثیت رکھتی ہیں۔قرآن کے نزدیک اسلامی دعوت کا یہی صحیح اور فطری طریقِ کار ہے۔

آپ ﷺ نے اقتصادی انقلاب کا طریقِ کار کیوں نہ اختیار کیا۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت عرب معاشرہ دولت کی منصفانہ تقسیم اور عدل وانصاف کے صحت مندانہ نظام سے یکسر بیگانہ ہو چکا تھا۔ایک قلیل گروہ تمام مال ودولت اور تجارت پر قابض تھا۔اور سودی

کاروبار کے ذریعہ اپنی تجارت اور سرمائے کو برابر بڑھاتا اور پھیلاتا چلا جارہا تھا۔اس کے مقابلے میں ملک کی غالب اکثریت مفلوک الحال اور بھوک کا شکار تھی۔جن لوگوں کے ہاتھ میں دولت تھی وہی عزت وشرافت کے اجارہ دار تھے۔رہے بیچارے عوام تو وہ جس طرح مال ودولت سے تہی دامن تھے اسی طرح عزت وشرافت سے بھی بے بہرہ تھے!

اس صورت حال کے پیشِ نظر کہا جاسکتا ہے کہ نبی ﷺ نے کوئی اجتماعی تحریک کیوں نہ اٹھائی اور دعوت کا قصد دولت کی منصفانہ تقسیم ٹھہرا کر امراء وشرفا کے خلاف طبقاتی جنگ کیوں نہ چھیڑ دی تاکہ سرمایہ داروں سے محنت کش عوام کو ان کا حق دلواتے۔یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ اس دور میں ایسی کوئی اجتماعی تحریک اور دعوت لے کر اٹھتے تو عرب معاشرہ لازماً دوطبقوں میں بٹ جاتا،مگر غالب اکثریت آپ ﷺ کی تحریک کا ساتھ دیتی،اور سرمائے اور جاہ وشرف کی ستم کیشیوں کے سامنے ڈٹ جاتی اور آپ ﷺ کے مقابلے میں وہ معمولی سی اقلیت ہی رہ جاتی جو اپنے پشتینی مال وجاہ سے چمٹی رہتی۔اگر رسول اللہ ﷺ یہ نہج اختیار فرماتے تو زیادہ مؤثر اور کارگر ہوتا۔اور یہ صورت حال نہ پیش آتی کہ پورا معاشرہ ''لاالٰہ الااللہ'' کے اعلان کے خلاف صف آراء ہوجائے،اور صرف چند نادرِ روزگار ہستیاں ہی دعوتِ حق کے افق تک پہنچ سکیں۔

کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ میں یہ صلاحیت بدرجہ کمال موجود تھی کہ آپ ﷺ کی تحریک سے وابستہ ہوکر اپنی زمامِ قیادت آپ ﷺ کے ہاتھ میں دے دیتی اور آپ ﷺ دولت مند اقلیت پر قابو پاکر اس کو اپنا مطیع وفرماں بردار بناچکتے تو آپ ﷺ اپنے اس منصب واقتدار کو اور اپنی پوری قوت وطاقت کو اس عقیدہ توحید کے منوانے اور اُسے قائم وراسخ کرنے میں استعمال کرلیتے جس کے لیے دراصل اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا تھا۔آپ ﷺ انسانوں کو پہلے انسانی اقتدار کے آگے جھکا کر پھر انہیں پروردگار حق کے آگے جھکا دیتے۔

ایسا طریق اختیار نہ کرنے کی وجہ

لیکن اللہ علیم وحکیم نے آپ ﷺ کو اس طریقِ کار پر چلنے کی اجازت نہ دی۔ اللہ کو معلوم تھا کہ یہ طریقِ کار دعوت اسلامی کے لیے موزوں ومناسب نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ معاشرے کے اندر حقیقی اجتماعی انصاف کے سوتے صرف ایک ایسے ہمہ گیر نظریہ کے چشمہ صافی سے ہی پھوٹ سکتے ہیں جو معاملات کی زمامِ کار کلیۃً اللہ کے ہاتھ میں دیتا ہو اور معاشرہ ہر اس فیصلے کو برضا ورغبت قبول کرتا ہو جو دولت کی منصفانہ تقسیم اور اجتماعی کفالت کے بارے میں بارگاہ الٰہی سے صادر ہو، اور معاشرے کے ہر فرد کے دل میں، پانے والے کے دل میں بھی اور دینے والے کے دل میں بھی یہ بات پوری طرح منقش ہو کہ وہ جس نظام کو نافذ کر رہا ہے اس کا شارع اللہ تعالیٰ ہے، اور اس نظام کی اطاعت سے اسے نہ صرف دنیا کے اندر فلاح کی امید ہے، بلکہ آخرت میں بھی وہ جزائے خیر پائے گا، معاشرے کی یہ کیفیت نہ ہو کہ کچھ انسانوں کے دل حرص وآز کے جذبات سے امنڈ رہے ہوں، اور کچھ دوسرے انسانوں کے دل حسد وکینہ کی آگ میں جل رہے ہوں۔ معاشرے کے تمام معاملات تلوار اور ڈنڈے کے زور پر طے کیے جا رہے ہیں، تخویف اور دھونس اور تشدد کے بل پر فیصلے نافذ کیے جا رہے ہوں، انسانوں کے دل ویران اور ان کی روحیں دم توڑ رہی ہوں۔ جیسا کہ آج ان نظاموں کے تحت ہو رہا ہے جو غیر اللہ کی الوہیت پر قائم ہیں۔

آپ ﷺ نے اصلاحِ اخلاق کی مہم سے دعوت کا آغاز کیوں نہ کیا؟

رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے وقت جزیرۃ العرب کی اخلاقی سطح ہر پہلو سے انحطاط کے آخری کنارے تک پہنچی ہوئی تھی۔ صرف چند بدویانہ اخلاق خام حالت میں موجود تھے۔

ظلم اور جارحیت نے معاشرے کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جاہلی دور کا نامور شاعر زہیر ابن ابی سلمہ اسی معاشرتی فساد کی طرف اپنے اس شعر میں حکیمانہ انداز سے اشارہ کرتا ہے:

ومن لم يزد عن حوضه بسلاعه

يهدّم ، ومن لا يظلم الناس يظلم

جوہتھیار کی طاقت سے اپنا دفاع نہیں کرے گا تباہ وبرباد ہوگا۔اور جوخود بڑھ کر لوگوں پر ظلم نہیں کرے گا تو وہ خود (بالآخر) ظلم کا شکار ہو جائے گا۔

اسی خرابی کی طرف جاہلی دور کا یہ مشہور مقولہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ:انصر اخاك ظالما او مظلوماً (اپنے بھائی کی مدد کر،خواہ وہ ظلم کر رہا ہو یا اس پر ظلم ہو رہا ہو)

(رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں یہ ٹکڑا وارد ہوا ہے۔مگر آپ ﷺ نے اس میں واضح کر دیا ہے کہ ظالم کی مدد سے مراد اسے ظلم سے روکنا ہے۔مترجم)

شراب خوری اور جوا بازی معاشرتی زندگی کی روایت بن چکے تھے،اوران پر فخر کیا جاتا تھا۔جاہلی دور کی تمام شاعری خمراور قمار کے محور پر گھومتی ہے۔طرفہ ابن العبد کہتا ہے:

فلولا ثلاث هن من عيشة الفتى

وجدك لم احفل متى قام عودى

فمنهن سبقى العاذلات بشربة

كميت ممتى ماتعل بالماء تزبد

ومازال تشرابى الخمور ولذّتى

وبذلى والفاتى طريفى وتالدى

الى ان تحامتنى العشيرة كلها

وافردت افراد البعير المعبّر

''اگر تین چیزیں جو ایک نوجوان کی زندگی کا لازمہ ہیں نہ ہوتیں۔تو مجھے کسی چیز کی پرواہ نہ رہتی بشرطیکہ مجھے تابسدِ رمق غذا ملتی رہتی۔

ان میں سے ایک میرا اپنے رقیبوں سے مے نوشی میں سبقت لے جانا ،اور مَے وہ دوآتشہ جس میں اگر پانی ملایا جائے تو اس پر کف آ جائے۔

شراب نوشی، لذت پرستی، اور بذل واسراف پہلے بھی میری گھٹی میں پڑے ہوئے تھے اور آج بھی ہیں۔

آخر وہ ان دن آ گیا کہ میرا پورا قبیلہ مجھ سے دور ہٹ گیا اور مجھے الگ تھلگ کر دیا گیا ،جیسے خارش زدہ اونٹ کو گلّے سے الگ کر دیتے ہیں۔

زنا کاری مختلف شکلوں میں رائج تھی۔اور اس جاہلی معاشرے کی قابل فخر روایت بن چکی تھی۔ یہ ایک ایسا حمام ہے جس میں ہر دور کا جاہلی معاشرہ ننگا نظر آتا ہے خواہ وہ دورِ قدیم کا جاہلی معاشرہ ہو یا عہد حاضر کا (نام نہاد مہذب معاشرہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جاہلی معاشرے کی حالت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''جاہلیت میں نکاح کی چار صورتیں تھیں :ایک تو وہ صورت تھی جو آج لوگوں میں جاری ہے۔یعنی ایک آدمی دوسرے شخص کو اس کی بیٹی یا اس کی تولیت میں رہنے والی دوشیزہ کے لیے پیغام نکاح دیتا۔اور اس کا مہر ادا کر کے اس سے نکاح کر لیتا۔نکاح کی دوسری صورت یہ تھی کہ مرد اپنی بیوی سے، جب کہ وہ حیض سے پاک ہو چکی ہوتی ،کہتا کہ فلاں شخص کو بُلا ،اور اس سے پیٹ رکھوا۔ چنانچہ وہ خود اس سے الگ رہتا، اور اس وقت تک اُسے نہ چھوتا جب تک اس آدمی کے حمل کے آثار ظاہر نہ ہو جاتے ۔آثار ظاہر ہو جانے کے بعد خاوند چاہتا تو اس سے ہمبستری کر لیتا۔وہ یہ طریقہ اس لیے اختیار کرتا تا کہ اسے اچھے نسب کا لڑکا ملے۔نکاح کی اس شکل کو استبضاع کہا جاتا تھا۔نکاح کی ایک تیسری صورت بھی تھی۔مردوں کی ایک ٹولی جو دس سے کم ہوتی جمع ہو جاتی اور مل کر ایک عورت کے پاس جاتی، اور اس سے مقاربت کرتی۔ جب اسے

حمل ٹھہر جاتا تو بچے کی ولادت پر چند راتیں گزر جانے کے بعد وہ ان سب کو بلا بھیجتی ۔اس طرح بُلا وا ملنے پر کوئی شخص جانے سے انکار نہ کرسکتا تھا۔ جب وہ اس کے پاس جمع ہوجاتے ،تو وہ عورت اُن سے کہتی :تمہیں اپنی کاروائی کا نتیجہ تو معلوم ہو ہی چکا ہے۔ میں نے ایک بچہ جنا ہے۔ پھر وہ ان سے ایک کی طرف اشارہ کرکے کہتی کہ یہ تیرا بیٹا ہے۔اس پر بچے کا نام اُس شخص کے نام پر رکھ دیا جاتا ،اور لڑکا اس کی طرف منسوب ہوجاتا۔اور وہ اس نسبت سے انکار نہ کرسکتا تھا۔نکاح کی چوتھی قسم یہ تھی کہ بہت سے لوگ جمع ہوجاتے ،اور مل کر ایک عورت کے پاس جاتے ۔جس کے پاس جانے میں کسی کو کوئی رکاوٹ نہ ہوتی تھی ۔دراصل یہ پیشہ ور فاحشہ عورتیں ہوتی تھیں ،اور علامت کے طور پر اپنے دروازوں پر جھنڈے نصب کرلیتیں ۔جو شخص بھی اپنی حاجت پوری کرنا چاہتا ان کے پاس چلا جاتا۔ایسی عورتوں میں سے اگر کسی کو حمل ٹھہر جاتا تو وضع حمل کے بعد سارے لوگ اس کے پاس اکٹھے ہوجاتے ،اور ایک قیافہ شناس کو بلا لیتے۔وہ ان میں سے جس کی طرف اُس لڑکے کو منسوب کرتا وہ لڑکا اس شخص کا قرار پاتا ،اور وہ اس سے انکار نہ کرسکتا تھا۔'' (بخاری کتاب النکاح)

سوال کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ چاہتے تو ایک اصلاحی تنظیم کا قیام کا اعلان کرکے اس کے ذریعہ اصلاحِ اخلاق ،تزکیۂ نفوس اور تطہیر معاشرہ کا کام شروع کردیتے۔ کیونکہ جس طرح ہر مصلحِ اخلاق کو اپنے ماحول کے اندر چند پاکیزہ اور سلیم الفطرت نفوس ملتے رہے ہیں ،اسی طرح آپ کو بھی ایک ایسا پاک سرشت گروہ بالیقین دستیاب ہوجاتا جو اپنے ہم جنسوں کے اخلاقی انحطاط اور زوال پر دلی دکھ محسوس کرتا۔ یہ گروہ اپنی سلامتی فطرت اور نفاستِ طبع کے پیشِ نظر آپ ﷺ کی دعوت تطہیر واصلاح پر لازماً لبیک کہتا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ اس کام کا بیڑا اٹھاتے تو بڑی آسانی سے اچھے انسانوں کی ایک جماعت کی تنظیم میں کامیاب ہوجاتے ۔ یہ جماعت اپنی اخلاقی طہارت اور روحانی

پاکیزگی کی وجہ سے دوسرے انسانوں سے بڑھ کر عقیدۂ توحید کو قبول کرنے اور اس کی گرانبار ذمہ داریوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہوتی ۔اور اس حکیمانہ آغاز سے آپ ﷺ کی یہ دعوت کہ الوہیت صرف اللہ کے مخصوص ہے، پہلے ہی مرحلہ میں تند و تیز مخالفت سے دوچار نہ ہوتی۔

اس طریقہ میں کیا کمزوری تھی؟

لیکن اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ راستہ بھی منزل مقصود کو نہیں جاتا۔اُسے معلوم تھا کہ اخلاق کی تعمیر صرف عقیدہ کی بنیاد پر ہی ہوسکتی ہے۔ایک ایسا عقیدہ جو ایک طرف اخلاقی اقدار اور معیار ردّ وقبول فراہم کرے،اور دوسری طرف اُس ''طاقت'' (Energy) کا تعین بھی کرے جس سے یہ اقدار و معیار ماخوذ ہوں ،اور انہیں سند کا درجہ حاصل ہو۔اور اس جزا وسزا کی نشاندہی بھی کرے جو ان اقدار ومعیارات کی پابندی یا ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اُسی ''طاقت'' کی طرف سے دی جائے گی ۔دلوں پر اس نوعیت کے عقیدہ کی ترمیم اور بالاتر قوت کے تصور کے بغیر اقدار ومعیارات خواہ کتنے ہی بلند پایہ ہوں مسلسل تغیّر کا نشانہ بنے رہیں گے،اور ان کی بنیاد پر جو بھی اخلاقی نظام قائم ہوگا وہ ڈانواں ڈول رہے گا۔اس کے پاس کوئی ضابطہ نہ ہوگا،کوئی نگران اور مُحتسِب طاقت نہ ہوگی ، کیونکہ دل جزا وسزا کے کسی لالچ یا خوف سے بالکل خالی ہوں گے۔

ہمہ گیر انقلاب

صبر آزما کوششوں سے جب عقیدۂ الوہیت دلوں میں راسخ ہوگیا،اور اس ''طاقت'' کا تصور بھی دلوں میں اتر گیا جس سے اس عقیدہ کو سند حاصل ہوتی تھی۔دوسرے لفظوں میں جب انسانوں نے اپنے رب کو پہچان لیا اور صرف اُسی کی بندگی کرنے لگے،جب انسان خواہشاتِ نفس کی غلامی سے،اور اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی آقائی سے آزاد ہوگئے،اور ''لاالٰہ الااللہ '' کا نقش دلوں میں پوری طرح مرتسم ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے اس عقیدہ اور اس عقیدہ کے ماننے والوں کے ذریعہ وہ سب کچھ فراہم

کردیا جو وہ تجویز کر سکتے تھے۔اللہ کی زمین رومی اور ایرانی سامراج سے پاک ہوگئی لیکن اس تطہیر کا مدعا یہ نہیں تھا کہ اب زمین پر عربوں کا سکہ رواں ہو بلکہ اس لیے کہ اللہ کا بول بالا ہو، چنانچہ زمین اللہ کے سب باغیوں سے،خواہ وہ رومی تھے یا ایرانی اور عربی، پاک کردی گئی۔

نیا اسلامی معاشرہ اجتماعی ظلم اور لوٹ کھسوٹ سے بالکل پاک تھا۔یہ اسلامی نظام تھا اوراس میں عدل الٰہی پوری طرح جلوہ گر تھا۔یہاں صرف میزان الٰہی میں ہر خوب وزشت اور صحیح وغلط کوتولا جاتا تھا۔اس عدل اجتماعی کی بنیاد توحید تھی ،اوراس کا اصطلاحی نام ''اسلام'' تھا۔اس کے ساتھ کسی اور نام یا اصطلاح کا اضافہ کبھی گوارا نہیں کیا گیا۔اس پر صرف یہ عبارت کندہ تھی:''لاالٰه الااللّٰه''

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے!

نفوس اور اخلاق میں نکھار آ گیا۔قلوب وارواح کا تزکیہ ہوگیا۔اور یہ اصلاح اس انداز سے ہوئی کہ چند مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر ان حدود وتعزیرات کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئی جن کو اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا تھا۔اس لیے کہ اب ضمیروں کے اندر پولیس کی چوکیاں قائم ہوگئیں۔اب اللہ کی خوشنودی کی طلب ،اجر کی خواہش ،اللہ کے غضب اور عذاب کا خوف محتسب کا فرض انجام دے رہا تھا۔الغرض انسانی نظام،انسانی اخلاق اور انسانی زندگی کمال کی اس بلندی تک پہنچ گئی جس تک نہ پہلے پہنچی تھی ،اور نہ صدرِ اوّل کے بعد آج تک پہنچ سکی ہے۔

یہ انقلاب عظیم کیسے برپا ہوا؟

یہ انقلاب عظیم اور کمالِ انسانیت صرف اس بنا پر حاصل ہوا کہ جن لوگوں نے دین حق کو ایک ریاست ،ایک نظام ،اور جامع قانون وشریعت کی شکل میں قائم کیا تھا وہ خود پہلے اسے اپنے قلب وضمیر اور اپنی زندگی پر قائم کر چکے تھے۔اسے عقیدہ وفکر کے طور پر تسلیم کر چکے تھے ،اپنے اخلاق کو اس سے آراستہ وپیراستہ کر چکے تھے۔اپنی عبادت میں اسے سند دے چکے تھے اور اپنے معاملات میں اس کا سِکہ رواں

کر چکے تھے۔اس دین کے قیام پر ان سے صرف ایک ہی وعدہ کیا گیا تھا۔اس وعدہ میں غلبہ واقتدار عطا کر دینے کا کوئی جز شامل نہیں تھا۔حتٰی کہ یہ جز بھی شامل نہ تھا کہ یہ دین لازماً انہی کے ہاتھوں غالب ہوگا۔ان سے جو کچھ کہا گیا وہ صرف اتنا تھا کہ اقامتِ دین کے عوض انہیں جنت ملے گی۔جوصبر آزما جہاد ان لوگوں نے کیا، جو زہرہ گداز آزمائشیں انہوں نے سہیں، جس پامردی واستقامت کے ساتھ وہ راہِ دعوت پر رواں دواں رہے، اور پھر بالآخر جس طرح انہوں نے جاہلیت کے مقابلے میں اس حقیقت کُبریٰ کا ساتھ دیا جو ''لاالٰــہ الااللہ'' کے اندر پنہاں ہے اور جو ہر زمان ومکان کے فرماں رواؤں کے لیے ناگوار رہی ہے۔ان سب خدمات کے عوض اُن سے صرف ایک وعدہ کیا گیا جس کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔یعنی فقط وعدۂ فردا!

جب اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمائش کی بھٹی میں ڈالا اور وہ ثابت قدم رہے اور ہر نفسانی خواہش اور حظ سے دستبردار ہوگئے، اور جب اللہ تعالیٰ نے جان لیا کہ وہ اس دنیا کے اندر اب کسی طور پر جزا اور صلہ کے منتظر نہیں ہے۔نہ ہی انہیں اس کا انتظار ہے کہ یہ دعوت لازماً انہی کے ہاتھوں غلبہ حاصل کرے، اور یہ دین انہی کی قربانیوں اور کوششوں سے بالاتر ہو۔ان کے دلوں میں نہ آباءواجداد کا تفاخر باقی رہا، نہ قومی گھمنڈ کے جراثیم، نہ وطن وملک کی بڑائی کا جذبہ رہا اور نہ قبائلی اور نسبی عصبیتوں کی خوبو رہی۔پس جب اللہ تعالیٰ نے انہیں ان خوبیوں سے آراستہ دیکھا تب جا کر ان کے حق میں یہ فیصلہ دیا کہ یہ لوگ اب ''امانت عظمٰی'' (یعنی خلافت ارضی) کے بار کو اٹھا سکتے ہیں ۔یہ اس عقیدے میں کھرے ہیں جس کا تقاضا ہے کہ ہر طرح کی حاکمیت صرف اللہ واحد کے لیے مخصوص ہو، دل وضمیر پر، اخلاق وعبادات پر، جان ومال پر، اور حالات وظروف پر صرف اسی کی حاکمیت ہو۔اللہ کو معلوم تھا کہ یہ اس سیاسی اقتدار کے سچے محافظ ثابت ہوں گے جو ان کے ہاتھوں میں اس غرض کے لیے دیا جائے گا تاکہ شریعتِ الٰہی کو نافذ کریں اور عدل الٰہی کو قائم کریں ۔مگر اس قتدار سے ان کی اپنی ذات کے لیے یا اپنے قبیلے اور برادری کے لیے یا اپنی قوم کے لیے کوئی حصہ نہ ہو۔بلکہ وہ سراسر اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہو، اور اللہ

کے دین اوراس کی شریعت کی خدمت کے لیے ہو۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس اقتدار کا منبع صرف اللہ تعالیٰ ہے اوراسی نے ان کی تحویل میں دیا ہے۔

نظام حق کی کامیابی کا واحد راستہ

اگر دعوت اسلامی کا قافلہ اس انداز سے روانۂ سفر نہ ہوتا، اور دوسرے تمام جھنڈوں کو پھینک کر صرف اسی جھنڈے یعنی لاالٰہ الااللہ کے پرچم توحید کو بلند نہ کرتا، اوراس راہ کو اختیار نہ کرتا جو ظاہر میں دشوار گزار اور جان گُسل راہ تھی مگر حقیقت میں آسان اور برکت بداماں تھی تو اس مبارک اور پاکیزہ نظام کا کوئی جز بھی اتنے بلند معیار کے ساتھ ہرگز بروئے عمل نہ آ سکتا تھا۔ اسی طرح اگر یہ دعوت اپنے ابتدائی مراحل میں قومی نعرہ بن کر سامنے آتی، یا اقتصادی تحریک کے لبادہ میں ظاہر ہوتی، یا اصلاحی مہم کا کا قالب اختیار کرتی یا ''لاالٰـــہ الااللہ '' کے ساتھ کچھ دوسرے شعاراورنعرے بھی شامل کر لیتی تو یہ پاکیزہ ومبارک نظام جواس دعوت کے نتیجے میں قائم ہوا کبھی خالص ربّانی نظام بن کر جلوہ گر نہ ہوسکتا۔

قرآن حکیم کا مکی دوراسی شان وشوکت کا حامل ہے۔ یہ دور قلوب واذہان پر اللہ کی الوہیت کا نقش ثبت کرتا ہے، انقلاب کے فطری راستے کی تعلیم دیتا ہے خواہ اس میں بظاہر کتنی ہی دشواریوں اور صعوبتوں کا سامنا ہو۔ اور دوسری '' پگڈنڈیوں'' پر جانے سے منع کرتا ہے خواہ وہ عارضی طور پر انہیں اختیار کرنے کا ارادہ ہو، وہ ہرحال میں صرف فطری راستے پر گامزن رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

ابتدائے دعوت میں جزوی مسائل کو کیوں نہ چھیڑا گیا

اسی طرح قران حکیم کا یہ پہلو بھی داعیانِ حق کے لیے قابل غور ہے کہ اس نے مکی زندگی میں صرف عقیدہ ہی پر اپنی ساری بحث کو مرکوز رکھا، اور نظامِ زندگی کی ان تفصیلات کو نہیں چھیڑا جواس عقیدے کے تقاضے میں مرتب ہوتی ہیں، اور نہ ان قوانین واحکام سے بحث کی جواس عقیدے کی روشنی میں معاملاتِ زندگی کی تنظیم کرتے ہیں۔

دراصل اس دین کا جومزاج ہے اُس کا تقاضا تھا کہ قرآن مکی زندگی میں صرف عقیدہ کے مسئلہ تک اپنی دعوت محدود رکھتا۔ظاہر ہے کہ پورا دین وحدتِ الٰہ کے نظریہ پر قائم ہے ۔اس کا پورا نظام قانون اور نظام معاشرت اسی بنیادی نظریئے سے ماخوذ ہے۔اس دین کی مثال اس بلند و بالا اور تناور درخت کی سی ہے جس کا سایہ گھنا اور دُور دُور تک پھیلا ہوا ہو،جس کی شاخیں باہم دگر پیوست اور آسمان سے باتیں کرتی ہوں۔ایسا درخت قدرتی طور پر اپنی ضخامت اور پھیلاؤ کے مطابق اپنی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں اتارتا ہے،اور انہیں دُور دُور حصوں تک پھیلاتا ہے۔بعینہٖ یہی اس دین کا حال ہے۔اس کا نظام زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہے،انسانیت کے ہر چھوٹے اور بڑے معاملے سے بحث کرتا ہے،انسانی زندگی کی تنظیم صرف دنیا کے اندر ہی نہیں بلکہ آخرت میں بھی کرتا ہے،عالمِ شہود ہی کے نہیں عالمِ غیب کے مسائل بھی حل کرتا ہے اور صرف ظاہری اور مادّی معاملات میں ہی دخل نہیں دیتا بلکہ ضمیر کی بے پایاں گہرائیوں،اور دلوں کے مخفی ارادوں،اور نیتوں کے غیر مرئی تموج سے بھی تعرض کرتا ہے اور انہیں درست کرتا ہے۔یہ دین ایک قوی ہیکل،وسیع الاطراف اور فلک پیما عمارت ہے۔ظاہر ہے کہ اس کی بنیادوں کا پھیلاؤ اور گہرائی بھی اسی وسعت،اور ضخامت کے مطابق ہونی چاہیئے۔

دین کی حقیقت اور اس کے مزاج یہی پہلو خود دین کی تعمیر و توسیع کے بارے میں اس کے مخصوص طریقِ کار کی نشان دہی کرتا ہے۔یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ دلوں کے اندر پہلے عقیدہ کی داغ بیل ڈالنا،اور پھر اسے اچھی طرح مستحکم و راسخ کرنا یہاں تک کہ یہ عقیدہ روح انسان کے کونے کونے میں سرایت کر جائے اور اسے پوری طرح اپنے احاطے میں لے کے صحیح نشو و نما کے لیے ناگزیر ضرورت ہے۔اسی طریقہ سے دین کے تناور درخت کے اس حصے کے درمیان جو فضاؤں میں موجود ہے اور اس حصے کے درمیان جو جڑوں کی شکل و صورت میں موجود ہے اور اس حصے کے درمیان جو جڑوں کی شکل و صورت میں زمین کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے،ناگزیر ہم آہنگی پیدا کرتا ہے،بلکہ ان جڑوں کو قوت بھی بخشتا ہے جو ظاہری حصہ کا بوجھ برداشت کرنے کے لیے ضروری ہے۔

جب ’’لاالٰــــہ الااللہ ‘‘ کاعقیدہ دل کی گہرائیوں میں گھر کرلیتا ہے،تواس کے ساتھ ہی وہ پورانظام زندگی بھی سرایت کرجاتا ہے جواس عقیدہ کی عملی تفسیر ہے۔جس سے یہ بات خودبخود متعین ہوجاتی ہے ،کہ یہی وہ واحد نظام ہے جس اس عقیدہ کے حامل نفوس راضی ہوسکتے ہیں۔اور بیشتر اس کے کہ اس نظام کی تفصیلات اس کے سانے پیش کی جائیں، اور اس کے قوانین واحکام سے انہیں آ گاہ کیا جائے ،وہ پہلے ہی اصولی طور پراس نظام کے آگے سرافگندہ ہوچکے ہوتے ہیں۔ایمان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ پہلاقدم ہی بے چون وچرااطاعت ،اورغیرمشروط تسلیم کے جذبہ سے اٹھے۔چنانچہ مکی دور کے بعد جب مدینہ کا دورآیا تو ان نفوس قدسیہ نے ایسے ہی جذبۂ تسلیم اورشوق سرافندگی کے ساتھ ان تمام قوانین اوراصلاحات کا استقبال کیا جوقرآن نے وقتاً فوقتاً ان کے سامنے پیش کیں۔جوں ہی کوئی حکم جاری ہواسر جھک گئے اورکسی زبان پرکوئی کلمۂ اعتراض نہ آیا،ادھرفرمان کانوں میں پڑااور اِدھراسے عملی جامہ پہنادیا گیا۔کہیں لیت ولعل کوراہ نہ ملی۔شراب حرام قراردی گئی ،سود کی حرمت نازل ہوئی ،جوئے بازی ممنوع قرار پائی ،الغرض جاہلی دور کے تمام رسم ورواج پامال ہوگئے۔مگرکس طرح ؟صرف قرآن کی چندآیات کے ذریعہ یارسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے مجرد چندکلمات کے صدورسے ۔اس کے مقابلے میں دنیاوی حکومتوں کودیکھیے ،وہ ان میں سے ہرہر چیزکوختم کرنے کے لیے قانون کاسہارالیتی ہیں،قانون سازی کرتی ہیں،اورانتظامی ادارے حرکت میں آتے ہیں،فوج اور پولیس کواستعمال کیاجاتا ہے،اختیارات کے ترکش خالی کیے جاتے ہیں،پروپیگنڈااور پریس کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں مگراس سب کچھ کے باوجود وہ علانیہ خلاف ورزیوں پرگرفت سے زیادہ کچھ نہیں کرپاتیں۔اورمعاشرہ منکرات اورمحرمات سے جُوں کا تُوں لبریز رہتا ہے(اسلام میں شراب کیسے حرام کی گئی اس پر مفصل بحث ’’فی ظلال القرآن‘‘ کی پانچویں جلدص ۸۷تا۸۵ ملاحظہ ہو۔اورشراب کی بندش میں امریکہ کس طرح بےبس نکلا،اس کی تفصیل مولاناابوالحسن علی ندوی کی کتاب:مــا ذا اخسـر عــالـم الاسـلامی بانحطاط المسلمین میں دیکھیے جوانھوں نے مولاناابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب

''تنقیحات''، مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ کے حوالے سے نقل کی ہے)۔

عملی اور حقیقت پسندی

دین کے مزاج کا ایک اور پہلو بھی، جس کی جھلک اس کے پاکیزہ نظام میں ملتی ہے قابلِ غور ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ دین ایک ٹھوس اور عملی تحریک کا لائحہ عمل ہے۔ انسانی زندگی پر عملاً حکمرانی کرنے کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ وہ عملی حالات کا سامنا کرتا ہے، تاکہ ان کے بارے میں اپنا رویہ متعین کرے، انہیں برقرار رکھے، یا ان میں ترمیم کرے، یا انہیں کلیۃً بدل دے، لہٰذا اس کی تمام تر قانون سازی صرف ان حالات کے لیے ہوتی ہے جو بالفعل موجود ہوتے ہیں، اور اس معاشرے میں پائے جاتے ہیں جو اصولی طور پر اللہ واحد کی حاکمیت کو تسلیم کر چکا ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ دین کسی ''نظری فلسفے'' کا نام نہیں ہے، جو محض ''مفروضات'' پر اپنا ڈھانچہ استوار کرتا ہو۔ بلکہ یہ ایک ''عملی نظام'' ہے جو عمل اور حرکت کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے یہ ناگزیر ہے کہ پہلے وہ مسلم معاشرہ وجود میں آئے جو عقیدہ الوہیت کا اقرار کرتا ہو، اور یہ عہد کرتا ہو کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ غیر اللہ کی حاکمیت کی وہ صاف صاف نفی کرتا ہو، اور ہر اس قانون کے جواز کو چیلنج کرتا ہو جو عقیدۂ الوہیت پر مبنی نہ ہو۔ اس نوع کا معاشرہ جب وجود میں آجاتا ہے، اور اسے بالفعل مختلف عملی مسائل سے سابقہ پیش آتا ہے، اور اسے ایک نظام اور قانون کی ضرورت لاحق ہوتی ہے تو اس وقت یہ دین احکام وقوانین کی تدوین اور نظام وضوابط کی تشکیل کا آغاز کرتا ہے۔ اور اپنے پیش نظر وہ لوگ رکھتا ہے جو اصولی طور پر شروع ہی سے اس کے ہر قانون اور ضابطے کو مان چکے ہوتے ہیں اور دوسرے تمام ضوابط اور قوانین کو اصولاً ٹھکرا چکے ہوتے ہیں۔

اسے نافذ کرنے کے لیے طاقت کی ضرورت ہے

اس عقیدہ کے ماننے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ خودمختار ہوں اور انہیں معاشرے میں اقتدار وغلبہ

حاصل ہو،جس کے بل بوتے پر وہ معاشرے کے اندر اس نظام کو،اور اس کے جملہ احکام کو جاری وساری کرسکیں۔تاکہ یہ نظام اپنی پوری ہیبت وشکوہ کےساتھ جلوہ گر ہو،اور اس کے احکام صحیح طور پر بآور ہوسکیں۔علاوہ ازیں معاشرے کو جب روزمرہ کے عملی مسائل سے واسطہ پڑے گا تو ان سے نبٹنے کے لیے بھی احکام وقوانین کی ضرورت محسوس ہوگی،اس ضرورت اور تقاضے پورا کرنے کے لیے سیاسی قوت ناگزیر ہے۔

مکی زندگی میں مسلمان خودمختار نہ تھے،اور اپنے معاشرے میں بھی انہیں کوئی اقتدار حاصل نہ تھا۔ان کی عملی زندگی نے ابھی مستقل اور جداگانہ شکل بھی اختیار نہیں کی تھی کہ اسے وہ شریعتِ الٰہی کے تحت منظّم کرتے ۔چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس دور میں ان کے لیے کوئی انتظامی ضابطے اورعمومی قوانین نازل نہیں ہوئے۔اس دور میں انہیں بارگاہ اللہ سے جو کچھ عطا ہوا وہ عقیدہ اورصرف عقیدہ تھا ،یا اس کے رگ وپے میں اترنے کے بعد اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اخلاق عالیہ تھے۔لیکن جب مدنی زندگی میں ان کی ایک خودمختار ریاست وجود میں آ گئی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر زندگی کے عام ضوابط واحکام کا نزول بھی شروع ہوگیا،اوران کے وہ نظام منصۂ شہود پرآ گیا جو مسلم معاشرے کی عملی ضروریات کو بخوبی پورا کرتا تھا ،ریاست کی طاقت اس کی پشت پناہ اور قوت نافذہ (Sanction) تھی۔

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں پسند فرمایا کہ تمام ضوابط وقوانین مکہ کے اندر ہی نازل کردیئے جاتے،تاکہ مسلمان ''تیار حالت'' میں ان کا ذخیرہ کرکے رکھ لیتے،اور مدینہ میں منتقل ہونے بعد جوں ہی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آتا،انہیں فی الفور نافذ کردیا جاتا۔یہ طریق کارمزاج دین کے منافی ہے۔یہ دین اِس طرح کی احتیاطی تدابیر سے کہیں زیادہ عملی اور کہیں زیادہ دوراندیش ہے۔اس کا یہ طریقہ نہیں کہ فرضی مسائل کے لیے فرضی حل تلاش کرنے میں وقت ضائع کرے۔بلکہ وہ تمام قائم شدہ صورتِ احوال کا جائزہ لیتا ہے۔اور اگر یہ دیکھتا ہے کہ فی الواقع ایک ایسا زندہ اور توانا معاشرہ موجود ہے۔ہر اپنے قالب

وشکل کے اعتبار سے۔اور اپنے حالات ومسائل کے لحاظ سے مسلم معاشرہ ہے،شریعتِ الٰہی کے سامنے سرنگوں ہو چکا ہے اور غیر الٰہی شرائع سے بے زار ہے۔تو ایسی صورت میں بے شک یہ دین اس معاشرے کے حالات وضروریات کے مطابق قوانین وضع کر کے ان کے نفاذ کا مطالبہ کرتا ہے۔

اِسلامی قانون کی پیشگی تشکیل لا حاصل ہے

جو لوگ آج اسلام سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ پہلے وہ اپنے نظریات مدون کرے،اپنے نظام کا ڈھانچہ تیار کرے،اپنے قوانین حیات کا دفتر تیار کرے حالانکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ روئے زمین پر کہیں ایسا معاشرہ نظر نہیں آتا جس نے دوسرے تمام انسانی قوانین کو مسترد کر کے بالفعل شریعت الٰہی کے ہاتھ میں اپنی اپنی زمامِ حکومت دے رکھی ہو،اور اسے وہ اختیارات بھی حاصل ہوں،جن کے بل بوتے پر اس کے قوانین کو نافذ کیا جا سکے،تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام سے اس قسم کا مطالبہ کرنے والے درحقیقت اس دین کے مزاج سے نا آشنا ہیں۔انہیں اس بات کا علم بھی نہیں ہے کہ دین کی عملی تنفیذ سے اللہ تعالیٰ کی منشا کیا ہے؟ درحقیقت ایسا مطالبہ کرنے والے حضرات کی اصل خواہش یہ ہے کہ یہ دین اپنی فطرت سے منحرف ہو جائے،اپنا طریقہ کار تج دے،اپنی تاریخ بدل ڈلے،اور عام انسانی نظریات اور انسانی شریعتوں کی سطح پر اتر آئے۔ان کی کوشش یہ ہے کہ یہ اپنی فطری شاہراہ اور فطری مراحل کو نظر انداز کر کے کوئی مختصر راستہ اختیار کر لے،تا کہ ان کی فوری اور عارضی خواہشات کی تسکین ہو سکے۔اور خواہشات بھی وہ جن کی پیدائش کا سبب وہ نفسیاتی شکست ہے جو گھٹیا اور بے بضاعت انسانی قوانین کے مقابلے میں ان پر طاری ہو چکی ہے۔بایں ہمہ وہ چاہتے ہیں کہ یہ دین بھی مجرد نظریات اور مفروضات کا مجموعہ بن کر رہ جائے جن کا موضوع بحث ایسے حالات ووقائع ہوں جن کا عملی وجود عنقا ہو۔مگر اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ یہ دین اسی طرح نافذ ہو جس طرح پہلے نافذ ہوا تھا۔پہلے اسے بطور عقیدہ تسلیم کیا جائے جو دل ودماغ کی گہرائیوں میں اترے اور قلب وضمیر پر اپنی سلطانی قائم کرے

۔پھر اس عقیدہ کے تقاضے پورے کیے جائیں۔اس کا اولین تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ کے سوا کسی کے سامنے نہ جھکیں۔اللہ کے ماسوا کسی ہستی سے قوانین حیات اخذ نہ کریں۔جب اس عقیدہ کی حامل ایک جماعت تیار ہو جائے،اور معاشرے پر اسے غلبہ نصیب ہو جائے تو اس عقیدے کی روشنی میں ایسے تمام قوانین بنتے رہیں گے جو اس جماعت یا معاشرے کی عملی ضروریات کو پورا کریں،اور اس کی عملی زندگی کی تنظیم کریں۔یہ ہے اس دین کے قیام کا صحیح طریقہ جو اللہ کو پسند ہے۔اللہ کے پسندیدہ طریقہ کے علاوہ کوئی اور طریقہ ہرگز قابل قبول نہیں ہوسکتا،خواہ وہ لوگ کتنی خواہشیں کریں اور کتنے مطالبات پیش کریں۔

اقامتِ دین کا صحیح طریقہ

اس بنا پر دعوتِ اسلامی کے علمبرداروں کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ جب لوگوں کو دین کے احیاء اور تجدید کی دعوت دیں تو ان سے پہلا مطالبہ یہ کریں کہ وہ اسلام کے بنیادی عقیدے کا اقرار کریں۔وہ لوگ چاہے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوں،انہوں نے مسلمانوں کے سے نام رکھ رکھے ہوں،ان کے پیدائش کے سرٹیفیکیٹ بھی ان کے مسلمان ہونے کی شہادت دیتے ہوں۔بہر حال دعوتِ اسلامی کے علمبردار پہلے ان مسلمانوں کو یہ سمجھائیں کہ ''اسلام'' جس حقیقت کا نام ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے عقیدہ لاالٰــــہ الاالله کو اس کے حقیقی مفہوم کے ساتھ تسلیم کیا جائے۔اس کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ہر معاملہ صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت میں دیں،اور جو لوگ اللہ کی حاکمیت سے بغاوت کر کے اپنی ذات کے لیے اس حاکمیت کا دعوٰی کریں ان کے اس دعوے کی تردید کریں۔عقیدۂ اسلام کو اس کے اس مفہوم کے ساتھ ماننے کے بعد یہ لازم آتا ہے کہ یہ عقیدہ ماننے والے کے دلوں اور دماغوں میں اچھی طرح رچ بس جائے،ان کی عبادات پر اسی کی چھاپ ہو اور ان کی زندگی کا ہر ہر گوشہ اسی کے نور سے فروزاں ہو۔

لوگوں کے اندر جب بھی دعوتِ دین کی تحریک برپا ہو اس کی نگاہ میں اس پہلو کو اساسی اہمیت حاصل ہونی چاہیئے ۔خود دنیا کی پہلی اسلامی تحریک نے اسی کو دعوت کی اساس قرار دیا تھا۔قرآن کریم کا مکی حصہ پورے ۱۳سال تک اس پہلو کو قائم اور مستحکم کرنے میں لگا رہا۔یہی وجہ ہے کہ جب انسانوں کا کوئی گروہ دین کے حقیقی مفہوم کو اس طرح سمجھ کر تحریک اسلامی میں داخل ہو جائے تو صرف اسی گروہ کو صحیح معنوں میں ''اسلامی جمعیت'' یا ''اسلامی معاشرہ'' کہا جا سکتا ہے۔یعنی وہ جمعیت یا معاشرہ جو یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ اس کی اجتماعی زندگی میں اسلام کا نظامِ حیات جاری وساری ہو۔کیونکہ اس جمعیت نے اپنی آزاد مرضی سے یہ طے کر لیا ہے کہ اس کی پوری زندگی اسلامی نظام پر استوار ہو گی،اور وہ کسی معاملہ میں بھی اللہ رب العالمین کی حاکمیت کے سوا کسی اور کی حاکمیت کو قبول نہیں کرے گی۔

یوں جب ایک معاشرہ بالفعل وجود میں آجائے گا تو نظامِ اسلامی کی اساسی تعلیمات اس کے سامنے رکھ دی جائیں گی۔اور معاشرہ خود ہی نظامِ اسلامی کے عمومی ضوابط کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے ایسے تمام قوانین اور احکام وضع کرتا رہے گا جن کا عملی ضروریات تقاضا کریں گی۔ہمارے نزدیک ایک عملی اور حقیقت پسندانہ اور حکیمانہ اسلامی نظامِ حیات کو قائم کرنے کے لیے مختلف مراحل کی یہی صحیح اور بارآور ترتیب ہے۔بعض عجلت پسند مخلصین جنہیں دین کی اصل حقیقت اور مزاج کا ادراک حاصل نہیں ،اور نہ انہوں نے دین کے اس سیدھے اور راست ربانی طریقِ کار پر ہی غور کیا ہے جو اللہ علیم و حکیم کی بے پایاں حکمت پر مبنی ہے،اور انسانی طبائع اور زندگی کی ضروریات کے بارے میں اس کے علم محیط کا کرشمہ ہے وہ بسا اوقات یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ لوگوں کو اسلامی نظام کی بنیادوں ، بلکہ محض اسلامی قوانین واحکام سے آگاہ کرنے ہی سے دعوتِ اسلامی کی راہ آسان ہو جائے گی ۔اور لوگوں کے دلوں میں اسلام کے لیے خود بخود ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جائیں گے،ان حضرات کا یہ نظریہ محض ایک خام خیالی ہے جو ان کے عجلت پسند ذہنوں کی پیداوار ہے۔یہ اسی قبیل کا ایک تخیل ہے جس کی مثالیں ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح خود رسول اللہ ﷺ کے سامنے بھی ایسی کئی ایک تجاویز

پیش کی جاسکتی تھیں اور کہا جاسکتا تھا کہ آنجناب ﷺ اگر اپنی دعوت کا آغاز قوم پرستی کے کسی نعرے ،معاشی انقلاب کے کسی دعوے یا اخلاقی اصلاح کی تحریک سے کرتے تو آپ کی راہ ہموار اور آسان ہوجاتی اور انہیں مشکلات کی وادئ پرخار میں آبلہ پائی نہ کرنی پڑتی۔

اصولی طور پر سب سے پہلے ضروری ہے کہ دل اللہ واحد کے لیے یکسو ہونے چاہئیں۔اسی کی عبودیت کا اعلان کریں ،اسی کی شریعت کو تسلیم کریں اور دوسری ہر شریعت کو ٹھکرادیں قبل اس کے کہ شریعت کی تفصیلات بتا کر ان کے اندر اس کے لیے مزید رغبت اور کشش پیدا کی جائے۔شریعت کے ساتھ یہ رغبت تو دراصل اللہ کی خالص بندگی کے چشمے سے ہی ابلنی چاہیئے۔اور اس کا ماخذ دلوں میں غیر اللہ کی غلامی سے نجات پانے کا شوقِ فراواں ہو۔یہ کوئی صحیح صورتِ حال نہیں ہوگی کہ دلوں میں قانون الٰہی کے ساتھ رغبت اور دلچسپی کی بنیاد یہ امر ہو کہ تقابلی مطالعہ کے بعد بعض لوگوں نے اس کے بعض پہلوؤں سے ان انسانی قوانین سے زیادہ مفید اور بہتر پایا ہو جو ان کے گردوپیش کی دنیا میں عملاً جاری وساری ہیں۔بلا شبہ اللہ کا نظام سراسر سرچشمۂ خیر اور موجبِ سعادت ہونے کے لیے صرف یہی دلیل کافی ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے تجویز فرمایا ہے۔غلاموں کی شریعت کسی حال میں بھی اللہ کی شریعت سے لگّا نہیں کھاسکتی۔مگر ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ حقیقتِ نفس الامری دعوت اسلامی کی بنیاد نہیں ہے۔دعوت کی بنیاد صرف ''اسلام'' ہے۔اور اسلام جس حقیقت کا نام ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی شریعت کو ہر حال میں بلا چون وچرا قبول کیا جائے۔اور دوسری تمام شریعتوں کو اور ان کی ہر شکل کو قبول کرنے سے انکار کردیا جائے۔اس کے سوا اسلام کا اور کوئی مفہوم نہیں ہوسکتا۔جس کو اس ابتدائی اسلام سے رغبت اور وابستگی ہوگی اس کا آخری فیصلہ بھی ظاہر ہے کہ شریعت کے حق میں ہی ہوگا۔مگر اس کے بعد وہ اس بات کا محتاج نہیں رہے گا کہ اسلامی نظام کی آن بان ،اس کے حسن وجمال اور اس کی افضلیت و برتری کی تفصیلات سنا سنا کر اس کی ترغیب دی جائے اور جذبۂ شوق ابھارا جائے یہ ہے ایمان کے بدیہی حقائق میں سے ایک اہم اور بنیادی حقیقت!

اسلام نے جاہلیت کا مقابلہ کیسے کیا

ان تفصیلات کے بعد اب ہم یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن حکیم نے مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں عقیدہ اور ایمان کے مسئلہ کو کس طرح حل کیا۔ قرآن نے عقیدہ کو مجرد نظریہ کی صورت میں یا الٰہیات کے روپ میں نہیں پیش کیا۔ اور نہ اس کے بیان میں وہ انداز اختیار کیا ہے جو ہمارے علم الکلام نے کلامی بحثوں میں اختیار کیا ہے۔ اس کے برعکس قرآن ہمیشہ انسان کی فطرت کو اپیل کرتا ہے۔ اور ان چیزوں سے اپنے دلائل اور اشارات اخذ کرتا ہے جو خود انسان کے اپنے نفس میں اور ارد گرد کے ماحول میں پائے جاتے ہیں۔ وہ انسان کی فطرت کو اوہام وخرافات کے انباروں کے نیچے سے نکالتا ہے اور ادراک کی اس فطری صلاحیت کو جلا بخشتا ہے جو زنگ آلود ہو چکی تھی اور بے کار ہو چکی تھی۔ اسی طرح قرآن انسانی فطرت کے دریچوں کو وا کرتا ہے، اور اس کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ اس کے مؤثر اور لطیف اشارات کو سمجھ سکے اور انہیں قبول کر سکے۔

یہ تو قرآن کی تعلیمات کا ایک عام پہلو تھا۔ اس کی انقلابی تعلیمات کا خاص پہلو یہ تھا کہ اس نے توحید کی بنیاد پر سوسائٹی کے اندر ایک عملی جنگ چھیڑ رکھی تھی، اور ان جاہلی نظریات وروایات کے خلاف معرکہ آرائی کر رکھی تھی جن کے ملبے کے نیچے انسانیت مدفون تھی، اور فطرتِ انسان معطل اور اپاہج۔ لہٰذا ان مخصوص حالات کے مقابلے کے لیے اسلام کے لیے یہ شکل مناسب نہ تھی کہ اسے ایک ''نظریہ'' کے طور پیش کیا جاتا۔ بلکہ یہی مناسب صورت تھی کہ وہ عملی مقابلہ کا عزم لے کر میدان کارزار میں اترے، اور انسان کے دل ودماغ پر جو فکری اور عملی پردے پڑے ہوئے تھے ان کو چاک کرے، اور ان تمام چٹانوں کو پاش پاش کرے اور ان تمام دیواروں کو رستے سے ہٹائے جو انسان کے حق تک رسائی حاصل کرنے میں حائل کر دی گئی تھیں۔ اسی طرح عقلی مجادلہ کا اسلوب بھی، جو قرونِ مابعد میں علم الکلام کا طریقہ رہا ہے اور جس کا سارا دارومدار لفظی منطق پر تھا، اسلام کو پیش کرنے کی مناسب صورت نہ تھی، اس لیے کہ

قرآن تو پورے انسانی ماحول اور اس متحرک اسباب وعوامل سے زور آزما تھا اور پوری انسانیت سے ہم کلام تھا جو بگاڑ کے بے کراں سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس مقصد کے لیے ''الہیات'' کا انداز بیان بھی اسی کے لیے مفید نہ تھا۔ اس لیے کہ اسلامی عقیدہ اگر چہ وجدان سے تعلق رکھتا ہے مگر وہ درحقیقت عملی زندگی کا ایک لائحہ پیش کرتا ہے، اور وہ عمل کی دنیا میں اس کا نفاذ کرتا ہے۔ الہیات کی نظری بحثوں اور ذہنی خیال آرائیوں کی طرح وہ زندگی کے محدود اور تنگ دائرے میں محصور نہیں رہتا۔

قرآن ایک طرف اسلامی جماعت کے دلوں میں عقیدہ کی عمارت چنتا ہے، اور دوسری طرف ساتھ ہی اس جماعت کو لے کر ارد گرد کے جاہلی قلعوں پر قوت کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے اور خود اسلامی جماعت کے افکار و اعمال اور اخلاق و معاملات کے اندر بھی جو جاہلی اثرات اسے نظر آتے ہیں ان کے خلاف بھی بھر پور جنگ لڑتا ہے۔ چنانچہ انہی بلا خیز حالات وعوامل کے منجدھار میں اسلامی عقیدہ کی تعمیر ہوئی لیکن ''نظریہ'' یا ''الہیات'' کی شکل میں نہیں اور نہ ''کلامی جدلیات'' کے لباس میں، بلکہ زندگی سے لبریز، فعال اور نامی (Organic) تحریک کی شکل میں جس کا مظہر قرآن کی تیار کردہ مذکورہ جماعت اسلامی تھی۔ اس جماعت کا پورا پورا ارتقاء افکار کے لحاظ سے، اخلاق و کردار کے لحاظ سے اور تربیت وتعلیم کے لحاظ سے اسلام کے تحریکی تصور کے تحت ہوا۔ اسے جو تربیت ملی اس میں یہ روح کارفرما تھی کہ یہ جماعت دراصل ایک ایسا منظّم اور معرکہ آرا لشکر ہے جسے جاہلیت سے نبرد آزما ہونا ہے۔ چنانچہ اس تحریک کا ارتقاء خود عقیدہ وفکر کے ارتقاء کی عملی تفسیر تھا۔ یہ ہے اسلام کا صحیح طریقِ کار جو اسلام کی فطرت اور روح کا صحیح عکاس ہے۔

اسلام نظری نہیں بلکہ عملی دین ہے

دعوت اسلامی کے علمبرداروں کو دین کے مزاج اور اس کے تحریکی طریقِ کار کا یہ پہلو جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے، اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہیئے۔ اس پہلو پر غور کرنے سے انہیں معلوم ہوگا کہ عقیدہ کی

تعمیر وتشکیل کا وہ طویل مرحلہ جو مکہ کی زندگی میں گزرا ایسا نہیں ہے کہ اس میں اسلام کو صرف نظریاتی طور پر سیکھنے سکھانے پر ہی اکتفاء کیا گیا ہو۔ درحقیقت تعمیر عقیدہ کا مرحلہ اور وہ مرحلہ جس میں اسلامی تحریک کی عملاً تنظیم کی گئی، اور اسلامی جماعت کی بالفعل داغ بیل ڈالی گئی دو جدا گانہ اور ایک دوسرے سے منفک مرحلے نہیں تھے۔ بلکہ یہ دونوں ایک ہی مرحلہ تھے، جس میں بیک وقت عقیدہ کی تخم ریزی بھی کی گئی ،اسلامی تحریک اور اسلامی جماعت کا قیام بھی عمل میں لایا گیا، اور اسلام کے عملی وجود کا ڈھانچہ بھی تیار کیا گیا۔ اس لیے آئندہ جب کبھی احیائے اسلام کی کوشش کی جائے تو اسی جامع طریقہ کو اختیار کیا جانا چاہیئے۔

مناسب یہی ہے کہ تعمیر عقیدہ کا مرحلہ درازتر ہو۔ تعمیر کا کام کشاں کشاں شرمندۂ تکمیل ہو۔ ہر قدم گہرائی اور استحکام کا آئینہ دار ہو۔ اس مرحلے کو عقیدہ کی کھوکھلی نظری بحثوں کے نذر نہ کیا جائے۔ بلکہ اس مرحلہ میں عقیدہ ایک ایسی زندہ حقیقت بن کر دیدہ نواز ہو جو (اپنی فطری ترتیب کے ساتھ) عقیدہ میں ڈھلے ہوئے دلوں کی شکل میں ہو، ایسے متحرک جماعتی نظام کی شکل میں ہو جس کا داخلی اور خارجی ارتقاء خود عقیدہ کے ارتقاء کا مظہر ہو، ایسی عملی تحریک کی شکل میں ہو جو جاہلیت کو میدان عمل میں اُتر کا للکار رہی ہو اور نہ صرف فکر ونظر کے محاذ پر بلکہ عمل وکردار کے محاذ پر بھی اُس سے گرم پیکار ہو۔ تاکہ عقیدہ پیکر محسوس میں تبدیل ہو جائے اور اس کشمکش کے اندر رہ کر نشو ونما حاصل کرے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ بات اس کے نزدیک انتہائی غلط ہی نہیں، انتہائی خطرناک بھی ہے کہ عقیدہ اسلامی کھوکھلے نظریہ کی شکل میں ارتقاء پذیر ہو، اور محض فطری بحث وتمحیص اور مجرد فکری تحقیق وجستجو کے میدان میں محدود رہے قرآن کریم نے مکی دور میں عقیدہ کی تعمیر واستحکام پر پورے ۱۳ سال اس وجہ سے نہیں صرف کیے تھے، کہ یکبارگی نازل ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہتا تو پورا قرآن یکبارگی نازل کر دیتا، اور پھر ماننے والوں کو کم وبیش ۱۳ برس تک کچھ نہ کہتا، یہاں تک کہ وہ اس عرصہ میں ''اسلامی نظریہ'' پر علمی اور نظری دونوں لحاظ سے عبور حاصل کر لیتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ اختیار نہیں

فرمایا۔ اُسے کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ دنیا کے اندر ایک لا ثانی نظامِ زندگی کو جاری وساری کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں عقیدہ کی تعمیر، اس کی علمبردار تحریک کی تاسیس، اور اس کی نمائندہ معاشرے کی تنظیم بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عقیدہ کی قوت سے تحریک اور جماعت برپا ہو، اور تحریک اور جماعت کے سَیلِ رواں سے عقیدہ فروغ پذیر ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ عقیدہ، جماعت کی آئینہ داری کرے، اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ انسانوں کی اصلاح، اور معاشرے کی صحت مندانہ تشکیل کا کام ایسا نہیں ہے کہ راتوں رات ہو جائے۔ اس لیے کہ عقیدہ کی تعمیر وفروغ میں اتنی ہی مدت لازماً صرف ہوتی ہے جتنی مدت کسی فرد کی اصلاح اور جماعت کی تشکیل وتنظیم کے لیے درکار ہوتی ہے۔ کہ ادھر عقیدہ کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ اور ادھر ایک ایسی مضبوط جماعت منصۂ شہود پر آجائے جو اس کا مظہرِ حقیقی اور عملی تفسیر ہو۔

اس دین کا یہی مزاج ہے۔ قرآن کریم کے مکی دور سے بھی اس کے اس مزاج کا ثبوت ملتا ہے۔ ہمیں دین کا مزاج شناس ہونا چاہیئے، اور اپنی بے تاب خواہشات اور بے بضاعت انسانی نظریات سے ہزیمت خوردہ احساسات کی رَو میں بہہ کر دین کے مزاج میں تغیر وتبدّل کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ دین اپنے اسی مخصوص مزاج کے کرشموں سے پہلے بھی ''امت مسلمہ'' کے نام سے عظیم امت کی تخلیق کا کارنامہ سرانجام دے چکا ہے، اور آئندہ بھی جب کبھی ''امت مسلمہ'' کو دنیا میں دوبارہ کھڑا کرنے کا ارادہ کیا جائے گا تو دین کے اسی مزاج اور طریقِ کار کی روشنی میں اُسے تیار کیا جاسکے گا۔ ہمیں یہ بخوبی سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسی ہر کوشش غلط ہے اور خطرناک بھی جس کا مقصد یہ ہو کہ اسلام کے زندہ وتابندہ عقیدہ کو جسے ایک حرکت پذیر توانا اور جیسے جاگتے معاشرے کے رگ وپے میں سرایت کرنا چاہیئے، اور ایک منظّم تحریک کے قالب میں جلوہ ریز ہونا چاہیئے۔ اسے اپنے اس فطری عمل سے محروم کرکے مجرد نظریاتی درس وتدریس اور علمی بحث ومطالعہ کی آماجگاہ بنادیا جائے۔ تاکہ ہم بے بضاعت اور ہیچ وناکارہ انسانی نظریات کے مقابلے میں ''اسلامی نظریہ'' کی طاقت اور برتری ثابت کرسکیں۔ اسلامی

عقیدہ کا تقاضا تو یہ ہے کہ چلتے پھرتے انسان اس کا مظہر ونمونہ ہوں، وہ ایک ٹھوس انسانی تنظیم اور فعال تحریک کا لائحہ عمل ہو، اور ایک ایسی تحریک کا روپ دھار لے جو اردگرد کی جاہلیت کے باقی ماندہ اثرات سے برسرِ پیکار ہو۔ اس لیے کہ اس عقیدہ کو حرزِ جاں بنانے سے پہلے وہ بھی تو اسی جاہلیت کا ایک جز تھے اور بچے کھچے جاہلی اثرات کا ان میں پایا جانا عین ممکن ہے۔ اسلامی عقیدہ اپنی اس ماہیت کے لحاظ سے قلوب واذہان کا اس قدر وسیع وعریض رقبہ گھیر لیتا ہے جو اس رقبہ سے کہیں زیادہ وسیع وطویل ہوتا ہے جو نظریاتی بحثوں کے دائرے میں آتا ہے۔ لیکن وہ صرف قلوب واذہان کو اپنی جولانگاہ بنانے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اعمال وکردار کی لامحدود پہنائیوں پر بھی چھا جاتا ہے۔ الوہیت، کائنات، زندگی اور انسان یہ وہ مباحث ہیں جن کے بارے میں اسلام کا تصور نہایت جامع، ہمہ گیر اور کامل ہی نہیں حقیقت پسندانہ اور ایجابی بھی ہے۔ اسلام اپنے مزاج اور فطرت کی بنا پر یہ گوارا نہیں کرتا کہ وہ نرے عقلی اور عملی تصور کا تجریدی ڈھانچہ بن کر رہ جائے۔ یہ اس کی فطرت کے بھی منافی ہے اور اس کی غایت اور نصب العین کے بھی خلاف ہے۔ اُسے جو بات پسند ہے وہ یہ ہے کہ وہ زندہ انسانوں کے پیرائے میں نمودار ہو ،ایک زندہ تنظیم اس کی نمائندہ اور ایک عملی تحریک اس کی عملی تفسیر ہو۔ اس کا طریقۂ ارتقاء بھی نرالا ہے۔ یہ چلتے پھرتے افراد، سیماب آسا تنظیم اور فعال تحریک کے اندر سے کھیتی کی طرح اگتا اور نشوونما پاتا ہوا اس مرحلۂ پختگی تک پہنچ جاتا ہے جہاں نظری لحاظ سے بھی، اور عمل وواقع کے لحاظ سے بھی اس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اپنے دورِ نمّو میں وہ کبھی مجرد نظریہ کی حیثیت سے زندگی کے عملی مسائل سے الگ تھلگ نہیں رہتا بلکہ واقع اور عمل اور حرکت کے جلو میں تمام مراحل طے کرتا ہے۔ رہا یہ طریقہ کہ پہلے اسلامی تصور کی نظری اور تجریدی حیثیت سے پختہ وپز کر لی جائے اور بعد میں اسے تحریک وعمل کی دنیا میں پروان چڑھایا جائے تو نشوونما کا ایسا طریقہ اس دین کی فطرت، اس کے نصب العین، اس کی مخصوص ترکیب عنصری ہر لحاظ سے نامناسب بھی ہے، خطرناک اور نقصان دہ بھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا۔ (بنی اسرائیل:۱۰۶)

اوراس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تا کہ تم ٹھیر ٹھیر کرا سے لوگوں کوسناؤ، اوراسے ہم نے (موقع موقع سے) بتدریج اتارا ہے۔

اس ارشاد کی رو سے اسلام میں دونوں پہلو قصداً بیک وقت اختیار فرمائے گئے ہیں: قرآن کی رفتہ رفتہ تنزیل! اور پھر اسے لوگوں کو ٹھیر ٹھیر کر سنانا، یہ طریقہ اس لیے اختیار فرمایا گیا تا کہ عقیدہ کی بنیادوں پر تعمیر ہونے والا نظام ایک زندہ اور فعال تنظیم کے پیکر میں نمودار ہوکر پایۂ تکمیل کو پہنچے، نہ کہ نظریہ محض کی شکل میں۔

دین کا طریق فکر وعمل بھی ربّانی ہے

اس دین کے علمبرداروں کو یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ جس طرح یہ دین نظام ربّانی ہے، اسی طرح اس کا طریقِ کار بھی وحی الٰہی پر مبنی ہے۔ دین کی اصل فطرت اوراس کے طریق کار دونوں میں مکمل مناسبت اور ہمرنگی ہے۔ چنانچہ اس دین کو اس کے مخصوص طریقِ کار کے تحت روبہ عمل نہ لانا سعی لا حاصل ہے، دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ نیز یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ جس طرح یہ دین فکر ونظر کے انقلاب سے کردار وعمل کی دنیا میں انقلاب برپا کرنے کے لیے آیا ہے، اسی طرح اس کا مشن یہ بھی ہے کہ وہ اس منہاج فکر کو بھی بدل ڈالے جو عقیدہ کی تعمیر اور عملی زندگی میں انقلاب برپا کرنے کے لئے اختیار کریا جاتا ہے۔ یہ دین عقیدہ کی بھی تعمیر کرتا ہے اور امت کی تشکیل بھی۔ اور ساتھ ہی اپنے مخصوص نظامِ فکر کو، اس کی مخصوص آئیڈیالوجی، اور اس کی مخصوص نوعیت کی جاندار تحریک یہ تینوں جدا جدا اور الگ نہیں ہیں بلکہ بیک وقت سرانجام پاتے ہیں کیونکہ یہ ایک ہی پھول ہے کہ جس کی پنکھڑیاں ہیں۔

تشریح بالا سے ہمیں معلوم ہوگیا کہ دین کا اپنا مخصوص طریقِ کار ہے۔ اب دوسرے قدم پر ہمیں یہ بھی

معلوم رہنا چاہیئے کہ یہ طریق کار منفرد ہے، اور ابدی ہے۔ یہ طریقِ کار دعوت اسلامی کے کسی مخصوص مرحلے سے وابستہ نہیں ہے، نہ یہ کسی مخصوص حالات رکھنے والے کسی ماحول کے لئے اترا ہے، نہ صرف ان حالات کے لیے تجویز کیا گیا تھا جو اولیں اسلامی جماعت کے قیام کے وقت موجود تھے۔ بلکہ یہ طریقِ کار زمان ومکان کے قیود سے آزاد ہے۔ اور جب بھی دین حق کا قیام وفروغ عمل میں آئے گا اِسی طریق کار کے نتیجے میں آئے گا۔

اسلام کی ذمہ داری اتنی نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے عقائد واعمال میں انقلاب برپا کرے، بلکہ یہ بھی اس کی ذمہ داری میں شامل ہے کہ وہ لوگوں کے طرزِ فکر اور اندازِ نظر کو بھی بدل ڈالے، اور تصورات اور حالات کے بارے میں ان کے زاویۂ نگاہ میں بنیادی تبدیلی پیدا کردے۔ چونکہ اسلام کا نظام فکر بھی ہدایتِ الٰہی سے ہی ماخوذ ہے اس لیے یہ اپنی فطرت وساخت کے لحاظ سے ان تمام ناقص وبے روح اندازہائے فکر سے سراسر مختلف ہے جنہیں فانی اور کوتاہ نظر انسانوں نے تخلیق کیا ہے۔

جب ہم اسلام کو ایک نظریہ مجرد کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ یہ صرف بحث ومطالعہ کے حلقے کی رونق بنا رہے تو اس طرح ہم اسے اس کے ربانی طریقِ کار اور ربانی طرز وفکر دونوں سے جدا کردیتے ہیں۔ اور اسے انسانی نظامِ فکر کا تابع بنادیتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کا تجویز کردہ طریق فکر۔ معاذ اللہ۔ انسانی طریق ہائے فکر سے فروتر ہے، اور ہم فکر وعمل کے عمل خدائی نظام کو ''ترقی'' دے کر انسانی نظاموں کے ہم پلہ کردینا چاہتے ہیں۔ یہ زاویۂ نگاہ انتہائی خطرناک اور مضر ہے، اور اس انداز کی ذہنی وفکری ہزیمت ملت کے لیے سخت تباہ کن ثابت ہوا کرتی ہے۔

نظامِ حق اُن سب اصحاب کو جو دعوتِ اسلامی کے میدان میں سرگرم عمل ہیں فکر وتدبر کے مخصوص پیمانے اور اسلوب دیتا ہے۔ جن کی بدولت وہ ان تمام پیمانوں اور اسالیب کی خرابیوں سے بچ سکتے ہیں جو جاہلیت نے دنیا بھر میں رائج کر رکھے ہیں، اور جنھوں نے خود ہماری عقلوں کو ماؤف۔ اور ہماری تعلیم و ثقافت کو زہر آلود کر رکھا ہے۔ اس فتنہ عظیم کے مقابلے میں اگر ہم نے اس دین کو ایسے انداز سے سمجھنے کی

کوشش کی جو اس کی فطرت کے لیے بالکل اجنبی ہے، اور جاہلیت غالبہ ہی کا ایک نتیجہ ہے، تو ہماری یہ کوشش دُہرے خسارے پر منتج ہوگی۔ ایک طرف ہم دین کو اپنے اصل دقیقہ اور عمل سے معطل کردیں گے جسے سرانجام دینے کے لیے وہ انسانیت کے پاس آیا ہے، اور دوسری طرف ہم بحیثیت انسان اپنے آپ کو ایک ایسے سنہری موقع سے بھی محروم کرلیں گے جس میں عصر حاضر کے جاہلی نظام سے گلوخاصی کرا سکتے تھے، اور جاہلیت کے اُن تمام زہریلے اثرات سے اپنے آپ کو بچا سکتے تھے جو ہمارے ذہنوں اور ہماری تربیت میں پائے جاتے ہیں، معاملے کا یہ پہلو انتہائی خطرناک اور سنگین ہے، اور اس کا اندازکا خسارہ بھی انتہائی تباہ کن ثابت ہوگا۔

اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے خود نظامِ فکر اور لائحہ عمل کی جو اہمیت وضرورت ہے وہ اُس اہمیت وضرورت سے کسی پہلو کم نہیں ہے جو اسلام کے عقیدہ اور نظامِ حیات کو حاصل ہے، کیونکہ یہ تمام پہلو ایک دوسرے سے منفک اور جدا جدا نہیں ہیں۔ ہمیں یہ خیال خواہ کتنا ہی اچھا اور خوشنما معلوم ہو، اور ہم اسلام کے عقیدہ ونظام کی خوبیوں کو زبان وقلم سے چاہے کتنا ہی واضح کرتے پھریں، مگر یہ حقیقت ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیئے کہ ہماری یہ خدمت دنیا کے اندر اسلام کو کبھی ایک واقعہ اور تحریک کی صورت میں برپا نہیں کرسکتی۔ بلکہ یہ بات بھی فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ اس شکل میں ہم اگر اسلام کو پیش کرتے رہیں گے تو اس سے باہر کے لوگ نہیں، صرف وہ گروہ ہی استفادہ کرسکے گا جو بالفعل اسلامی تحریک کے لیے کام کررہا ہے۔ اور خود یہ گروہ بھی زیادہ سے زیادہ اس سے جو استفادہ حاصل کرسکے گا وہ یہ ہے کہ اپنے تحریکی سفر میں وہ جس مرحلے تک پہنچ چکا ہے اس مرحلے کی ضرورت وتقاضا کو اس کی مدد سے پورا کرسکے۔ لہٰذا اس مناسبت سے میں دوبارہ یہ کہوں گا کہ اصل طریقہ یہ ہے کہ ایک طرف اسلامی عقیدہ کو بلاتاخیر عملی تحریک میں تبدیل ہونا چاہیئے۔ اور دوسری طرف یہ تحریک بھی اسی ساعت سے عقیدہ کی صحیح تصویر اور حقیقی ترجمان ہونی چاہیئے۔ میں مکرر کہوں گا کہ اسلام کے غلبہ کا یہی فطری طریقِ کار نہ صرف خوب تر اور سیدھا اور صاف ہے، بلکہ نہایت مؤثر ودل نشین بھی ہے، اور

ان تمام طریق ہائے کار کی نسبت فطرتِ انسان سے زیادہ قریب ہے جو پہلے نظریات وافکار کی تراش خراش کر کے انہیں مجرد علمی بحثوں کے انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ مرحلہ کو انسان ان نظریات کے بل پر کوئی عملی تحریک اٹھائیں یا خود ان نظریات کا چلتا پھرتا نمونہ بنیں، اور ان کی رہنمائی میں منزل بہ منزل کوئی پیش قدمی کریں، ابھی بہت دور ہوتا ہے، نہ کبھی اس کے ان لوگوں کو پیش آنے کا امکان ہی کہیں موجود ہوتا ہے۔

اسلامی نظام کے نفاذ سے پہلے اسلامی قانون کا مطالبہ درست نہیں

یہ نقطۂ نگاہ اگر بذاتِ خود اسلام کے نظریہ وعقیدہ کے بارے میں درست ہے تو اسے اسلامی نظام کی بنیادوں اور اس کی قانونی تفصیلات کے بارے میں قدرتی طور پر بدرجۂ اولیٰ صحیح ہونا چاہیئے ۔ یہ جاہلیت جو آج ہمارے گردو پیش میں بری طرح چھائی ہوئی ہے، جہاں یہ دعوتِ اسلامی کے بعض مخلص خادموں کے اعصاب پر اس قدر بارگراں بن رہی ہے کہ وہ بے صبر ہو کر اسلامی نظام کے تمام مراحل کو بہ عجلت عبور کرنا چاہتے ہیں وہاں وہ انہیں ایک اور نازک سوال سے بھی دوچار کر رہی ہے۔ وہ ان سے بار بار یہ سوال کرتی رہتی ہے کہ اس نظام کی تفصیلات کیا ہیں جس کے تم داعی ہو؟ اُسے نافذ کرنے کی خاطر تم نے اس پر کتنی ریسرچ کر رکھی ہے؟ کتنے مقالے اور مضامین تیار کر رکھے ہیں؟ اور فقہ کو کس حد تک جدید اصولوں پر مرتب کر رکھا ہے؟ گویا آج لوگوں کے پاس شریعتِ اسلامی کو جاری وساری کرنے کے لیے اور کس چیز کی کمی نہیں ہے، صرف فقہی احکام اور فقہی تحقیقات کی کمی ہے۔ وہ اللہ کی حاکمیت کو بھی مان چکے ہیں اور اللہ کی شریعت کو حاکم بنانے پر بھی راضی ہیں بس ایک ہی کسر رہ گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ''مجتہدین'' کی طرف سے ابھی تک انہیں جدید طرز پر مدوّن کی ہوئی فقہ سپلائی نہیں کی گئی!! درحقیقت یہ اسلام پر ایک نہایت رکیک طنز ہے۔ اور اس پر ہر اُس شخص کو آتش پا ہونا چاہیئے جس کے دل میں دین کا ذرّہ برابر بھی احترام اور غیرت موجود ہے۔

جاہلیت کے ہتھکنڈوں سے متنبّہ رہنا چاہیئے

جاہلیت اس طرح کی چھیڑخانیوں اور اشقلہ بازیوں سے صرف یہ چاہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اُسے شریعتِ الٰہی کو ردّ کردینے کا بہانہ مل جائے، اور وہ انسان پر انسان کی آقائی کے نظام کو قائم ودائم رکھ سکے۔ اس کی یہ بھی خواہش ہے کہ اسلام کے نام لیواؤں کو اقامتِ دین کے اس طریقِ کار سے پھیر دے جو اللہ تعالیٰ نے تجویز فرمایا ہے۔ انہیں اس اصول پر قائم نہ رہنے دے کہ فکر وعقیدہ کی تعمیر وتحریک کی شکل میں ہو۔ وہ طریقِ دعوت کا وہ مزاج ہی مسخ کردینا چاہتی ہے جس کی رُو سے اسلامی نظریہ کی تکمیل تحریک کے طوفان خیزیوں کے منجدھار میں ہوتی ہے، نظامِ اسلامی کے خدوخال عملی کاوشوں کے ذریعہ اجاگر ہوتے ہیں، اور قانون سازی اسلامی زندگی کے عملی مسائل اور حقیقی مشکلات کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے، لیکن داعیانِ حق کو جاہلیت کی اس فسوں کاری پر دھیان ن دینا چاہیئے۔ بلکہ انہیں جراءت کے ساتھ ہر ایسے طریق کار کو ٹھکرادینا چاہیئے جو ان کی تحریک اور ان کے دین پر جاہلیت کی طرف سے ٹھونسا جارہا ہو۔ داعیانِ حق کو موم کی ناک نہ بننا چاہیئے کہ مخالفِ دین عنصر انہیں جس طرح چاہے توڑتا موڑتا رہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ جاہلیت کی تمام چال بازیوں کا بھانڈا پھوڑیں، اور ان کا اچھی طرح قلع قمع کریں، خاص کر اس مسخرہ پن کی پوری قوت کے ساتھ تردید کریں جو ''فقہ اسلامی کی تجدید'' کے پردے میں ایک ایسے معاشرے کے ساتھ روا رکھا جارہا ہے جو نہ قانون خداوندی کی برتری کو تسلیم کرتا ہے اور نہ غیر الٰہی قوانین سے اظہار بیزاری کرتا ہے۔ اس طرح کی باتیں درحقیقت سنجیدہ اور ٹھوس اور مُثمر کام سے غافل کرنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ اور اس لیے کی جاتی ہیں کہ اسلام کے چاہنے والے محض ہوا میں تخم ریزی کرکے اپنا وقت ضائع کرتے رہیں۔ چنانچہ ان کا فرض ہے کہ وہ اس طرح کے ہتھکنڈوں کا پردہ چاک کریں، اور انہیں کامیاب نہ ہونے دیں۔ اس دین نے تحریک کا جو طریقِ کار پیش کیا ہے اُسی کے مطابق ہی اقامتِ دین کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔ اسی طریقِ کار کے اندر دین کی

طاقت کا راز مضمر ہے اور یہی ان کی اپنی طاقت و شوکت کا منبع بھی ہے۔

اسلام اور احیائے اسلام کا طریقِ کار دونوں مساوی اہمیت کے حامل ہیں۔دونوں میں دوئی نہیں ہے۔کوئی اور طریقِ کار خواہ کیسا ہی جاذبِ نظر ہو اسلامی نظام کو کبھی غالب نہیں کرسکتا۔انسانوں کے وضع کردہ نظام تو باہر سے درآمد کردہ طریقِ کار سے قائم و برپا ہوسکتے ہیں۔لیکن ہمارے نظام کو بروئے کار لانے سے قاصر ہیں۔لہٰذا اسلامی تحریک کے لیے اقامتِ دین کے مخصوص طریقِ کار کی پابندی اتنی ہی لازم ہے جتنی خود اسلام کے بنیادی عقیدہ اور اس کے نظامِ حیات کی پابندی اِنَّ هٰـذَا الْـقُـرْآنَ يَهْدِىْ لِلَّتِى هِىَ اَقْوَمُ (یہ قرآن اس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا اور صاف ہے)

باب سوم

اِسلامی معاشرے کی خصوصیات اور اس کی تعمیر کا صحیح طریقہ

انبیاء کی اصل دعوت

دعوت اسلامی کا وہ دور جس کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک نے ڈالی اُس دعوت الی اللہ کے طویل سلسلہ کی آخری کڑی ہے جو انبیائے کرام کی قیادت میں ازل سے جاری رہا ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں اس دعوت کا ایک ہی مقصد اور نصب العین رہا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسانوں کو ان کے خدائے واحد اور حقیقی پروردگار سے آشنا کرایا جائے ، انہیں رب واحد کی غلامی میں داخل کیا جائے ، اور دنیا کے اندر انسان کی ربوبیت کی بساط لپیٹی جائے۔ ان معدودے چند افراد کے سوا جو گاہے بگاہے تاریخ میں پائے جاتے رہے ہیں انسان بحیثیت مجموعی کبھی الوہیت کے نظریہ کے منکر نہیں رہے ہیں ، اور نہ انہوں نے مطلقاً اللہ کی ہستی کا انکار کیا ہے۔ بلکہ یا تو وہ اپنے حقیقی رب کی صحیح معرفت میں غلطی کرتے رہے ہیں اور یا اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی الوہیت میں شریک ٹھہراتے رہے ہیں ، کبھی عقیدہ وعبادت میں ، اور کبھی غیر اللہ کی حاکمیت اور اتباع کرنے کی صورت میں۔ یہ دونوں شکلیں اس اعتبار سے خالصتاً شرک ہیں کہ وہ انسانوں کو اللہ کے دین سے دُور جانے والی تھیں جسے وہ ہر نبی اور رسول کی زبان سے سمجھتے آئے تھے۔ مگر طویل مدت گزر جانے کے بعد اس کو بھول جاتے تھے اور آخر کار اسی جاہلیت کی طرف لوٹ جاتے تھے جس سے اللہ نے ان کو اپنے فضل سے نکالا تھا۔ وہ دوبارہ شرک کی راہوں پر چل پڑتے ، کبھی عقیدہ اور عبادت غیر اللہ کی حد تک ، اور کبھی دوسروں کی حاکمیت تسلیم کرنے اور ان کی پیروی

کرنے کی حد تک، اور کبھی بیک وقت ان دونوں صورتوں میں مبتلا ہو کر۔

کائنات کے اندر انسان کی اصل حیثیت

انسانی تاریخ کے ہر دور میں دعوت الی اللہ کا ایک ہی مزاج رہا ہے۔اس دعوت کا نصب العین ''اسلام'' ہے۔جس کے معنی ہیں: انسانوں کو ان کے پروردگار کا مطیع وفرمانبردار بنانا، انہیں بندوں کی غلامی سے نجات دلا کر خدائے واحد کا غلام بنانا، انہیں انسانوں کی حاکمیت، انسانوں کے وضع کردہ شرائع ،انسانوں کی خودساختہ اقدارِ حیات اور روایات کے پنجے سے نکال کر زندگی کے ہر شعبے میں انہیں خدائے واحد کے اقتدار و حاکمیت، اور اس کے قانون کا پیرو بنانا انبیائے سابقین اسی مشن کو لے کر آئے تھے، اور نبی ﷺ بھی جس اسلام کو لے کر مبعوث ہوئے ہیں اُس کا پیغام یہی ہے۔وہ انسان کو اُسی طرح اللہ کی حاکمیت کے آگے سرافگندہ کرنے کے لیے آیا ہے جس طرح یہ پوری کائنات اُس کی حاکمیت کے آگے سرنگوں ہے، انسان اسی کائنات کا ایک حقیر جز ہے،لہٰذا جو ''قوت'' انسان کے طبعی وجود کی تدبیر کرتی ہے ضروری ہے کہ وہی ''قوت'' اس کی تشریعی زندگی کی مدبّر اور کارفرما ہو اور جو نظام اور اقتدار اور اسکیم اس پوری کائنات پر متصرف ہے بلکہ خود انسان اس سے ہٹ کر اپنے لیے الگ کوئی نظام، کوئی اقتدار، اور کوئی اسکیم تجویز نہ کرے، انسان اپنی نشوونما، اپنی صحت و بیماری اور موت و حیات کے معاملے میں ان طبعی قوانین کے پابند ہیں جو اللہ تعالیٰ نے جاری فرما رکھے ہیں۔ بلکہ اپنی ارادی تگ ودو کے جن نتائج وعواقب سے دوچار ہوتے ہیں، ان کے بارے میں بھی وہ کائناتی قوانین کے سامنے بے بس ہیں۔ان تمام پہلوؤں میں وہ اللہ کی سنت کو بدلنے پر قادر نہیں ہیں اور نہ اس بات پر قادر ہیں کہ وہ اس کائنات پر حاوی و متصرف نوامیس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکیں۔پس انسان کے لیے یہی رویہ مناسب ہے کہ وہ اپنی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملے سے لے کر بڑے سے بڑے معاملے تک اللہ کی شریعت کو حاکم بنائے۔تاکہ ایک طرف اس کی زندگی کے غیر ارادی گوشوں اور

اختیاری پہلوؤں کے درمیان ہم آہنگی اور توافق پیدا ہو سکے، اور دوسری طرف زندگی کے ان دونوں حصوں اور وسیع تر کائنات کے درمیان بھی مطابقت اور یک جہتی پیدا ہو (اس نکتے کو تفصیل سے سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو: ''دینیات'' تالیف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور۔ مؤلف)

جاہلیت کی ہمہ گیر گرفت سے نجات پانے کا صحیح طریقہ

لیکن جاہلیت جس کا خمیر ہی اس مادۂ فاسد سے تیار ہوتا ہے کہ انسان پر انسان کی حاکمیت قائم ہو، اور جو انسان کو کائنات کے ہمہ گیر نظام سے جُدا کرتی ہے، اور انسانی زندگی کے غیر ارادی اور تکوینی حصے کو اختیاری اور تشریعی حصہ سے متصادم کرتی ہے۔ وہی جاہلیت جس کے مقابلے میں انبیاء اور رسولوں نے اسلامی دعوت کو پیش کیا اور نبی آخرالزماں ﷺ اُسی کے استیصال کے لیے دنیا میں تشریف لائے یہ جاہلیت کسی تجریدی نظریہ کے قالب میں موجود نہیں رہی، بعض حالات میں تو اس کا سرے سے کوئی ''نظریہ'' ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ہمیشہ جیتی جاگتی تحریک کے روپ میں ابھرتی رہی ہے، ایک ایسے معاشرے کی شکل میں نمودار ہوتی رہی ہے جس کی اپنی لیڈر شپ، اپنے تصورات واقدار، اپنی روایات وعادات اور اپنے جذبات واحساسات ہوتے ہیں۔ وہ ایک منظّم معاشرہ ہوتا ہے، اس کے افراد کے درمیان باہمی ربط وتعاون، اور منظّم توافق ووفاداری اس درجہ کی پائی جاتی ہے کہ پورا معاشرہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے وجود کی حفاظت کے لیے یکساں طور پر متحرک اور چاق وچوبند رہتا ہے۔ اپنی شخصیت کے دفاع میں وہ ایسے تمام خطرانگیز عناصر واثرات کے ازالہ میں سرگرم رہتا ہے، جو اس کے مستقل نظام کے لیے کسی بھی حیثیت سے خطرے کی تمہید ہوتے ہیں۔

جب جاہلیت محض علمی نظریے کی شکل میں نہیں بلکہ ایک زندہ وفعال تحریک اور جیتا جاگتا معاشرہ بن کر سامنے آتی ہے تو اس جاہلیت کو مٹانے اور انسانوں کو از سرِ نو اللہ قدوس کے آستاں پر لانے کے لیے ہر

وہ کوشش غیر مناسب اور بے سود ہوگی جو اسلام کو محض علمی نظریہ کی حد تک پیش کرنے پر اکتفاء کرتی ہو۔ جاہلیت عملی دنیا پر قابض ہے اور اس کی پشت پر ایک زندہ و متحرک ادارہ موجود ہے۔ ایسی حالت میں نظری کوشش جاہلیت کے مقابلے کے لیے فائق تر تو کجا مساوی جواب بھی نہیں ہے۔ جب مقصد یہ ہو کہ ایک بالفعل قائم نظام کو ختم کر کے اُس کی جگہ ایک ایسے نظام کو برپا کرنا ہے جو اپنے مزاج، اپنے اصول حیات اور ہر کلی و جزئی معاملے میں موجودہ غالب جاہلی نظام سے اختلاف رکھتا ہے تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ نیا نظام بھی ایک منظّم تحریک اور جان دار معاشرہ بن کر میدان مبازرت میں اترے۔ اور اس عزم کے ساتھ اترے کہ اس کی نظریاتی بنیادیں، اس کی انتظامی تدابیر اور نظم اجتماعی، اس کے کارکنوں کے باہمی روابط و تعلقات قائم شدہ جاہلی نظام سے ہر ہر پہلو میں قوی تر اور محکم ہوں۔

اسلامی معاشرہ کی نظریاتی بنیاد

وہ نظریاتی بنیاد جس پر اسلام نے تاریخ کے ہر دور میں اپنے معاشرے کی تعمیر کی ہے وہ یہ شہادت ہے کہ: لا الٰہ الا اللہ، اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اس شہادت کا مطلب یہ ہے کہ الٰہ صرف اللہ ہے، وہی رب ہے، وہی منتظم کائنات ہے، وحی حاکم حقیقی اور مقتدر اعلیٰ ہے۔ قلب و ضمیر اس کی وحدانیت سے منور ہونی چاہئیں، عبادات و شعائر میں اسی کی وحدانیت کا ثبوت پیش کرنا چاہیئے، عملی زندگی کے قانون میں اسی کی وحدانیت کا تصور کارفرما ہونا چاہیئے، اس کامل اور ہمہ گیر صورت کے علاوہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت علمی لحاظ سے کسی اور طرح نہیں دی جاسکتی، اور نہ شرعی لحاظ سے ہی ایسی شہادت معتبر ہوگی۔ یہ کامل و ہمہ گیر صورت اس قولی شہادت کو ایسے عملی اور مؤثر نظام کا پیرایہ دے دیتی ہے کہ اس کی بنیاد پر اس کے قائل کو مسلم اور منکر کو غیر مسلم قرار دیا جاسکتا ہے۔ نظری لحاظ سے اس بنیاد کو قائم کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ انسانی زندگی پوری کی پوری اللہ کے تصرف میں دے دی جائے۔ انسان اپنی زندگی کے کسی معاملے میں اور کسی گوشے میں اپنے آپ کوئی فیصلہ نہ کرے، بلکہ اللہ کے حکم کی جانب رجوع کرے اور اس کی پیروی

کرے، اللہ کا حکم اسے صرف ایک ذریعہ سے معلوم کرنا چاہیئے، اور وہ ذریعہ ہے اللہ کا رسول ﷺ۔ کلمۂ شہادت کے دوسرے حصے میں اسی ذریعہ کو اسلام کے رکن دوم کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ اور فرمایا گیا ہے: واشہدوان محمداً رسول اللہ (اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں)

یہ ہے وہ نظریاتی اساس جس پر اسلام کی عمارت قائم ہوتی ہے اور جو اسلام کی اصل روح ہے۔ یہ بنیاد انسانی زندگی کا مکمل ضابطہ فراہم کرتی ہے جسے زندگی کے ہر ہر پہلو میں نافذ کیا جانا چاہیئے، اور جسے ہاتھ میں لے کر ایک مسلمان اپنی انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کے ہر ہر مسئلہ کو حل کرتا ہے خواہ یہ مسئلہ اُسے دارالاسلام کے اندر پیش آئے یا دارالاسلام سے باہر۔ ان روابط سے متعلق ہو جو مسلم معاشرے کے ساتھ وہ قائم کرتا ہے یا ان تعلقات اور رشتوں کے بارے میں ہو جو ایک مسلم معاشرہ دوسرے غیر مسلم معاشروں کے ساتھ قائم کرتا ہے۔

جاہلی معاشرے کے اندر رہنے والے ''مسلمان''

اسلام، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، جامد اور مجرد نظریہ نہیں ہے کہ جو لوگ چاہیں اسے عقیدہ کے طور پر قبول کر لیں۔ اور پھر دھڑلے سے بالفعل قائم شدہ اور حرکت پذیر جاہلی معاشرے کے کل پرزے بنے رہیں۔ اس طرز پر اسلام کے ماننے والوں کا پایا جانا اسلام کے ''عملی وجود'' کو بروئے کار نہیں لاسکتا، خواہ تعداد کے لحاظ سے وہ جم غفیر ہی کیوں نہ ہوں۔ اس لیے کہ ''نظری مسلمان'' جو جاہلی معاشرے کے اجزائے ترکیبی کا ایک جز ہوں وہ لامحالہ اس معاشرے کے تمام تنظیمی تقاضوں کو لبیک کہنے پر مجبور و بے بس ہوں گے، اور ان تمام اساسی ضروریات کو جو اس معاشرے کی زندگی اور حرکت اور بقاء کے لیے ناگزیر ہیں شعوری اور غیر شعوری طور پر، طوعاً اور کرھاً پورا کرنے کے لیے محوِ گردش رہیں گے۔ بلکہ اس پر مستزاد یہ کہ اس معاشرے کے محافظ بن کر کھڑے ہوں گے۔ اور ان اسباب وعوامل کی سرکوبی کریں گے جو اس کے وجود اور نظام کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ''کُل'' جب یہ تمام فرائض

سرانجام دے گا تو ''جز'' کو لازماً ارادی طور پر یا غیر ارادی طور پر انہی فرائض کو ادا کرنے کے لیے کل کے مطابق ہی حرکت کرنا ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں ایسے ''نظریاتی مسلمان'' جس جاہلی معاشرے کی نظریاتی حیثیت سے مخالفت کر رہے ہوتے ہیں عملاً وہ اس کو مضبوط و مستحکم کرنے میں لگے ہوتے ہیں ۔ بلکہ اس نظام کے نسبتاً جاندار خلیہ (Cells) ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے لیے عناصر بقا اور اسباب حیات مہیا کرتے ہیں۔ اپنی قابلیتیں ، اپنے تجربات ، اور اپنی تازہ دم قوتیں اس کی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔ تاکہ اسے عمر دراز اور قوت مزید حاصل ہو، حالانکہ ان کی تمام تر حرکت اور سرگرمی اِس جاہلی معاشرے کو ختم کرنے میں صرف ہونی چاہیئے تاکہ وہاں صحیح اسلامی معاشرہ قائم کیا جاسکے۔

جاہلی قیادت سے انحراف لازم ہے

اس وجہ سے یہ بات ناگزیر ہے کہ اسلام کی نظریاتی بنیاد (عقیدہ الوہیت) ابتداء سے ایک منظّم و فعال جماعت کے پیکر میں نمودار ہو۔ یہ جماعت جاہلی اجتماع سے الگ تھلگ ہو جاہلیت کے متحرک و منظّم معاشرے سے جس کا نصب العین ہی ''اسلام'' (حاکمیت اللہ) کی روک تھام ہے۔ ہر طرح برتر اور منفرد و ممتاز ہو۔ اس نئی جماعت کا مرجع و محور جدید قیادت ہو۔ وہ قیادت جس کی باگ دوڑ اوّلاً رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں تھی، اور آپ ﷺ کے بعد ہر وہ اسلامی قیادت اِس کی ذمہ داری کی امین ہے جو انسان کو صرف اللہ کی الوہیت و ربوبیت ، اللہ کے اقتدار اعلیٰ و حاکمیت ، اور اللہ کے قانون و شریعت کا پابند بنانا چاہتی ہے۔ جو شخص یہ شہادت ادا کرے کہ: ''اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، اور محمد اللہ کے رسول ہیں'' وہ جاہلی اجتماع سے جسے وہ خیر باد کہہ چکا ہے اپنی وفاداریوں کا رشتہ کاٹ دے۔ اور جاہلی قیادت سے بغاوت کرے، چاہے کسی بھیس میں ہو: کاہنوں، پروہتوں، جادوگروں اور قیافہ شناسوں کی مذہبی قیادت ہو، یا سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی قیادت ہو، جیسی کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں قریش کو حاصل تھی۔ اُسے اپنی تمام تر وفاداریاں نئی اسلامی جماعت ، اللہ شناس نظام اور اس کی اللہ پرست

قیادت کے ساتھ مخصوص رکھنا ہوں گی۔

جاہلی فضا میں اسلام کے احیاء کی صورت

یہ فیصلہ کن اقدام اسی لمحہ ہو جانا چاہیے جس لمحہ ایک شخص اسلام میں داخل ہوتا ہے، اور یہ قولی شہادت دیتا کہ: ''لا الٰہ الا اللہ'' اور ''محمد رسول اللہ''۔ مسلم معاشرہ اس انقلابی اقدام کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا ۔مسلم معاشرہ محض افراد کے دلوں میں اسلام کی نظریاتی بنیاد پر قائم ہو جانے سے کبھی وجود میں نہیں آ سکتا۔ خواہ ایسے زبانی نام لیواؤں اور دلی خیر خواہوں کی دنیا کے اندر کتنی بڑی بھیڑ جمع ہو جائے۔ اس معاشرہ کو برپا کرنے کے لیے شرط یہ ہے کہ اسلام کی قولی شہادت ادا کرنے والے ایک ایسی تحریک کی شکل اختیار کریں جو زندگی سے لبریز اور فعال و منظّم ہو، اس کے افراد کے اندر باہمی تعاون اور یکجہتی ہو ، ہم آہنگی اور ہمنوائی ہو، وہ جداگانہ تشخص رکھتی ہو۔ اس کے اعضاء انسانی جسم کے اعضاء و جوارح کی طرح منظّم اجتماعی حرکت کے جلو میں اس کے وجود کا دفاع و استحکام کرتے ہوں، اس کی جڑوں کو زمین کی گہرائیوں میں اتاریں اور اس کی شاخوں کو افق تا افق وسیع کریں، اور ان کے عوامل و اسباب کا سدِّ باب کریں جو اس کے وجود اور نظام پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور اسے مٹانے کے در پے ہیں۔ یہ سب فرائض وہ ایک ایسی بیدار مغز، دوراندیش، اور روشن ضمیر قیادت کی رہنمائی میں سرانجام دے سکتے ہیں، جو جاہلی قیادت سے مستقل اور جداگانہ وجود رکھتی ہو، جو ایک طرف ان کی حرکت اور تگ و دو کی تنظیم کرے ، اور اس میں یکجہتی، وحدت اور یگانگت پیدا کرے ، اور دوسری طرف ان کے ''اسلامی وجود '' کے استحکام اور توسیع و تقویت کا انتظام بھی کرے ، اور اپنے حریف مقابل جاہلی وجود کو زائل اور اس کے اثرات کو ناپید کرنے میں ان کی رہنمائی کرے۔

یہی وہ فطری طریقہ کار ہے جس کی بدولت اسلام کا عملی وجود دنیا میں قائم ہوا تھا۔ وہ ایک نظریاتی ضابطہ کی شکل میں آیا جو اگرچہ مجمل حیثیت میں تھا مگر پوری زندگی پر محیط تھا۔ آتے ہی اس کی بنیاد پر ایک ٹھوس

، جاندار اور متحرک جماعت وجود میں آ گئی۔ جس نے نہ صرف جاہلی معاشرے سے اپنا جداگانہ اور مستقل تشخص قائم کیا بلکہ جاہلیت کے وجود کو بھی چیلنج کر دیا۔ وہ ہرگز عملی وجود سے عاری حالت میں محض ''خیالی نظریہ'' کی صورت میں نہیں اترا تھا۔ اور آئندہ بھی اس کا وجود ایک عملی نظام کے ذریعہ ہی منصۂ شہود آ سکتا ہے۔ جاہلی معاشرے کی تہ بہ تہ ظلمتوں کے اندر اگر از سرِ نو اسلام کی شمع فروزاں کی جائے تو خواہ کوئی دور ہو اور کوئی ملک ہو اس کے بغیر قطعاً چارہ نہ ہوگا کہ پہلے اسلام کے اس مزاج اور فطرت کو لازمی طور پر سمجھ لیا جائے کہ اس کی نشو ونما ایک تحریک اور ایک نامیاتی نظام کے بغیر ہرگز نہ ہو سکے گی۔

اسلام کا اصل نصب العین ''انسانیت'' کا فروغ ہے

اس تفصیل کے بعد یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ اسلام جب مذکورہ کے مطابق عقیدہ الوہیت کی بنیاد پر ایک مسلم امت کی داغ بیل ڈالتا ہے، اور اسے ایک وحدت پسندانہ متحرک جماعت کے سانچے میں ڈھالتا اور عقیدہ کو اس جماعت کا واحد سر رشتہ قرار دیتا ہے تو اس تمام جدوجہد سے اس کا منتہائے مقصود درحقیقت یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کی ''انسانیت'' کو بیدار اور اجاگر کرے، اُسے پروان چڑھائے، اسے طاقتور اور بالاتر کرے، اور انسان کے وجود میں پائے جانے والے تمام پہلوؤں پر اسے غالب کرے۔ چنانچہ وہ اپنے جامع اور ہمہ گیر نظام کی وساطت سے اسی مقصدِ جلیل کی تکمیل کے درپے رہتا ہے، اس کے اساسی ضابطے، اس کی جملہ ہدایات، اس کے تمام احکام وشرائع سب کا ھدف یہی مقصد ہوتا ہے۔

انسان اپنے بعض اوصاف وخصائل میں حیوانات بلکہ جمادات کے ساتھ اشتراک رکھتا ہے۔ چنانچہ ان اوصاف وخصائل نے ''سائنٹفک جہالت'' کے علمبرداروں کو کبھی تو اس وہم میں ڈال دیا کہ دوسرے حیوانات کی انسان بھی ایک حیوان ہے، اور کبھی انہیں اس خام خیالی میں مبتلا کر دیا کہ انسان جمادات ہی کی ایک قسم ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان حیوانات اور جمادات کے ساتھ بعض باتوں میں اشتراک کے باوجود کچھ ایسے خصائص بھی رکھتا ہے جو اسے دونوں سے ممیّز کرتے ہیں، اور اسے ایک منفرد مخلوق کی

حیثیت عطا کرتے ہیں ۔''سائنٹفک جہالت'' کے علمبرداروں نے بھی بالآخر اس حقیقت کا اعتراف کرلیا ہے۔دراصل ناقابل تردید حقائق نے ان کی گردن اس طرح دبوچ لی ہے کہ وہ کائنات کے اندر انسان کی امتیازی حیثیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں ۔مگر بایں ہمہ ان کا یہ اعتراف نہ مخلصانہ ہے اور نہ دوٹوک (ان لوگوں میں پیش پیش جدید ڈارون ازم کے داعی جولین ہکسلے ہیں)۔

''انسانیت'' کو فروغ دینے کے نتائج

اس مسئلے میں اسلام کے پاکیزہ نظام حیات نے جو خدمت سرانجام دی ہے اس کے نہایت درخشاں اور محسوس نتائج برآمد ہوئے ۔اسلام نے نسل ورنگ ،زبان ووطن ،مادی مصلحتوں اور جغرافیائی حد بندیوں کی گھٹیا عصبیتوں اور کمزور رشتوں کو پامال کر کے صرف عقیدہ ودین کے رشتہ پر اسلامی معاشرہ کی بناڈالی ۔اس معاشرے کے اندر انسان اور حیوان کے مشترک خصائص کے بجائے صرف انسانی خصائص کو ابھارا ان کی آبیاری کی اور غالب وبرتر کر دیا۔اس کارنامۂ عظیم کے جو درخشاں اور محسوس نتائج برآمد ہوئے ان میں سے ایک اہم نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی معاشرہ ایک ایسا وسیع الظرف اور کھلا معاشرہ بن گیا جس میں ہرنسل ،ہرقوم ،ہرزبان اور ہررنگ کے افراد داخل ہوسکتے تھے۔اس میں فضول اور حیوانی خصوصیت کی حامل حد بندیوں کا نام ونشان نہ تھا۔اس کے بحر بیکراں میں تمام انسانی نسلوں کی اعلیٰ تر صلاحتیوں اور بوقلموں قابلیتوں کی ندیاں آکر گرتی رہیں ۔اور باہم خلط ملط ہوتی رہیں ۔اوران کے امتزاج سے ایک ایسا اعلیٰ درجہ کا مرکب تیار ہوا جس کی عمر اگرچہ نسبتاً کم تھی مگر اس نے دنیا کے اندر ایک ایسی خیرہ کن اور عظیم تہذیب کو جنم دیا، جس نے اپنے دور کی تمام انسانی صلاحیتوں اور انسانی فکرودانش کا نچوڑ اپنے دامن میں جمع کرلیا تھا۔اس کے باوجود کہ اس دور میں مسافتیں نہایت کٹھن تھیں ،اور مواصلات کے ذرائع ووسائل نہایت سست رفتار تھے۔اس اعلیٰ درجہ کے اسلامی معاشرہ میں عربی ،فارسی ،شامی ،مصری ،مراکشی ،ترکی ،چینی ،ہندی ،رومی ،یونانی ،انڈونیشی ،افریقی الغرض ہرقوم اور ہر

نسل کے جوہر تاباں جمع ہوئے۔ان سب کی خصوصیات یکجا ہوگئیں اور اختلاط باہم، تعاون وتوافق اور ہم آہنگی یکجہتی کے ساتھ انہوں نے اسلامی معاشرے اور اسلامی تہذیب کی تعمیر میں حصہ لیا اور اسے چار چاند لگائے۔ یہ حیرت انگیز تہذیب ایک دن بھی ''عربی تہذیب'' نہ تھی، بلکہ خالصتاً ''اسلامی تہذیب'' کی حیثیت سے متعارف رہی۔ ہرقوم کے افراد اس مساویانہ شان کے ساتھ شریک ہوئے۔محبت اور اخلاص کے مقدس رشتوں نے انہیں باہم منسلک کررکھا تھا،اس کے اندر یہ احساس کوٹ کوٹ کر بھر دیا کہ وہ سب ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس تہذیب کی خدمت کے لیے اپنی انتہائی قابلیتیں صرف کیں،اپنے ممتاز نسلی خصائص کو اجاگر کر کے اسے تہذیب کے قدموں پر نچھاور کیا۔اپنی شخصی تجربات ،قومی خصوصیات اور حاصل تاریخ کو اسی ایک چمن کی آبیاری اور ترقی کے لیے وقف کر دیا جس طرح وہ سب بلاادنیٰ تفاوت منسوب تھے،جن کے اندر انہیں وہ رشتہ باہم جوڑے ہوئے تھا جس کا سرا ان کے پروردگار کے ہاتھ میں تھا۔اور جس میں ان کی ''انسانیت'' بلا روک ٹوک پروان چڑھ رہی تھی یہ وہ نمایاں خوبیاں ہیں جو پوری انسانی تاریخ میں کسی اور انسانی اجتماع کو نصیب نہیں ہوسکیں۔

کیا قدیم معاشروں نے ''انسانیت'' کو فروغ دیا؟

قدیم انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ ممتاز اور مشہور ترین معاشرہ رومن امپائر سمجھا جاتا ہے۔اس معاشرے میں بھی متعدد نسلیں جمع تھیں اور مختلف زبانوں اور متعدد رنگوں اور گونا گوں مزاج کے لوگ جمع تھے۔لیکن ان کا اتحاد اور اجتماع ''انسانی رشتہ'' پر قائم نہ تھا۔اور نہ کوئی اور اعلیٰ تر قدر مثلاً عقیدہ ان کو باہم پیوستہ رکھنے والا تھا۔ بلکہ ان کا یہ اجتماع طبقاتی تقسیم پر قائم تھا۔ایک طرف ''شرفاء'' کا طبقہ تھا اور دوسری طرف ''غلاموں'' کا پوری امپائر انہی دو طبقوں میں منقسم تھی۔علاوہ ازیں نسلی امتیاز بھی اس کے خمیر میں شامل تھا۔جس کی رو سے رومی نسل کو سیادت وتفوق حاصل تھا اور دوسری تمام نسلیں اس کے مقابلے میں

غلاموں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ لہٰذا اس معاشرے کو وہ بلندی نصیب نہ ہو سکی جس تک اسلامی معاشرہ پہنچ گیا تھا اور نتیجتاً وہ انسانیت کو ان ثمرات و برکات سے بھی بہرہ اندوز نہ کر سکا جن سے اسلامی معاشرے نے اسے مالا مال کیا تھا۔

کیا جدید معاشرے ''انسانیت'' کو فروغ دے سکتے ہیں؟

تاریخ حاضر میں کئی معاشرے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر برٹش امپائر کو لیجئے۔ لیکن وہ بھی رومی معاشرے سے جو اس کا مورث اعلیٰ ہے، مختلف نہیں ہے۔ یہ قومی پیمانے پر لوٹ کھسوٹ کا ایک اجتماع ہے جس کی بنیاد انگریز قوم کی برتری اور ان نو آبادیات کی خون آشامی ہے جن میں برٹش امپائر کا دیو استبداد ناچ رہا ہے۔ دوسری یورپین سلطنتوں کا بھی یہی حال ہے۔ اسپین اور پرتگال کی آنجہانی سلطنتیں، فرانسیسی امپائر، ان سب کا ایک ہی ڈھنگ رہ چکا ہے۔ سب کی سب ظالمانہ نظام کی علمبردار اور پست سطح کی بادشاہتیں تھیں۔

کمیونزم نے بھی ایک نرالے طرز کا معاشرہ قائم کرنا چاہا اور ان دیواروں کو مسمار کرنے کا دعوٰی کیا جو رنگ و نسل، قوم و وطن اور جغرافیہ نے چن رکھی تھیں۔ لیکن اس اجتماع کی تعمیر بھی ''انسان دوستی'' کی ہمہ گیر نیو پر نہیں کی گئی۔ بلکہ ''طبقاتی تقسیم'' کو بنائے اجتماع قرار دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے کمیونسٹ معاشرہ قدیم رومی معاشرہ ہی کا دوسرا رخ ہے۔ رومی معاشرہ طبقۂ شرفاء کو امتیاز دیتا تھا، اور کمیونسٹ عمال طبقۂ عمال (پرولتاریہ) کو یہ امتیاز دیتا تھا، اور اس کی تہ میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ دوسرے تمام طبقوں کے خلاف حسد و بغض کا جذبہ ہے۔ اس قسم کا کم ظرف اور کینہ توز معاشرہ اس کے سوا اور کوئی پھل نہیں دے سکتا کہ وہ انسان کے ادنیٰ جذبات کو بھڑکائے۔ وہ اپنی داغ بیل ہی اس بات پر ڈالتا ہے کہ انسان کے اندر صرف حیوانی اور سفلی اوصاف کو برانگیختہ کرے اور ان کو خوب پالے پوسے، اور ان کو زیادہ سے زیادہ طاقت ور بنائے۔ اس لیے کہ اس کی نگاہ میں انسان کی بنیادی مطالبات وہی کچھ ہیں

جو حیوان کے بنیادی تقاضے اور ضرورتیں ہیں۔یعنی غذا، مکان اور جنسی تسکین۔چنانچہ اس کے فلسفہ کی رُو سے پوری انسانی تاریخ روٹی کی تلاش میں سرگرداں رہی ہے۔

اس میدان میں اِسلام یکتا اور منفرد ہے

صرف اسلام ہی وہ ربانی حیات ہے جو انسان کی اعلیٰ ترین خصوصیات کو اوپر ابھار کرلاتا ہے، اور پھر انہیں پوری طرح پرورش کرتا ہے، اور انسانی معاشرے کی تعمیر کے لیے انہیں زیادہ سے زیادہ فروغ دیتا ہے۔اسلام آج تک اس میدان میں یکتا اور منفرد چلا آ رہا ہے۔جو لوگ اس نظام سے منحرف ہو کر کسی اور نظام کے خواہاں ہیں، خواہ وہ نظام قوم پرستی کی بنیاد پر ہو یا وطنیت کی بنیاد پر، رنگ و نسل کو اہمیت دیتا ہو یا طبقاتی کشمکش کا علمبردار ہو ہو یا ان جیسے اور فاسد نظریات کے خمیر سے تیار ہوا ہو وہ لوگ بلاشبہ انسان کے دشمن ہیں۔وہ دراصل یہ نہیں چاہتے کہ انسان اس صفحۂ ہستی پر اپنی ان بلند ترین خصوصیات کے ساتھ نمودار ہو جو اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں سمو رکھی ہیں، اور نہ یہ پسند کرتے ہیں کہ انسانی سوسائٹی تمام انسانی نسلوں کی ہمہ گیر صلاحتیوں اور خوبیوں سے اور ان کے صدیوں کے تجربات سے استفادہ کرے، اور اس غرض کے لیے کوئی مخلوط اور متناسب نظام تجویز کرے۔ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا۝ اَلَّـذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُـمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۝ اُولٰٓـئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَـآئِـهٖ فَـحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْآ اٰيٰتِيْ وَ رُسُلِيْ هُزُوًا۝ (الکھف:۱۰۳-۱۰۶)

اے محمد (ﷺ) ان سے کہو، کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد اور راہ

راست سے بھٹکی رہی اور سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔اس لیے کہ ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے، قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔ان کی جزء جہنم ہے اس کفر کے بدلے جو انہوں نے کیا اور اس مذاق کی پاداش میں جو وہ میری آیات اور میرے رسولوں کے ساتھ کرتے رہے۔

باب چہارم

جہاد فی سبیل اللہ

تحریک جہاد کے مراحل

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے: بعثت سے لے کر وصال تک کفار ومنافقین کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا رویہ کیسا رہا؟۔اس باب میں امام موصوف نے درحقیقت اسلامی جہاد کی تحریک کا خلاصہ بیان کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر جو وحی نازل فرمائی، وہ یہ تھی اقرأ باسم ربك الذی خلق.......... یہ آغاز نبوت تھا۔اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ﷺ اس وحی کو دل میں پڑھا کریں۔دوسروں تک اس کی تبلیغ کا حکم نہیں دیا ۔پھر اللہ نے یہ نازل فرمایا کہ: یا ایھا المدثر قام فانذر اس طرح ''اقرأ'' کی وحی سے اللہ نے آپ کو نبوت عطا فرمائی اور ''یا ایھا المدثر '' کے ارشاد سے آپ ﷺ کو رسالت کا منصب دیا۔بعد میں آپ کو حکم دیا کہ آپ ﷺ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیں۔چنانچہ آنجناب نے پہلے اپنی قوم کو ڈرایا، پھر آس پاس کے عربوں کو ڈرایا۔اور پھر آگے بڑھ کر تمام عربوں کو ڈرایا۔اور پھر بالآخر آپ نے تمام اہل جہان کو ڈرایا۔چنانچہ آپ ﷺ اپنی بعثت کے بعد تقریبا ۱۳ سال تک دعوت وتبلیغ کے ذریعہ لوگوں کو اللہ کا خوف دلاتے رہے۔اس عرصہ میں نہ جنگ کی اور نہ جزیہ لیا

، بلکہ آپ ﷺ کو یہی حکم ملتا رہا کہ ہاتھ روکے رکھیں ،صبر سے کام لیں اور عفو ودرگزر کو شعار بنائیں ۔پھر آپ ﷺ کو ہجرت کا حکم ملا۔اور قتال کی بھی اجازت دی گئی ۔پھر یہ حکم ملا کہ جولوگ آپ ﷺ سے جنگ کریں آپ ﷺ ان سے جنگ کریں ۔اوران لوگوں سے ہاتھ روک لیں جوا لگ تھلگ رہے ہیں اور آپ ﷺ سے جنگ کے لیے نہیں نکلے ۔بعدازاں یہ حکم دیا گیا کہ مشرکین سے جنگ کریں ،یہاں تک کہ دین پورے کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے ۔پھر حکم جہاد آنے کے بعد کفار کی تین قسمیں ہوگئیں :ایک اہل صلح ،دوسرے اہل حرب ،اور تیسرے اہل ذمہ۔جن کفار سے آپ ﷺ کا معاہدہ اور صلح تھی ۔حکم ہوا کہ ان کا معاہدہ پورا کریں ۔اور جب تک وہ خود عہد پر استوار رہیں ان کے معاہدہ کا ایفاء کیا جائے ۔اور اگر ان سے خیانت کا اندیشہ ہوتو اُن کا عہد اُن کے منہ پر دے ماریں۔اور اس وقت تک ان کے خلاف تلوار نہ اٹھائیں جب تک نقضِ عہد کی ان کو اطلاع نہ کردیں ۔اور حکم ہوا کہ عہد شکنی کرنے والوں سے جنگ کی جائے ۔اور جب سورۃ براءت نازل ہوئی تو اس سورہ میں تینوں قسم کے احکام بیان کیے گئے ۔اور یہ واضح کردیا گیا کہ اہل کتاب میں سے جولوگ اللہ اور رسول کے دشمن ہیں ان سے جنگ کریں یہاں تک کہ وہ جزیہ دینا قبول کریں ،یا اسلام میں داخل ہوجائیں ۔کفار اور منافقین کے بارے میں اس سورہ میں بتایا گیا کہ ان کے خلاف جہاد کیا جائے ،اور ان سے سخت برتاؤ کیا جائے ۔چنانچہ آپ ﷺ نے کفار کے ساتھ شمشیر وسنان سے جہاد کیا۔اور منافقین کے ساتھ دلیل وزبان سے ۔اسی سورۃ میں یہ بھی فرمایا گیا کہ کفار کے ساتھ کیے ہوئے اپنے تمام معاہدوں سے اعلان برأت کردیں اور ان کے معاہدے ان کے منہ پر دے ماریں ۔اس سلسلہ میں اہل معاہدہ کی تین قسمیں قرار دی گئیں ۔ایک وہ قسم جس سے قتال کا حکم دیا گیا

۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے خود عہد شکنی کی تھی ۔اور عہد کی پابندی پر قائم نہ رہے تھے ۔آپ ﷺ نے ان سے جنگ کی اور ظفر یاب ہوئے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کے ساتھ آپ ﷺ کے معاہدے ایک معین مدت تک کے لیے تھے۔اور انہوں نے ان معاہدوں کی خلاف ورزی نہیں کی ،اور نہ آپ ﷺ کے خلاف کسی کی مدد دی ۔ان کے بارے میں اللہ نے حکم دیا کہ ان کے معاہدوں کی مدت پوری کریں۔تیسری قسم ان لوگوں کی تھی جن کے ساتھ آپ ﷺ کا کوئی معاہدہ نہ تھا اور نہ وہ آپ ﷺ سے برسر پیکار رہوئے ،یا ایسے لوگ تھے جن کے ساتھ غیر معین عرصہ کے لیے آپ ﷺ کا معاہدہ تھا۔تو ایسے سب لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا کہ انہیں چار ماہ کی مہلت دی جائے ،اور جب یہ مہلت ختم ہو جائے تو ان سے قتال کیا جائے ۔ چنانچہ عہد شکنی کرنے والوں کو قتل کیا گیا،اور جن سے کوئی معاہدہ نہ تھا یا جن کے ساتھ غیر محدود مدت کا معاہدہ تھا انہیں چار ماہ کی مہلت دی گئی۔اور ایفائے معاہدہ کرنے والوں کو مدت معاہدہ کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا۔اس طرح کے تمام لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے ۔اور عرصۂ مہلت کے خاتمہ تک وہ کفر پر قائم نہ رہے۔اہل ذمہ پر جزیہ عائد کر دیا گیا۔الغرض سورۃ برأت کے نازل ہونے کے بعد کفار کے ساتھ آپ ﷺ کے برتاؤ نے مستقل طور پر تین شکلیں اختیار کر لیں ۔محاربین ،اہل عہد،اور اہل ذمہ ،اہل عہد بھی بالآخر اسلام میں شامل ہو گئے ،اور صرف دو قسم کے لوگ رہ گئے :محاربین اور اہل ذمہ،محاربین آپ ﷺ سے خائف رہتے تھے۔اس طرح تمام اہلِ زمین تین شکلوں میں آپ ﷺ کے سامنے آ گئے :ایک مسلمان جو آپ ﷺ پر ایمان لائے ،دوسرے خائفین جو برسر جنگ رہے۔رہا منافقین کے معاملہ میں آپ ﷺ کا اسوہ ،تو آپ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ ﷺ ان کے ظاہر کو قبول کریں اور ان کے

باطن کے حالات کو اللہ پر چھوڑ دیں ،اور علم اور دلیل سے ان کے ساتھ جہاد کریں ۔ان سے روکشی کریں اور شدت کا برتاؤ کریں۔اور قول بلیغ کے ساتھ ان کے دلوں پر اثر ڈالیں ان کا جنازہ پڑھنے سے اور ان کی قبروں پر قیام کرنے سے آپ ﷺ کو منع کردیا گیا۔اور آپ ﷺ کو بتادیا گیا کہ اگر آپ ﷺ ان کے لیے مغفرت بھی طلب کریں گے تو اللہ انہیں معاف نہیں کرے گا۔یہ ہے آپ ﷺ کا اسوہ کافر اور منافق دشمنوں کے بارے میں؟

اس مضمون میں جہاد اسلامی کے تمام مراحل کی بڑی عمدگی سے تلخیص کی گئی ہے۔اس تلخیص میں دین حق کے تحریکی نظام کے امتیازی اور دوررس اوصاف کی جھلک ملتی ہے۔یہ اس قابل ہیں کہ ان کا بغائر نظر مطالعہ کیا جائے لیکن ہم یہاں چند مجمل اشارات ہی سے کام لے سکتے ہیں:

تحریک جہاد کی پہلی امتیازی خصوصیت

دین حق کا پہلا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس دین کا پورا نظام عملی اور حقیقت پسندانہ ہے۔اس کی تحریک واقعہ میں موجود انسانوں کو پکارتی ہے،اور ان وسائل وذرائع سے کام لیتی ہے جو انسان کے عملی حالات کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں۔چونکہ اس تحریک کا مقابلہ ایک ایسی جاہلیت سے ہوتا ہے جو ایک طرف خیالات اور عقائد پر قابض ہوتی ہے۔دوسری طرف اس کی بنیاد پر زندگی کا عملی نظام قائم ہوتا ہے۔اور تیسری طرف اسے اور اس کے قائم کردہ نظامِ زندگی کی پشت پناہی کے لیے سیاسی اور مادی اقتدار موجود ہوتا ہے اس لیے اسلامی تحریک کو جاہلیت کا مقابلہ کرنے کے لیے متوازی وسائل واسباب بروئے کار لانا پڑتے ہیں۔یہ تحریک خیالات وعقائد کی اصلاح کے لیے دعوت وتبلیغ کو ذریعہ بناتی ہے ،جاہلی نظامِ زندگی اور اس کے پشت پناہ اقتدار کے ازالہ کے لیے مادی طاقت اور جہاد سے کام لیتی ہے۔کیوں کہ یہ نظام اور یہ اقتدار عامۃ الناس کے عقائد وخیالات کی اصلاح کی کوشش میں حائل ہوتا

ہے اور اپنے وسائل اور گمراہ کن ہتھکنڈوں کے ذریعہ اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہے، اور ان کو اپنے ربّ جلیل کے بجائے انسانوں کے آگے جھکا دیتا ہے۔ یہ تحریک مادی اقتدار سے نبرد آزمائی میں محض دعوت وتبلیغ پر ہی اکتفاءنہیں کرتی، اور نہ عام انسانوں کے افکار کو بدلنے کے لیے جبر واکراہ اور قوت کا استعمال مناسب سمجھتی ہے۔ یہ دونوں اصول اس دین حق کے طریقِ کار میں یکساں طور پر اہمیت رکھتے ہیں اور یکساں طور پر اختیار کیے جاتے ہیں۔ یہ تحریک برپا ہی اس غرض کے لیے ہوتی ہے کہ انسان کو انسان کی غلامی کے جُوئے سے آزاد کر کے اسے اللہ واحد کا بندہ بنائے۔

دوسری امتیازی خصوصیت

اس کا دوسرا امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ ایک عملی تحریک ہے جو مرحلہ بہ مرحلہ ترقی کرتی ہے، اور ہر مرحلے میں اپنی عملی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق متوازی اور موزوں وسائل اختیار کرتی ہے۔ ہر مرحلہ بعد میں آنے والے مرحلہ کے لیے فضا ہموار کرتا ہے۔ دراصل یہ دین کا تجریدی نظریات سے سامنا نہیں کرتا اور نہ وہ زندگی کے مختلف مراحل وکو جامد اور ناقابل تغیر ذرائع سے طے کرتا ہے۔ جو لوگ دین کے نظام جہاد پر گفتگو کرتے ہوئے قرآنی نصوص کو بطور استدلال پیش کرتے وقت دین کے اس امتیازی وصف کا لحاظ نہیں کرتے، اور نہ ان مراحل کی فطرت وحقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں جن سے تحریکِ جہاد گزری ہے، اور نہ ان کی نظر اس پہلو پر ہوتی ہے کہ مختلف نصوص کا ہر ہر مرحلہ سے کیا تعلق ہے، تو اس طرح کے لوگ جب اسلام کے نظام جہاد پر کلام کرتے ہیں تو بات کو نہایت بھونڈے طریقے سے خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اور دین کے نظامِ جہاد کو گمراہ کن انداز سے بیان کرتے ہیں۔ اور آیاتِ قرآنی کو زبردستی کھینچ تان کر ان میں سے ایسے اصول اور قواعد کلیّہ اخذ کرتے ہیں جن کی ان آیات میں قطعاً گنجائش نہیں ہوتی۔ ان کی غلطی کی بنیاد یہ ہے کہ وہ قرآن کی ہر آیت کے بارے میں یہ خیال کرتے ہیں کہ یہی آخری اور کلی نص ہے۔ اور اس دین کا آخری اور کلّی حکم بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ گروہِ مفکرین

دراصل ان مایوس کن حالات کے دباؤ کے سامنے روحانی اور عقلی طور پر ہتھیار ڈال چکا ہے، جس میں اس وقت موجودہ مسلمان نسل مبتلا ہے اور جس کے پاس سوائے اسلام کے لیبل کے کچھ اور باقی نہیں رہ گیا ہے۔ یہ اسی شکست خوردہ ذہنیت کا اثر ہے کہ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ: ''اسلام صرف مدافعانہ جنگ کا قائل ہے''۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ وہ اس گمان میں مبتلا ہیں کہ انہوں نے اس تاویل سے دین پر بڑا احسان کیا ہے۔ حالانکہ اس غلط تاویل سے وہ دین کو اپنے امتیازی طریقِ کار سے دستبردار ہو جانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ گویا دین اپنا یہ نصب العین چھوڑ دے کہ وہ روئے زمین سے تمام طاغوتی طاقتوں کو مٹانے کے لیے آیا ہے، انسانیت کا سر صرف اللہ واحد کے آگے خم کرنے کے لیے آیا ہے، انسانوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر بندوں کے پروردگار کی غلامی میں داخل کرنے کے لیے آیا ہے۔ لیکن اسلام اپنا یہ نصب العین سرانجام دینے کے لیے لوگوں سے بزور شمشیر اپنا عقیدہ نہیں منواتا، بلکہ وہ لوگوں کے لیے انتخاب عقیدہ کی آزادی فراہم کرتا ہے۔ وہ برسرِ اقتدار سیاسی نظاموں کو کلیتاً مٹا دیتا ہے یا انہیں زیرِ نگیں کر کے جزیہ قبول کرنے اور سرِ اطاعت خم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس طرح وہ کوئی ایسی رکاوٹ باقی نہیں رہنے دیتا جو اس عقیدہ کو ماننے کی راہ میں لوگوں کے سامنے حائل ہوتی ہو۔ اس کے بعد وہ لوگوں کو مکمل آزادی دیتا ہے کہ چاہے تو وہ اس عقیدہ کو قبول کریں یا نہ کریں۔

تیسری امتیازی خصوصیت

تیسرا امتیازی وصف یہ ہے کہ دین کی یہ سخت کوش اور رواں دواں تحریک، اور اس کے نو بنو وسائل دین کو اس کے بنیادی اصول و مقاصد سے دور نہیں کرتے۔ دین نے روزِ اوّل ہی سے، خواہ وہ رسول کے قریبی رشتہ داروں سے ہم کلام ہو، یا قریش سے خطاب کر رہا ہو، یا سب عربوں کی طرف اس کا روئے سخن ہو، یا تمام دنیا کے باشندے اس کے مخاطب ہوں اس نے سب سے ایک ہی بنیاد پر گفتگو کی ہے۔ وہ سب سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ انسانوں کی بندگی سے نکل کر صرف اللہ واحد کی بندگی کے لیے

یکسو ہو جائیں۔اس اصول پر وہ کوئی سودا بازی نہیں کرتا،اور نہ کسی لچک کو گوارا کرتا ہے۔پھر وہ اس یکتا مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایک لگے بندھے منصوبے پر عمل پیرا ہو جاتا ہے، یہ منصوبہ چند معین مراحل پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر مرحلہ کے لیے متوازی اور نئے وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں۔جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں۔

چوتھی امتیازی خصوصیت

چوتھا امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ دین مسلم معاشرے اور دیگر معاشروں کے باہمی تعلقات کو باقاعدہ قانونی شکل دیتا ہے۔جیسا کہ زادالمعاد کی مذکورہ تلخیص سے واضح ہوتا ہے۔یہ قانونی ضابطہ جس بنیاد پر قائم ہے وہ یہ ہے کہ ''اسلام'' (اللہ کی فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کا رویہ اختیار کرنا) ایک عالم گیر حقیقت ہے جس کی طرف رجوع کر لینا انسانیت پر لازم ہے،اور اگر وہ اس کی طرف رجوع نہ کرے اور اسے اختیار نہ کرے تو اسے چاہیئے کہ وہ اسلام کے ساتھ بالجملہ مصالحت کا موقف اختیار کرے،اور کسی سیاسی نظام یا مادی طاقت کی شکل میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے آگے کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کرے۔وہ ہر فرد کو آزاد چھوڑ دے تا کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے اُسے اختیار کرے یا نہ اختیار کرے اور اگر اسے اختیار نہ کرنا چاہے تو اس کی مزاحمت بھی نہ کرے اور دوسروں کے لیے سدِّ راہ نہ بنے۔اگر کوئی شخص مزاحمت کا رویہ اختیار کرے تو اسلام کا فرض ہوگا کہ وہ اس سے جنگ کرے یہاں تک کہ اسے موت کے گھاٹ اتار دے یا پھر وہ وفاداری اور اطاعت کا اعلان کر دے۔شکست خوردہ اور مرعوب ذہنیت کے ادیب ''اسلام میں جہاد کی حقیقت'' کے موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہیں اور دامن اسلام سے جہاد کا ''دھبہ'' دھونے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ دو باتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں۔ایک دین کا یہ رویہ کہ وہ عقیدہ کو جبراً ٹھونسنے کی مخالفت کرتا ہے جیسا کہ نص قرآنی (لَا اِکْـــرَاہَ فِـــی الـدِّین) سے عیاں ہے۔اور دوسرا دین کا یہ طریقِ کار کہ وہ ان تمام سیاسی اور مادی قوتوں کو نیست و نابود

کرتا ہے جو عقیدۂ دین اور انسانوں کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہوتی ہیں، اور جو انسان کو انسان کے سامنے سرافگندہ کرتی ہیں، اور اسے اللہ کی عبودیت سے روکتی ہیں۔ یہ دونوں اصول بالکل الگ الگ ہیں، ان کا باہم کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ دونوں کو باہم گڈ مڈ کرنے کی کوئی گنجائش ہے۔ بایں ہمہ یہ لوگ اپنی شکست خوردہ ذہنیت سے مجبور ہو کر خلط مبحث کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسلام میں جہاد کو صرف اس مفہوم میں محصور کر دیا جائے جسے آج ''دفاعی جنگ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلامی جہاد ایک جداگانہ حقیقت ہے، عہد حاضر کی انسانی جنگوں سے اس کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے، نہ اسباب جنگ کے لحاظ سے اور نہ جنگ کے ظاہری رنگ ڈھنگ کے لحاظ سے۔ اسلامی جہاد کے اسباب خود اسلام کے مزاج اور دنیا میں اس کے اصل کردار کے اندر تلاش کرنے چاہئیں، اور ان اعلیٰ اصولوں کے اندر تلاش کرنے چاہئیں جو اللہ تعالیٰ نے اس دین کے لیے مقرر فرمائے، اور جنہیں بروئے کار لانے کے لیے رسول اللہ ﷺ کو رسالت کے منصب پر سرفراز فرمایا، اور پھر آپ کو خاتم النبیین اور آپ کی رسالت کو خاتم الرسالات کا درجہ قرار دیا ہے۔

اسلام انسان کی آزادی کا اعلانِ عام ہے

دین حق دراصل اس عالمگیر اعلان کا نام ہے کہ دنیا میں انسان، انسان کی غلامی سے، اور خود نفس کی غلامی سے جو انسانی غلامی ہی کی ایک شکل ہے، آزاد ہو، یہ اعلان دراصل اس اعلان کا طبعی نتیجہ ہے کہ الوہیت کا مقام صرف اللہ واحد کے لیے مخصوص ہے اور اس کی شان ربوبیت تمام اہل جہان کو محیط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کہ دین حاکمیتِ انسان کی ہر نوعیت، ہر شکل، ہر نظام، اور ہر حالت کے خلاف ہمہ گیر اور کلی انقلاب، اور روئے زمین پر قائم شدہ ہر اس ہیّت کے خلاف مکمل بغاوت کرتا ہے جس میں کسی شکل میں بھی حکمرانی انسان کے ہاتھ میں ہو۔ یا دوسرے الفاظ میں الوہیت کا مقام انسان نے کسی نہ کسی صورت میں حاصل کر رکھا ہو۔ ایسا نظام حکمرانی جس میں معاملات کا آخری رجوع انسان کی

طرف ہوتا ہو،اور انسان ہی اختیارات کا منبع ہوں،انسانوں کو درحقیقت الوہیت کا درجہ دیتا ہے،اور بعض انسانوں کو اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے لیے ارباب من دون اللہ ٹھہراتا ہے۔مگر جب یہ اعلان کر دیا گیا کہ ربوبیت اور الوہیت صرف اللہ واحد کے لیے مخصوص ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا غصب شدہ اقتدار غاصبین سے لے کر دوبارہ اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے۔اور ان غاصبین کو نکال باہر کیا جائے جو خانہ ساز شریعتوں کے ذریعہ انسانوں کی گردنوں پر تخت بچھاتے ہیں،خود کو ان کے لیے رب کا مقام دیتے ہیں اور انہیں اپنے غلاموں کا درجہ دیتے ہیں۔مختصر لفظوں میں اللہ کی الوہیت اور ربوبیت کا آوازہ بلند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ساری انسانی بادشاہتوں کو لپیٹ دیا جائے۔یا قرآن کریم کے الفاظ میں یہ اعلان کر دیا جائے:

وَ هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ. (زخرف:٨٤)

وہی اکیلا آسمان میں بھی اللہ ہے اور زمین میں بھی اللہ ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ. (یوسف:٤٠)

حکم صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو،یہی دین حق ہے۔

قُلْ یٰٓاَهْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ.(یوسف:٦٤)

کہہ دیجیے،اے اہل کتاب،آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے،یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں،اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو اللہ کی بندگی

کرنے والے ہیں۔

دنیا میں حکومت الٰہیہ کیسے قائم ہوسکتی ہے

دنیا میں اللہ کی بادشاہت کے قیام کی یہ صورت نہیں ہے کہ مسند حاکمیت پر کچھ ''مقدس افراد'' (یعنی دینی رہنما) فروکش ہوجائیں، جیسا کی چرچ کی بادشاہت کا حال تھا اور نہ یہ درست ہے کہ دیوتاؤں کے کچھ ''نمائندے'' زمام حاکمیت ہاتھ میں لے لیں جیسا کہ تھیوکریسی یا ''خدا کی مقدس حکومت'' کے نام سے کیے جانے والے نظام میں رائج تھا۔ اللہ کی بادشاہت کا قیام یہ ہے کہ اللہ کی شریعت حکمرانی کرے اور تمام معاملات کا آخری فیصلہ اس کے مطابق کیا جائے۔ لیکن یہ پیش نظر رہے کہ دنیا میں اللہ کی بادشاہت کا قیام، انسان کی بادشاہت کا خاتمہ، غاصبین کے ہاتھوں سے اقتدار چھین کر اللہ کی طرف اسے لوٹانا ، شریعت الٰہی کی فرماں روائی، انسانی قوانین کی تنسیخ یہ سب مہمیں مجرد دعوت وتبلیغ سے انجام نہیں پاسکتیں ۔ جو لوگ خلق اللہ کے گردنوں پر سوار ہیں اور انہوں نے اقتدارِ خداوندی پر غاصبانہ تسلط قائم کر رکھا ہے یہ نری تبلیغ اور اپیل سے اپنے تختِ اقتدار سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اگر ایسا ہی معاملہ ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کے لیے دنیا کے اندر دین حق کی سرفرازی نہایت سہل اور خوش گوار کام ہوتا۔ لیکن انبیاء کی تاریخ سے جو کچھ واضح ہوتا ہے اور دین حق کی صدیوں پر پھیلی ہوئی داستان جس حقیقت کی نشان دہی کرتی ہے وہ اس کے برعکس ہے۔

اتنا اہم اعلان کہ الوہیت اور ربوبیت صرف اللہ رب العالمین کے مخصوص ہے، اور پھر اس اعلان کا یہ اہم نتیجہ کہ انسان اللہ کے ماسوا ہر قسم کے اقتدار اور حاکمیت سے آزاد ہوگا یہ کوئی محض نظریاتی ، فلسفیانہ اور منفی نوعیت کا اعلان نہ تھا۔ بلکہ یہ مثبت تحریکی دعوت تھی جس کے پیش نظر ایک ایسے نظامِ زندگی کو عملاً بروئے کار لانا تھا جو شریعت الٰہی کے مطابق انسانوں پر حکمرانی کرے، اور انہیں عملی طاقت سے انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ واحد لاشریک کے حلقۂ بندگی میں داخل کرے۔ ظاہر ہے کہ اتنے اہم

مشن کوسرانجام دینے کے لیے ضروری تھا کہ یہ اعلان مجرد تبلیغ ودعوت تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تحریک کا قالب بھی اختیار کرے تاکہ عملی صورتِ حال کے ہر ہر پہلو کا مقابلہ متوازی اور عملی وسائل وذرائع سے ہوسکے۔

انسان نے ہر دور میں----دور ماضی میں بھی، عہد حاضر میں بھی اور شاید عالم فردا میں بھی----دین حق کا طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے مقابلہ کرکے اسے نیچا دکھانے کی کوششیں کی ہیں کیونکہ یہ دین انسانوں کو غیر اللہ کی آقائی سے آزاد کرتا ہے۔ چنانچہ انسانوں نے اس دین کے راستے میں فکری اور مادّی ہر طرح کی رکاوٹیں کھڑی کیں۔ سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی دیواریں حائل کیں، نسلی اور طبقاتی نعرے استعمال کیے۔ انسان کے منحرف عقائد اور باطل تصورات بھی مذکورہ عوامل کے پہلو بہ پہلو کام کررہے تھے۔ اوران دونوں کے اتحاد سے انتہائی پیچیدہ صورت حال ظہور پذیر ہوتی رہی ہے۔
اگر ''تبلیغ'' عقائد اور تصورات کی اصلاح کرتی تو ''تحریک'' دوسرے مادّی سنگہائے راہ کو صاف کرتی ہے، جن میں سرفہرست وہ سیاسی قوت ہے جو پیچیدہ مگر مربوط فکری، نسلی، طبقاتی، اجتماعی اور اقتصادی سہاروں پر قائم ہوتی ہے۔ اور یہ دونوں---تبلیغ اور تحریک---مل کا قائم شدہ نظام پر چاروں طرف سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اوران تمام عوامل واسباب کے ساتھ اپنے نئے نظام کو بروئے کار لانے میں ممدّ ہوتے ہیں اوراس غرض کے لیے ہر مخالف عامل کا اس کے ہم پلہ عوامل اور وسائل سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اس زمین پر انسان کی حقیقی آزادی بلکہ پوری دنیا میں پوری انسانیت کی حقیقی آزادی کا عظیم مشن سرانجام دینے کے لیے ان دونوں کو (یعنی تبلیغ اور تحریک کو) دوش بدوش کام کرنا ہوتا ہے۔ یہ نہایت اہم نقطہ ہے جسے بار بار ذہن نشین کرنا نہایت ضروری ہے۔

عبودیت کی اصل حقیقت

یہ دین صرف عربوں کی آزادی کا اعلان نہیں ہے۔ اور نہ اس کا پیغام صرف عربوں تک محدود ہے۔ اس

دین کا موضوع انسان پوری نوع انسانی اور اس کا دائرہ کار زمین پوری روئے زمین ہے۔اللہ تعالیٰ صرف عربوں کا پروردگار نہیں ہے۔حتٰی کہ اُس کی ربوبیت ان لوگوں تک ہی محدود نہیں ہے جو عقیدہ اسلام کو ماننے والے ہیں۔اللہ تعالیٰ تمام اہلِ جہاں کا رب ہے۔یہ دین تمام اہلِ جہان کو ان کے رب کی طرف لوٹا نا دینا چاہتا ہے،انہیں عبودیت غیر اللہ کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتا ہے۔اسلام کی نگاہ میں اصل عبودیت یہ ہے کہ انسان ایسے قوانین کا طوق اپنے گلے میں ڈالے جو خود اُس جیسے انسانوں نے ہی وضع کیے ہوں۔اور یہی وہ ''عبادت'' و بندگی، ہے جس کے بارے میں اس دین نے فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص رہے گی۔جو شخص غیر اللہ کے آگے اس عبادت کو بجالاتا ہے،وہ چاہے دینداری کا لاکھ دعوٰی کرے مگر وہ دین سے خارج ہو جاتا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے صاف الفاظ میں یہ فرمایا کہ رائج الوقت قانون اور حکومت کی اطاعت ''عبادت'' کا دوسرا نام ہے۔عبادت اس مفہوم کی رُو سے جب یہود اور نصارٰی نے خدائے واحد کی ''عبادت'' سے روگردانی کی تو وہ ''مشرکین'' شمار کیے گئے۔

ترمذی نے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب اُن (عدی بن حاتم) تک رسول اللہ ﷺ کی دعوت پہنچی تو وہ شام بھاگ گئے۔کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں انہوں نے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔مگر اُن کی بہن اور قبیلے کے چند لوگ قیدی بنالیے گئے۔رسول اللہ ﷺ نے ان کی بہن پر احسان فرمایا (اور انہیں بلا فدیہ آزاد کر دیا)،اور کچھ عطیہ دے کر انہیں واپس کر دیا۔وہ اپنے بھائی کے پاس آئیں اور اُن کو اسلام کی ترغیب دی،اور بارگاہ رسالت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا۔چنانچہ عدی تیار ہو گئے۔مدینہ میں لوگوں کے اندر عدی کی آمد کا چرچا ہوا۔جب وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے حاضر ہوئے تو ان کے گلے میں چاندی کی صلیب تھی۔رسول اللہ ﷺ اس وقت یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے:اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللّٰہ (اہل کتاب نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کو چھوڑ جر اپنا رب ٹھیرالیا) عدی کہتے ہیں: میں نے عرض کی: وہ راہبوں کی عبادت نہیں کرتے،آنجناب

ﷺ نے فرمایا: جس چیز کو ان کے علماء اور راہبوں نے حلال کیا اسے وہ حرام تسلیم کر لیتے تھے۔ اور یوں وہ اپنے علماء اور راہبوں کی عبادت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے اس صریح ارشاد کی جو تشریح رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے وہ اس بارے میں نص قطعی ہے کہ کسی غیر الٰہی قانون اور حکومت کی پیروی ایک عبادت ہے۔ اور اس کے ارتکاب کے بعد مسلمان دین کے دائرہ سے نکل جاتا ہے۔ اس نص سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ غیر اللہ کی عبادت سے مراد یہ ہے کہ بعض انسان بعض دوسرے انسانوں کو اربـاب مـن دون اللّٰہ ٹھہرالیں۔ دین حق اسی منکر کو نیست و نابود کرنے کے لیے آیا ہے۔ اور اس کا اعلان ہے کہ اس خطۂ زمین پر بسنے والے انسانوں کو غیر اللہ کی عبودیت سے آزاد ہونا چاہیے۔

اسلامی دعوت اور تحریک دونوں پہلوؤں سے برپا ہو

اگر انسان کی عملی زندگی اسلام کے مذکورہ اعلانِ آزادی کے خلاف پائی جاتی ہو تو اس صورتِ حال کے ازالہ کے لیے ناگزیر ہے کہ اسلام بیک وقت تبلیغ (بیان) اور تحریک (حرکت) دونوں پہلوؤں سے میدان میں اترے۔ اور اُن سیاسی طاقتوں پر کاری ضربیں لگائے جو انسانوں کو غیر اللہ کی چوکھٹ پر سرافگندہ کرتی ہیں۔ اور اللہ کی شریعت سے بے نیاز ہو کر ان پر حکمرانی کرتی ہیں۔ اور اسلام کی دعوت کو لوگوں کے کانوں تک پہنچنے نہیں دیتیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ عقیدۂ اسلام کا انتخاب بھی کرنا چاہیں تو بھی انہیں یہ آزادی نہیں ہوتی کہ وہ برسر اقتدار طاقت سے بے خوف اور بے نیاز ہو کر اسے قبول کر سکیں۔ تبلیغ اور تحریک دونوں حیثیتوں سے اسلام کا رُوبکار آنا اس لیے بھی ضروری ہے تا کہ اسلام طاغوتی اقتدار سے ملکِ اللہ کو پاک کرنے کے بعد چاہے وہ نرا سیاسی نوعیت کا ہو، اور چاہے اُس نے نسیّت کا لبادہ پہن رکھا ہو یا ایک ہی نسل کے اندر طبقاتی امتیازات پیدا کر رکھے ہوں، ایک ایسا نیا معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی نظام قائم کر سکے جو تحریکِ آزادئ انسان کو عملی جامہ پہنائے اور دنیا کے اندر اُسے فروغ دینے میں ممدّ و معاون ہو۔

اسلام کے نزدیک آزادئ انسان کا مطلب

اسلام کا ہرگز یہ منشاء نہیں ہے کہ وہ لوگوں پر زبردستی اپنا عقیدہ ٹھونسے۔مگر یہ بھی واضح ہے کہ اسلام کسی مجرد عقیدہ کا نام نہیں ہے۔جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ہے اسلام انسانوں کی غلامی سے انسان کو آزاد کرانے کا ایک عالم گیر اعلان ہے۔اس کی دعوت کا آغاز ہی اس نصب العین سے ہوتا ہے کہ وہ ایسے تمام نظاموں اور حکومتوں کو ختم کرنا چاہتا ہے، جو انسانوں کی گردنوں پر انسانوں کی حاکمیت کا تخت بچھاتی ہیں اور انسانوں کو انسانوں کا غلام بناتی ہیں۔جب وہ لوگوں کی گردنوں کو انسانی حاکمیت کے سیاسی دباؤ سے چھڑا دیتا ہے اور ان کے سامنے انسان کی روح و عقل کو منور کر دینے والی دعوت پیش کر دیتا ہے تو پھر انہیں آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ وہ جس عقیدہ اور نظریہ کو چاہیں اپنی آزاد مرضی سے اختیار کر لیں۔لیکن اس آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنی اہواء و اغراض کو الٰہ بنالیں یا وہ خود فیصلہ کر لیں کہ وہ انسانوں کی غلامی میں رہیں گے اور ایک دوسرے کو اپنا رب بنائیں گے۔دنیا کے اندر حکمرانی کا جو نظام بھی قائم ہو وہ بندگیٔ رب کی بنیاد پر قائم ہونا چاہیئے۔اور قوانین حیات کا ماخذ صرف اللہ کی ذات ہونی چاہیئے تا کہ اس اصولی نظام کے سائے میں ہر فرد کو آزادی ہو کہ وہ جس عقیدہ کو چاہے قبول کرے۔یہی صورت ہے جس میں دین یعنی قانون، سرافگندگی، اطاعت اور بندگی صرف اللہ کے لیے خالص ہوسکتی ہے۔دین کا مفہوم عقیدہ کے مفہوم سے زیادہ وسیع اور جامع ہے۔دین اُس نظام اور طریقِ عمل کا نام ہے جو انسانی زندگی کو اس کی وسعتوں سمیت اپنے قبضۂ اقتدار میں لاتا ہے۔اسلام میں اس نظام کا تمام تر اعتماد عقیدہ پر ہوتا ہے۔مگر اس کی گرفت کا دائرہ عقیدہ سے زیادہ وسیع ہے۔چنانچہ اسلامی نظام حکومت کے اندر اس امر کی گنجائش ہے کہ اس میں ایسی متعدد آبادیاں پائی جائیں جو اسلام کے مُلکی قانون کی (جو اللہ کی بندگی پر استوار ہوتا ہے) وفادار تو ہوں مگر انہوں نے اسلام کو عقیدہ کی حیثیت سے تسلیم نہ کیا ہو۔

کیا اسلام ''دفاعی تحریک'' ہے؟

جو شخص دین کے اس مخصوص مزاج کو، جس کی تشریح ہم اوپر کر آئے ہیں، اچھی طرح سمجھ لیتا ہے وہ خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ اسلامی تحریک کا آغاز دونوں صورتوں میں ہونا ناگزیر ہے: یعنی جہاد بالسیف کی صورت میں بھی، اور جہاد بالقول کی صورت میں بھی۔ اور یہ حقیقت بھی اس پر عیاں ہو جائے گی کہ اسلام ان محدود معنی میں ''دفاعی تحریک'' نہیں ہے جو عہد حاضر کی مروجہ اصطلاح: ''مدافعانہ جنگ'' سے متبادر ہوتے ہیں۔ یہ تنگ اور غلط مفہوم دراصل ان حضرات کا تجویز کردہ ہے جو حالات کے دباؤ اور مستشرقین کے عیارانہ حملوں سے شکست کھا کر اسلام کی تحریک جہاد کی یہ تصویر پیش کر رہے ہیں ۔اسلام ایک سیلِ رواں تھا جو اس لیے اٹھا کہ دنیا کے اندر انسان کو حقیقی آزادی سے ہمکنار کرے۔ وہ انسان کی عملی زندگی کے ایک ایک پہلو سے نبرد آزما ہوا۔ اور ہر پہلو کی اصلاح کے لیے اُس نے وہ وسائل اختیار کیے جو اُس کے لیے مناسب اور موضوع تھے۔ اس کی تحریک جہاد متعین مرحلوں سے گزری اور اس نے ہر مرحلے میں نئے اور کارگر وسائل سے کام لیا۔

بالفرض اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اسلام کی تحریکِ جہاد ایک دفاعی تحریک ہے تو پھر ہمیں خود لفظِ ''دفاع'' کے مفہوم کو بدلنا ہوگا اور ''دفاع'' سے مراد ''انسان کا دفاع'' لینا ہوگا۔ یعنی ان تمام محرکات واسباب کے مقابلے میں انسان کی مدافعت کرنا جو انسان کی آزادی کو پامال کرتے ہیں یا اس کی حقیقی آزادی کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ یہ محرکات جس طرح تصورات اور اعتقادات کی صورت میں پائے جاتے ہیں اسی طرح یہ ایسے سیاسی نظاموں کی شکل میں بھی پائے جا سکتے ہیں جو اقتصادی، طبقاتی اور نسلی حد بندیوں اور امتیازات پر قائم ہوتے ہیں۔ جب اسلام دنیا میں آیا تھا تو اس وقت بھی روئے زمین پر ان محرکات کا دور دورہ تھا۔ اور عہدِ حاضر کی تازہ جاہلیت میں بھی ان کی بعض شکلیں دنیا میں رائج ہیں۔ لفظ ''دفاع'' کا یہ وسیع مفہوم اختیار کر کے ہم با آسانی اُن داعیات کا ادراک کر سکتے ہیں جن کی

بدولت دنیا میں اسلامی تحریک کا طلوع جہاد کے جلو میں ہوا۔ بلکہ اس طرح ہمارے سامنے خود اسلام کا صحیح مزاج بھی آئینہ ہو جائے گا، اور ہمیں یہ سمجھنے میں کوئی دقّت پیش نہ آئے گی کہ اسلام کا مطلب ہے انسان کی بندگیٔ انسان سے آزادی، ربوبیت الٰہی اور تعلیمات ربانی کے سامنے سرافندگی، دنیا میں خواہشاتِ انسانی کی خودسری اور سرکشی کا خاتمہ، اور صرف شریعتِ الٰہی اور اللہ کی حکومت!!

رہی وہ کوششیں جو ایسے دلائل اور وجوہ جو اگھڑنے میں صرف کی جارہی ہیں جن سے اسلامی جہاد کو اُسی محدود اور تنگ مفہوم کا جامہ پہنایا جاسکے جو ''مدافعانہ جنگ'' کی رائج الوقت اصطلاح میں پایا جاتا ہے ، اور وہ دیدہ ریزی جو اس غرض کے لیے ایسی روایات و اسناد کا کھوج لگانے میں کی جاتی ہے، جن سے یہ ثابت ہو سکے کہ جہاد اسلامی کے جتنے بھی وقائع پیش آئے ہیں وہ محض ''وطنِ اسلام'' ان میں سے بعض کے نزدیک وطن اسلام سے مراد جزیرۃ العرب ہی ہے۔ پر ہمسایہ طاقتوں کی جارحیت کے سدِّ باب کے سلسلے میں پیش آئے ہیں۔ ایسی تمام کوششیں دراصل اس امر کی غماز ہیں کہ یا تو دین کے مزاج کو اور دنیا کے اندر اس کے اصل رول کو اسلام کے ان کرم فرماؤں نے سمجھا ہی نہیں اور یا حالات کی سنگینی کے سامنے اور جہادِ اسلامی پر مستشرقین کے عیارانہ حملوں کے مقابلوں میں انہوں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔

کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کو یہ اطمینان ہو جاتا کہ رومی اور فارسی طاقتیں جزیرۃ العرب پر حملہ آور نہ ہوں گی تو وہ اسلام کے سیلِ رواں کو دنیا کے اطراف و اکناف تک پہنچانے کی کوشش نہ کرتے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے کیونکہ اس کے بغیر اسلام کی دعوت کو آگے بڑھایا ہی نہیں جاسکتا تھا کیونکہ اُس کی راہ میں متعدد مادی مشکلات حائل تھیں: مثلاً ریاست کا سیاسی نظام، معاشرے کے نسلی اور طبقاتی امتیازات، اور پھر ان نسلی اور طبقاتی نظریوں کی کوکھ سے جنم لینے والے اقتصادی نظام اور ان کی مخالفت اور پُشت پناہی کرنے والے ریاست کے مادی وسائل۔ یہ سب عوامل راستے کے سنگ ہائے گراں تھے۔

یہ تصور کرنا کتنی بڑی سادہ لوحی ہے کہ ایک دعوت روئے زمین پر بسنے والی پوری نوعِ انسانی کی آزادی کا اعلان بھی کرے اور پھر مذکورہ بالا رکاوٹوں کا سامنا محض زبان و بیان کے جہاد سے کرتی پھرے! بے شک یہ دعوت زبان و بیان سے بھی جہاد کرتی ہے، مگر کب؟ اس وقت جب انسان اس دعوت کو قبول کرنے میں آزاد ہوں۔ چنانچہ یہ دعوت تمام اثرات و موانع سے انسانوں کو آزاد کر دینے کے بعد آزادی کی فضا میں ان سے اپیل کرتی ہے۔ اور ''لا اکراہ فی الدین'' کے ضابطے کی پابندی کرتی ہے۔ لیکن جب مذکورہ بالا مادی اثرات اور رکاوٹوں کی عمل داری ہو تو اس کے بغیر چارہ نہیں ہے کہ پہلے انہیں بذریعہ قوت دور کیا جائے، تاکہ جب یہ دعوت انسان کے دل و دماغ سے اپیل کرے تو وہ ایسی تمام زنجیروں اور بیڑیوں سے آزاد ہوں اور کھلے دل سے اس کی اپیل کے بارے میں اپنا فیصلہ دے سکیں۔

دعوتِ اسلامی کا نصب العین اگر انسان کی آزادی کا فیصلہ کُن اعلان ہے، اور پھر یہ اعلان محض فلسفیانہ اور نظریاتی تشریحات تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ عملی حالات سے نبرد آزما ہونا چاہتا ہے، اور ہر ہر پہلو کا ایسے وسائل سے توڑ کرنا چاہتا ہے جو اس کے لیے موزوں و مؤثر ہوں تو ایسی انقلابی دعوت کے لیے جہاد کا راستہ بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ اور اس کا جہاد سے وہی تعلق ہے جو چولی کا دامن سے ہے، چاہے وطن اسلام اور صحیح اصطلاح میں دارالاسلام امن کی حالت میں ہو اور چاہے اس کے سر پر ہمسایہ طاقتوں کا خطرہ منڈلا رہا ہو۔ اسلام آج امن کے لیے تگ و دو کرتا ہے تو اس کے پیش نظر وہ ''سستا امن'' نہیں ہوتا جس کی تان صرف اس بات پر آکر ٹوٹ جائے کہ اسلام کے نام لیوا جس مخصوص خطۂ ارض میں رہتے ہیں وہ خطرات سے محفوظ و مصؤن ہو جائے۔ اسلام جس امن کا خواہاں ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے اندر دین پورے کا پورا قائم ہو جائے۔ تمام انسان صرف اللہ واحد کی عبودیت بجالائیں۔ اور اللہ کو چھوڑ کر اپنے جیسے انسانوں کو رب نہ ٹھیرائیں۔ عہد نبوت کے بعد اصل اعتبار ان آخری مراحل کا ہے جن تک اسلام کی تحریک جہاد بحکم خداوندی پہنچی ہے۔ دعوت کے ابتدائی مراحل یا درمیانی مراحل

اب معتبر نہیں ہوں گے۔ ابتدائی دور درمیانی مراحل گزر چکے ہیں، اور جیسا کہ امام ابن قیم نے بیان کیا ہے کہ ''بالآخر رسول اللہ ﷺ نے سورۂ براءت کے نازل ہونے کے بعد کفار کے ساتھ جو رویہ اختیار فرمایا اس کی تین شکلیں ہوئیں: ''وہ کفار جو برسر جنگ ہیں، دوسرے وہ جو معاہدین ہیں اور تیسرے اہل ذمہ۔ معاہدین اور اہل صلح بھی جب حلقہ بگوش اسلام ہوگئے تو صرف دو ہی قسم کے کفار رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں رہ گئے ایک محاربین اور دوسرے اہل ذمہ۔ محاربین وہ لوگ ہیں جو آپ ﷺ سے خائف ہیں (اس لیے ان کے ساتھ ہر وقت جنگ کی حالت رہتی ہے)۔ گویا تمام اہلِ جہان آپ ﷺ کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کی رُو سے تین قسموں میں منقسم ہوگئے۔ ایک وہ مسلمان جو آپ ﷺ پر ایمان لائے، دوسرے وہ صلح جُو جن کو آپ ﷺ سے امن ملا (اوران سے مراد اہل ذمہ ہیں جیسا کہ اوپر کی عبارت سے واضح ہے) اور تیسرے محاربین جو آپ ﷺ سے خائف تھے۔''

اس بحث میں کفار کے ساتھ دعوت اسلامی کے رویّے کی جو شکلیں بیان کی گئی ہیں منطقی طور پر یہی شکلیں اس دین کے مزاج اور مقاصد کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں۔ حالات سے شکست خوردہ ذہنیت اور مستشرقین کے حملوں سے بوکھلا جانے والی فکر جہاد کی جو تشریح کرتی ہے منطق و عقل کی رُو سے وہ اس دین کے مزاج سے کوسوں دور ہے۔

جہاد کے تدریجی احکام

مسلمان جب شروع شروع میں مدینہ ہجرت کر کے گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں قتال سے باز رہنے کا حکم دیا اور مسلمانوں سے فرمایا کہ:

كُفُّوا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ آتُوا الزَّكَاةَ.

''اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو''۔

بعد میں انہیں قتال کی اجازت دی گئی اور ارشاد ہوا کہ:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ۝ نِالَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا وَ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ۝ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۝ (الحج:۳۹-۴۱)

''اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ جاری ہے کیوں کہ وہ مظلوم ہیں ۔اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے ،صرف اس قصور میں کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے، اگر اللہ ان لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا تو خانقاہیں اور گرجے اور معابد اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کرڈالی جاتیں۔ اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں۔ اللہ بڑا طاقت ور اور زبردست ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم کریں گے، اور منکر سے منع کریں گے، اور تمام معاملات کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اس کے بعد اگلا مرحلہ آیا جس میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ جو لوگ ان کے خلاف تلوار اٹھائیں وہ بھی ان سے قتال کریں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ. (البقرہ:۱۹۰)

''اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں''۔

اور آخر میں تمام مشرکین کے خلاف عمومی طور پر قتال کو فرض کیا گیا۔ اور حکم ملا کہ:

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَافَّةً. (توبة)

''اور مشرکوں سے سب مل کرلڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں''۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صَاغِرُوْنَ. (التوبة:۲۹)

''جنگ کرو اہل کتاب میں سے اُن لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے، اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں مانتے ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور ذلیل بن کر رہیں''۔

یوں امام ابن قیم رحمہ اللہ کی تصریح کے مطابق پہلے مسلمانوں کو مشرکین اور کفار کے خلاف قتال کرنے سے منع کیا گیا، پھر اس کی اجازت نازل ہوئی، اس کے بعد ان لوگوں کے خلاف قتال کو فرض کیا گیا جو قتال کی ابتداء کریں اور آخر میں تمام مشرکین اور کفار کے خلاف قتال فرض کر دیا گیا۔ جہاد کے بارے میں قرآن کی واضح نصوص، جہاد پر برانگیختہ کرنے والی احادیثِ رسول، صدر اسلام کی اسلامی جنگیں، بلکہ پوری اسلامی تاریخ کا سرگزشتِ جہاد سے لبریز دفتر یہ تمام ایسے واضح اور روشن دلائل ہیں کہ ان کی موجودگی میں مسلمان کا دل جہاد کی وہ تفسیر قبول کرنے سے سخت اِبا کرتا ہے جو ان حضرات کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے جن کا ذہن درحقیقت نامساعد حالات کے دباؤ اور مستشرقین کے مکارانہ پروپیگنڈے سے مات کھا چکا ہے۔ ایسا کون عقل کا دھنی ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے واضح احکام بھی سنے، رسول اللہ ﷺ کے صریح اقوال پر بھی اس کی نظر ہو اور اسلامی فتوحات سے لبریز تاریخ کا دفتر بھی اُس کے سامنے ہو اور پھر وہ اس خام خیالی میں مبتلا ہو جائے کہ جہاد کی پوری اسکیم ایک عارضی ہدایت تھی اور تغیر پذیر حالات اور اسباب کے ساتھ اس کا تعلق تھا اور اس اسکیم کا صرف وہ پہلو دائمی حیثیت رکھتا ہے جو

سرحدوں کی حفاظت سے تعلق رکھتا ہے۔

اِذنِ قتال کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ابتدائی احکام نازل ہوئے ہیں اُن میں سے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اس امر سے آگاہ کر دیا تھا کہ دنیاوی زندگی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ابدی اور مستقل اصول جاری ہے کہ وہ انسانوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع کرتا رہتا ہے تا کہ اللہ کی زمین پر فساد کا قلع قمع ہوتا رہے۔ارشاد ہوتا ہے:

اُذِنَ لِلَّذِيۡنَ يُقَاتَلُوۡنَ بِاَنَّهُمۡ ظُلِمُوۡا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصۡرِهِمۡ لَقَدِيۡرُ ۝ ۙالَّذِيۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ بِغَيۡرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنۡ يَّقُوۡلُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ وَ لَوۡ لَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ لَّهُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذۡكَرُ فِيۡهَا اسۡمُ اللّٰهِ كَثِيۡرًا. (الحج:٣٩-٤٠)

’’اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں ۔اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے۔اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجے اور معابد اور مسجدیں ،جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کر ڈالی جائیں‘‘۔

لٰہذا یہ کشمکش ایک عارضی حالت نہیں ہے بلکہ ابدی اور مستقل جنگ ہے۔ یہ جنگ اس ابدی فیصلے کا لازمی تقاضا ہے کہ روئے زمین پر حق اور باطل دوش بدوش نہیں رہ سکتے۔اسلام نے جب کبھی دنیا میں اللہ کی ربوبیت پر مبنی نظام قائم کرنے کا اعلان کیا ہے اور انسان کو بندگیٔ انسان کی لعنت سے نجات دینے کی تحریک کی ہے تو اللہ کی حاکمیت پر غاصبانہ قبضہ رکھنے والی طاقتیں اس کے خلاف شمشیر برہنہ بن کر کھڑی ہو گئیں اور اُس کے وجود کو کسی قیمت پر بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوئیں۔خود اسلام بھی ان باغیوں کے قلع قمع پر کمر بستہ رہا اور انسانوں کی گردنوں پر سوار ان کے طاغوتی نظام کو مٹاتا رہا۔ چراغ

مصطفوی اور شرار بولہبی کے درمیان یہ ستیزہ کاری ازل سے جاری ہے۔اور جہاد آزادی کا سیلِ رواں بھی اس وقت تک تھم نہیں سکتا جب تک بولہبی ختم نہ ہواور دین پورے کا پورا اللہ کے لیے خالص نہ ہو جائے۔

مکی دور میں جہاد بالسیف کیوں منع تھا؟

مکی زندگی میں قتال سے ہاتھ روکنے کا حکم طویل المیعاد منصوبہ بندی کا محض ایک عارضی مرحلہ تھا۔یہی حکمت ہجرت کے ابتدائی ایاّم میں کارفرما تھی۔لیکن ابتدائی ایاّم کے بعد جب مسلم جماعت جہاد کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تو اس کا محرّک محض مدینہ منورہ کے تحفظ اور دفاع کا احساس نہ تھا۔بلاشبہ یہ تحفظ بھی ناگزیر تھا لیکن یہ اسلامی تحریک کا ایک ابتدائی مقصد یا حیلہ تھا منتہائے مقصود نہ تھا۔اوراس کی روح یہ تھی کہ تحریک کے ''مرکزطلوع'' کوخطرات سے محفوظ رکھا جائے تا کہ کاروانِ تحریک رواں دواں رہے اورانسان کی آزادی کا فریضہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے برابر پیش قدمی کرتا رہے۔اوراُن تمام دیواروں کو ڈھادے، جوآزادیٔ انسان کی راہ میں حائل ہوں۔مکی زندگی میں مسلمانوں کا جہاد بالسیف سے دست کش رہنا قابل فہم اورقرینِ عقل معلوم ہوتا ہے۔اس لیے کہ مکہ میں حریت تبلیغ کا انتظام موجود تھا۔صاحبِ دعوت علیہ الصلوٰۃ والسلام بنو ہاشم کی تلواروں کی حمایت میں تھے۔اوراس وجہ سے آپ ﷺ کو دعوتِ حق کا کھل کر اعلان کرنے کے مواقع مل رہے تھے۔آپ ﷺ اس دعوت کو انسانوں کے گوش گزار کر سکتے تھے،ان کے دل ودماغ سے اپیل کر سکتے تھے اور فرداً فرداً ہر شخص سے مخاطب ہو سکتے تھے ۔وہاں کوئی ایسی منظّم سیاسی طاقت موجود نہ تھی جو تبلیغ ودعوت کی آواز کے سامنے ایسی دیواریں کھڑی کرسکتی کہ افراداُسے سننے سے قطعی محروم ہو جاتے لہٰذااس مرحلہ میں تحریک کے لیے طاقت کے استعمال کی کوئی حاجت نہ تھی۔علاوہ ازیں اور بھی متعدد ایسے اسباب موجود تھے جو اس مرحلہ میں دعوت کو قتال کے بغیر ہی جاری وساری رکھنے کے متقاضی تھے۔ان تمام اسباب کو میں نے بالاختصار اپنی تفسیر ''فی

ظلال القرآن'' میں آیت: الم تر الی الذین کفوا ایدیکم (النساء:۷۷) کی تشریح کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ اس تفسیر کے بعض حصوں کو یہاں نقل کرنا غیر مفید نہ ہوگا۔

اس دور میں جہاد بالسیف کی ممانعت کی دوسری وجہ

''اس مرحلہ میں جہاد بالسیف اس وجہ سے بھی ہوسکتی ہے کہ دعوت اسلامی کا یہ مرحلہ ایک مخصوص ماحول مخصوص قوم ،اور مخصوص حالات کے اندر تربیت اور فراہمی استعداد کا مرحلہ تھا۔اس طرح کے ماحول میں تربیت اور استعداد کی فراہمی جن مختلف النوع مقصد کے تحت ضروری تھی اُن میں سے ایک مقصد یہ تھا کہ ایک عرب اِنسان کو ان باتوں کے گوارا کرنے کی تربیت دی جائے جنہیں وہ گوارا کرنے کا عادی نہیں ہے۔مثلاً اپنی ذات پر یا ان لوگوں پر جو اس کی پناہ میں ہوں ظلم وزیادتی کو صبر سے برداشت کرنا ۔تاکہ وہ اپنی شخصیت کی پرستش اور اپنے منہ زور نفس کے غلبہ سے آزاد ہو۔اور صرف ذات کا دفاع اور حلیفوں کا تحفظ ہی اُس کی پوری زندگی کا محور اور اس کی تمام سرگرمیوں کا محرّک بن کر نہ رہ جائے۔نیز اُسے ضبط نفس کی مشق ہو تا کہ وہ جیسا کہ اُس کی فطرت ہے۔ناگوار بات سنتے ہی بے قابو نہ ہوجایا کرے اور کسی بھی ہیجان خیز واقعہ کا سامنا کرتے ہوئے کف دروہن نہ ہوجائے، بلکہ اس کے مزاج اور تمام حرکات وسکنات میں اعتدال اور وقار کی شان جلوہ گر ہو۔اُسے یہ تربیت بھی دی جائے کہ وہ ایک ایسی جماعت کے ڈسپلن کی پابندی کرے جو نہایت منظّم ہے اور جسے ایک اعلیٰ قائد کی سرپرستی حاصل ہے۔زندگی کے ہر معاملہ میں وہ اس قائد کی طرف رجوع کرے،اُس کا ہر فعل قائد کے حکم کا آئینہ دار ہو بلالحاظ اس کے وہ حکم اُس کی عادت یا ذوق کے خلاف ہے یا موافق۔مکی زندگی میں ایک عرب کی سیرت کی تعمیر واصلاح کے لیے یہی امور بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتے تھے۔اور مدعا یہ تھا کہ اعلیٰ سیرت وکردار کے حامل افراد سے ایک ایسا مسلم معاشرہ تشکیل کیا جائے جو قائد کے اشارۂ ابرو پر حرکت کرتا ہو،ترقی یافتہ اور مہذب ہو، وحشیانہ خصائل اور قبائلی مفاسد سے پاک اور منزہ ہو۔

تیسری وجہ

اس دَور میں جہاد بالسیف کے امتناع کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ قریش کا ماحول تفاخر اور نسبی شرافت وبرتری کے احساسات سے بھرپور ماحول تھا۔اس طرح کے ماحول میں پُر امن دعوت زیادہ مؤثر اور کارگر ہوسکتی ہے۔لہٰذا اس مرحلہ میں قتال کا طریقہ اختیار کرنا عناد اور عداوت کو مزید بھڑکانے کا باعث بن سکتا تھا اور خونی انتقام کے نئے جذبات اور محرکات جنم دے سکتا تھا۔عربوں کے اندر پہلے سے خونی انتقام کے چکر چل رہے تھے جنہوں نے داحس اور غبراء اور بسوس کی جنگوں کو برس ہا برس تک جاری رکھا اور آخر قبیلوں کے قبیلے مٹا کر رکھ دیے۔خونی انتقام کے نئے جذبات اُن کے ذہنوں اور دلوں میں اسلام کے ساتھ منسوب ہوکر اُترتے تو پھر وہ کبھی فرو نہ ہو پاتے نتیجۃً اسلام ایک دعوت اور ایک دین کے بجائے خونی انتقام کے جھگڑوں کے سلسلۂ لامتناہی میں تبدیل ہوجاتا ،اور یوں اس کی بنیادی تعلیمات مرحلۂ آغاز ہی میں زینتِ طاقِ نسیاں ہوکر رہ جاتیں اور آئندہ کبھی اُن کو زندہ کرنے کی نوبت نہ آپاتی۔

چوتھی وجہ

یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ وسیع پیمانے پر خانہ جنگی کی صورتِ حال پیدا ہوکرنے سے اجتناب مقصود تھا۔اس وقت کسی باضابطہ حکومت کا کوئی وجود نہ تھا جو اہل ایمان کو تعذیب اور ایذارسانی کا نشانہ بناتی ، بلکہ تعذیب و"تادیب" کی خدمت ہر مومن کے اپنے ہی رشتہ دار اور سرپرست انجام دے رہے تھے۔اس طرح کی فضا میں اذن قتال کے صاف معنی تھے کہ گھر گھر میں معرکہ بپا ہوجاتا ،اور خانہ جنگی کا طویل اور لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا۔اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ: "یہ ہے اسلام"! بلکہ فی الواقع اسلام کے بارے میں ایسا بھی کہا گیا تھا، باوجودیکہ اسلام نے قتال کی ممانعت کا حکم دے رکھا تھا۔مگر قریش کے لوگ حج کے موسم میں حج اور تجارت کی خاطر دور دراز سے آنے والے عرب قافلوں میں

جا جا کر اُن سے یہ کہتے تھے کہ: ''محمد نہ صرف اپنی قوم اور اپنے قبیلے میں تفریق ڈال رہا ہے، بلکہ باپ اور بیٹے میں جدائی پیدا کر رہا ہے''۔ قریش یہ اعتراض ایسی صورت میں کر رہے تھے جب کہ اہل ایمان کو تلوار اُٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن اگر فی الواقع بیٹے کو باپ کی گردن اُڑانے اور غلام کو ولی کے قتل کرنے کا حکم دیا جاتا، اور ہر گھر اور ہر محلّہ میں یہ محاذ کھول دیا جاتا تو معترضین کیا کہتے اور عملاً کیا صورت حال پیدا ہوتی۔!!

پانچویں وجہ

یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ اسلام کے مخالفین کی اکثریت جنہوں نے آغاز کار میں مسلمانوں کو طرح طرح کی دینی آزمائشوں میں ڈالا، زہرہ گداز اذیتیں دیں اور اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا خود ایک نہ ایک دن اسلام کے مخلص اور وفا شعار سپاہی بلکہ قائد تک بننے والے ہیں۔ کیا عمر ابن خطاب انہی لوگوں میں نہیں تھے؟ مگر اسلام لانے کے بعد اُن کو جو مرتبہ ملا ہے وہ محتاج وضاحت نہیں ہے۔

چھٹی وجہ

یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ عربوں کی نخوت وحمیت بالخصوص قبائلی ماحول میں فطرۃً ایسے ستم رسیدہ انسان کی حمایت پر تل جاتی ہے جو ظلم واذیت تو برداشت کر لیتا ہے مگر پسپا ہونا نہیں جانتا۔ یہ حمیت اس وقت اور زیادہ جوش میں آتی ہے جب ظلم و ستم کا ہدف اُن کے اشراف اور اخیار بن رہے ہوں۔ مکہ کے ماحول میں ایسے بکثرت واقعات پیش آئے، جو اس نظریہ کی صحت کی تصدیق کرتے ہیں۔ مثلاً جب ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک انتہائی شریف اور کریم النفس انسان مکہ کو چھوڑ کر کسی اور مقام کی طرف ہجرت کے لیے نکل کھڑے ہوئے تو ابن الدغنہ برداشت نہ کر سکا اور انہیں ہجرت سے روک دیا۔ کیونکہ وہ اس بات کو عربوں کے لیے باعثِ ننگ سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی حمایت اور پناہ پیش کی

۔ایسے واقعات کی بہترین مثال اس وثیقہ کی تنسیخ ہے جس کے تحت بنو ہاشم کو شعب ابی طالب میں محصور کیا گیا، مگر جب ان کی بھوک اور فاقہ زدگی کا دور طول پکڑ گیا، اور ان کی تکلیف حد سے بڑھ گئی تو بالآخر خود عرب نوجوانوں نے ہی اس وثیقہ کے پُرزے پُرزے کر ڈالے۔ یہ نخوت عرب کا امتیازی وصف تھا ۔جب کہ قدیم تہذیبوں کے اندر جو انسانیت کی تذلیل کی عادی رہی ہیں اس کے برعکس صورتحال نظر آتی ہے۔ وہاں ظلم واذیت پر مہر بلب رہنے سے انسان خود ماحول کی طرف تمسخر واستہزاء حقارت کا نشانہ بنتا ہے اور الٹا ظالم موذی کی تعظیم وتکریم کی جاتی ہے۔

ساتویں وجہ

یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔اور وہ صرف مکہ ہی میں پائے جاتے تھے۔دعوتِ اسلامی ابھی تک جزیرۂ عرب کے دوسرے حصوں تک نہیں پہنچتی تھی۔ یا اگر پہنچی تھی تو محض اڑتی اڑتی خبروں کی صورت میں۔دوسرے قبائل اسے قریش اور ابنائے قریش کی اندرونی جنگ سمجھ کر ابھی تک غیر جانب دار تھے۔اور آخری فیصلے کے منتظر۔ان حالات میں اگر قتال مسلمانوں پر فرض کر دیا جاتا تو یہ محدود جنگ مسلمانوں کی اس قلیل جماعت کے کلی خاتمہ پر منتج ہوتی۔اور خواہ مسلمان اپنے سے کئی گنا زیادہ لوگوں کو مار ڈالتے مگر وہ خود پورے کے پورے صفحہ وجود سے محو ہوجاتے۔شرک کی عملداری جوں کی توں رہ جاتی، اور اسلامی نظام کے قیام کی صبح طلوع نہ ہوسکتی۔اور کبھی اس کا عملی نظام اپنی بہار نہ دکھا سکتا۔حالانکہ وہ اس لیے نازل ہوا ہے کہ انسانی زندگی کا عملی نقشہ اُس پر استوار ہو۔

مدنی دور کے ابتدائی ایام میں جہاد کیوں ممنوع رہا؟

مدنی زندگی کے اوائل ایام میں بھی قتال کی ممانعت رہی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے یہود کے ساتھ اور ان عربوں کے ساتھ جو مدینہ کے اطراف میں آباد تھے اور ابھی تک شرک پر قائم تھے عدم جنگ کا معاہدہ کر لیا تھا۔آپ کا یہ اقدام درحقیقت اس نئے مرحلے کا طبعی تقاضا تھا۔اور

اس کا پس منظر یہ تھا کہ:

اولاً: وہاں تبلیغ ونصیحت کے کُھلے مواقع حاصل ہوگئے تھے۔کوئی سیاسی قوت اُس پر قدغن لگانے والی اورلوگوں کواس سے روکنے والی موجود نہ تھی۔تمام آبادی نے نئی مسلم ریاست کوتسلیم کرلیا تھااوراُس کے سیاسی معاملات کوسُلجھانے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی قیادت پراتفاق کرچکے تھے۔چنانچہ مذکورہ بالا معاہدے میں یہ طے کردیا گیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی اجازت کے بغیرکوئی شخص معاہدہ صلح کرنے یا جنگ چھیڑنے یا خارجہ تعلقات قائم کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔یہ حقیقت اظہرمن الشّمس ہوگئی تھی کہ مدینہ منورہ کی اصل سیاسی قوت مسلم قیادت کے ہاتھ میں ہے۔اس لیے دعوت کے فروغ کے دروازے کھلے تھے،عقیدہ کی آزادی موجودتھی،اورلوگ جس عقیدہ کو چاہتے اُسے اختیار کرنے میں کوئی قوت انہیں روکنے والی نہ تھی۔

ثانیاً اس مرحلہ میں رسول اللہ ﷺ قریش کے ساتھ یکسو ہوکر نبٹنا چاہتے تھے،کیونکہ ان کی مخالفت دوسرے قبائل کے اندر دین حق کی اشاعت کے لیے سدِّ راہ بن رہی تھی۔وہ قبائل اس انتظار میں تھے کہ قریش اورابنائے قریش کا یہ داخلی معرکہ کس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔اسی منصوبے کے مدِّنظر رسول اللہ ﷺ نے موقع گنوائے بغیر جنگی دستوں (سرایا) کو اِدھر اُدھر بھیجنے میں جلدی کی۔اورآپ ﷺ نے سب سے پہلا دستہ جو روانہ کیا اس کی کمان حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمائی۔یہ رمضان کا مہینہ تھا اورابھی ہجرت کو چھ ماہ ہوئے تھے۔اس دستہ کے بعد پے در پے کئی دستے روانہ کیے۔ایک ہجرت کے نویں ماہ کے آغاز پر دوسرا تیرھویں ماہ کے آغاز پر،تیسرا سولھویں ماہ کے آغاز پراور جب ہجرت کا سترھواں ماہ شروع ہوا تو عبداللہ بن جحش کی قیادت میں ایک سریہ روانہ کیا گیا،اس سریّہ نے وہ پہلا معرکہ برپا کیا جس میں خونریزی تک نوبت پہنچی۔یہ معرکہ ماہ حرام (رجب) میں پیش آیا۔اسی معرکہ کے بارے میں سورۂ بقرہ کی یہ آیات نازل ہوئیں:

يَسْـَٔـلُـوْنَكَ عَـنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ

اللّٰہِ وَ کُفْرٌ بِہٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ اِخْرَاجُ اَھْلِہٖ مِنْہُ اَکْبَرُ عِنْدَ اللّٰہِ وَ الْفِتْنَۃُ اَکْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ............الخ. (البقرہ:۲۱۷)

''لوگ پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو، اس میں لڑنا بہت برا ہے، مگر راہِ اللہ سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجدِ حرام کا راستہ اللہ پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے اور فتنہ خونریزی سے شدید تر ہے۔''

پھر ہجرت کے دوسرے سال کے اندر ہی ماہ رمضان المبارک میں غزوۂ بدر کُبریٰ پیش آیا۔ سورۂ انفال میں اسی جنگ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

اسلامی تحریک کا یہ موقف اگر حالات کے اس پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو یہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اسلامی تحریک کا بنیادی منصوبہ دراصل رائج الوقت مفہوم کے مطابق اپنی ''مدافعت'' کے سوا کچھ نہ تھا۔ یعنی وہی تاویل جو حالاتِ حاضرہ کی ''سرخ آنکھوں'' کا یارانہ رکھنے والے حضرات، اور مستشرقین کی عیارانہ تنقیدوں سے بوکھلا اٹھنے والے مفکرین کی طرف پیش کی جا رہی ہے۔ درحقیقت جو لوگ غلبۂ اسلامی بے نظیر تحریک کو خالص مدافعانہ اسباب کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور پھر اس بات کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، یہ ''اربابِ تحقیق'' مستشرقین کی اس جارحانہ تحریک سے مات کھا چکے ہیں جس نے اسلام پر ایسے وقت میں تابڑ توڑ حملے شروع کر رکھے ہیں جب نہ مسلمانوں کی شان وشوکت باقی رہی ہے، اور نہ اسلام کے ساتھ اُن کی وابستگی قابلِ رشک ہے ۔ البتہ ایک گروہ قلیل اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ایسے ہتھکنڈوں سے ضرور محفوظ ہے، اور وہی لوگ اس بات پر بھی ڈٹے ہوئے ہیں کہ اسلام کا یہ ابدی پیغام کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان اقتدارِ الٰہی کے سوا ہر قسم کے اقتدار و استبداد سے نجات پائیں اور دین سراسر اللہ کے لیے ہو غالب و برتر کر کے رہیں گے ۔ مگر اس گروہ قلیل کے ماسوا باقی تمام مفکرین کا یہ حال ہے کہ وہ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ انہیں

اسلامی جہاد کے لیے اخلاقی وجوہ مل جائیں جس سے وہ معترضین کو مطمئن کرسکیں۔مگر خاک برسر آنہا، اسلامی فتوحات کے لیے قرآن نے جو وجوہ جواز پیش کردیے ہیں ان سے زائد کسی اور اخلاقی سند کی ضرورت باقی نہیں ہے۔قرآن کہتا ہے:

فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ وَ مَنْ يُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ اَجْرًا عَظِيمًا ۝ وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيرًا ۝ اَلَّذِينَ اٰمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَ الَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيفًا ۝ (النساء:٧٤-٧٦)

”اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے ان لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو فروخت کردیں، پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اُسے ہم ضرور اجرِ عظیم عطا کریں گے آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کررہے ہیں کہ الٰہی ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کردے۔جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں، پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں“

قُلْ لِّلَّذِينَ كَفَرُوٓا اِنْ يَّنْتَهُوا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ وَ اِنْ يَّعُودُوا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِينَ ۝ وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُونَ الدِّينُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ

انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْآ اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰكُمْ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ○ (الانفال:۳۸-۴۰)

''اے نبی، ان کافروں سے کہو کہ اگر اب بھی باز آ جائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اس سے درگزر کیا جائے گا، لیکن اگر یہ اسی پچھلی روش کا اعادہ کریں گے تو گزشتہ قوموں کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اے ایمان والو، ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر وہ فتنہ سے رُک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے اور اگر وہ نہ مانیں ت تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا سرپرست ہے اور وہ بہترین حامی و مددگار ہے۔''

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ○ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ○ اِتَّخَذُوْآ اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ مَآ اُمِرُوْآ اِلَّا لِيَعْبُدُوْآ اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ (توبۃ:۲۹-۳۲)

''جنگ کرو اہل کتاب میں سے اُن لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لاتے، اور جو کچھ اللہ اور اُس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور ذلیل بن کر رہیں، یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ

کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں، ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے۔ اللہ کی مار ان پر یہ کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہیں، انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے اور اس طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کیے بغیر رہنے والا نہیں ہے خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

جہاد کے جو وجوہ و محرکات ان آیات کے اندر بیان ہوئے ہیں وہ ہیں: دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا سکہ رواں کرنا، انسانی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام حق کو قائم کرنا، تمام شیطانی اور شیطانی نظامہائے حیات کا قلع قمع کرنا، انسان کی آقائی ختم کرنا جو انسان کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑتی ہے حالانکہ انسان صرف اللہ کے غلام ہیں اور سوائے اس کے کسی غلام کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ انسانوں کو اپنے خود ساختہ اقتدار کا تابع بنائے اور ان پر اپنی اھواء واغراض کی شریعت نافذ کرے۔ یہی وجوہ و محرکات جہاد قائم کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ اس اصول کی بھی پابندی کی جانی چاہیے کہ "لاا کــراہ فــی الدین "(دین میں جبر نہیں ہے)۔ یعنی بندوں کے اقتدار اور الوہیت سے چھٹکارا پا جانے کے بعد اور اس اصول کی بالاتری کے بعد کہ اقتدار صرف اللہ کا ہوگا بالفاظ دیگر دین سراسر اللہ کے لیے ہوگا کسی فرد بشر کو عقیدۂ اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ جہاد کے ان وجوہ و محرکات پر اگر آپ غور کریں تو ان کا حاصل یہ نکلے گا کہ اسلام جس غرض کے لیے جہاد کا علمبردار ہے وہ اس دنیا کے اندر انسان کی مکمل اور حقیقی آزادی ہے۔ اور یہ آزادی تبھی مکمل ہو سکتی ہے کہ انسان کو انسان کی عبودیت سے نکال کر اُسے اللہ کی عبودیت کاملہ کی فضائے بسیط میں لایا جائے جو

صرف ایک ہے اور اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے۔ کیا جہاد کو برپا کرنے کے لیے صرف یہی مقصد عظیم کافی نہیں ہے؟۔

بہرحال قرآن نے جہاد کے جو وجوہ ومقاصد بیان کیے ہیں یہی وجوہ ومقاصد ہر وقت مسلمان مجاہدین کے پیشِ نظر رہتے تھے۔ ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ کسی مسلمان مجاہد سے یہ دریافت کیا گیا ہو کہ تم کس لیے جہاد پر نکل کھڑے ہوئے ہو، اور اُس نے یہ جواب دیا ہو کہ: ''ہمارے وطن کو خطرہ درپیش ہے، ہم اُس کے دفاع کے لیے اُٹھے ہیں'' یا ''ہم مسلمانوں پر اہل فارس اور اہل روم کی جارحانہ کاروائیوں کو روکنے کے لیے نکلے ہیں'' یا ''ہم ملک کے رقبے کی توسیع چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ غنائم حاصل ہوں''!! اس کے برعکس ان کا جواب وہ ہوتا تھا جو ربعی ابن عامر، حذیفہ بن محصن اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم نے قادسیہ کی جنگ میں فارسی لشکر کے سپہ سالار رستم کو دیا تھا۔ رستم آغاز جنگ سے تین روز پہلے تک برابر ان مجاہدین کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے الگ الگ یہ پوچھتا رہا کہ: ''کیا خواہش تمہیں یہاں لے کر آئی ہے''؟ مگر ان سب کا جواب یہ تھا کہ:

> ''اللہ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم انسان کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ واحد کی بندگی کی طرف لائیں، دنیا کی تنگی سے نکال کر انہیں دنیا کی فراخی سے بہرہ ور کریں، ادیان کے ظلم وستم سے نجات دے کر عدلِ اسلام سے ہمکنار کریں۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنا دین دے کر اپنی مخلوق کے پاس بھیجا ہے۔ پس جو ہمارے اس دین کو قبول کر لیتا ہے، ہم اس کے اقرار کو تسلیم کر لیتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں اور اُس کا ملک اُسی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اور جو سرتابی کرتا ہے اُس سے جنگ کرتے ہیں یہاں تک کہ شہادت پا کر جنت حاصل کریں یا فتح یاب ہو جائیں۔''

جہاد کی ایک اور طبعی وجہ

جہاد کے خارجی وجوہ ومحرکات کے علاوہ اس کی ایک قائم بالذات وجہ جواز تو وہ صرف یہ بات ہے کہ وہاں اللہ کی حکومت کا سکہ رواں ہو اور اللہ کا بھیجا ہوا نظامِ زندگی وہاں نافذ ہو۔ اس نسبت کے بعد وطن عقیدۂ اسلام کا قلعہ۔ اسلامی نظام حیات کی جلوہ گاہ اسلام کا گھر (دارالاسلام) اور انسان کی آزادیٔ کامل کی تحریک کا منبع ومرکز قرار پاتا ہے۔ اور بلاشبہ دارالاسلام کا تحفظ اور دفاع خود عقیدۂ اسلام کا دفاع ہے، اسلامی نظامِ حیات اور اسلام کے نمائندہ معاشرہ کا دفاع ہے۔ لیکن دفاع کو اصل اور آخری مقصد نہیں قرار دیا جاسکتا، اور نہ دارالاسلام کا تحفظ ہی اسلام کی تحریک جہاد کی اصل غایت ہے۔ بلکہ دارالاسلام کی حفاظت تو اللہ کی حکومت کے قیام کا ایک ذریعہ ہے۔ اور ثانیاً اس کی وجہ یہ ہے کہ دارالاسلام کو وہ مرکزی مقام بنانا مقصود ہوتا ہے کہ جہاں سے اسلام کا آفتاب جہاں تاب دنیا کے کونے کونے میں چمکے اور نوع انسانی اُس کے اعلان آزادی سے ممتع ہو۔ یہ بات ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس دین کا موضوع ''نوع انسان'' ہے اور اس کا دائرہ کار پورا کرۂ ارضی ہے۔

جہاد اسلام کی فطری ضرورت ہے

جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ دنیا میں اللہ کی حکومت کے قیام میں کئی مادّی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ ریاست کی بے پناہ طاقت، معاشرے کا نظام اور روایات، پورا انسانی ماحول۔ ان میں سے ہر ہر چیز اسلام کی راہ میں ایک سنگِ گراں ہے۔ اسلام ان تمام رکاوٹوں کو ہٹانے کے لیے طاقت کا استعمال کرتا ہے۔ تاکہ اسلام کے درمیان اور افراد انسانی کے درمیان کوئی حجاب حائل نہ رہے اور وہ آزاد فضا کے اندر انسان کی روح اور عقل سے اپیل کر سکے۔ بناوٹی آقاؤں کی قیود سے رہا کر کے وہ انسانوں کو ارادہ وانتخاب کی آزادی فراہم کرتا ہے تاکہ وہ اپنی آزاد مرضی سے جس بات کو چاہیں قبول کریں اور جسے چاہیں ردّ کر دیں۔

اسلام کے نظریۂ جہاد پر مستشرقین نے جو مکروہ حملے شروع کرر کھے ہیں اُن سے ہمیں ہرگز دھوکہ نہیں کھانا چاہیے اور نہ کسی گھبراہٹ کا اظہار کرنا چاہیے۔ یہ بات بھی ہماری حوصلہ شکنی کا باعث نہیں ہونی چاہیے کہ حالات کا دھارا ہمارے خلاف بہہ رہا ہے اور دنیا کی بڑی طاقتیں بھی ہمارے خلاف ہیں۔ یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ ہم ان سے متاثر ہوکر اسلامی جہاد کے وجوہ جواز دین کی فطرت وحقیقت سے کہیں باہر تلاش کرنا شروع کر دیں۔ اور جہاد کو دفاعی ضرورت اور وقتی اسباب وحالات کا نتیجہ قرار دینے لگیں۔ جہاد جاری ہے اور جاری رہے گا۔ خواہ دفاعی ضروریات اور وقتی اسباب وحالات پائے جائیں یا نہ پائے جائیں۔ تاریخ کے نشیب وفراز کا جائزہ لیتے وقت ہمیں ان اصل محرکات اور تقاضوں کو ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہیے جو اس دین کی طبیعت ہیں، اس کے عالمگیر اعلان آزادی ہیں، اور اس کی حقیقت پسندانہ طریقِ کار پنہاں ہیں، یہ بات درست نہ ہوگی کہ ہم ان اصل محرکات اور تقاضوں کے درمیان اور دفاعی ضروریات اور وقتی داعیات کے درمیان خلط مبحث کریں۔

بلاشبہ اس دین کو بیرونی حملہ آوروں سے اپنے دفاع کا پورا پورا انتظام کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ دین کا محض اس شکل میں آنا کہ یہ اللہ کی عالمی ربوبیت کا اعلان اور غیر اللہ کی بندگی سے انسان کی رستگاری کی دعوت ہے، اور پھر اس منظّم تحریک کا قالب اختیار کر لینا جو جاہلی قیادتوں سے باغی اور ایک بالکل نئی اور جداگانہ طرز کی قیادت کے تابع ہو، اور ایک نرالے اور مستقل معاشرے کی تخلیق کرنا جو انسانی حاکمیت کو اس لیے تسلیم نہ کرتا ہو کہ حاکمیت صرف اللہ واحد کا حق ہے۔ دین کا اس شکل میں دنیا سے تعارف کرانا ہی اس امر کے لیے بہت کافی ہے کہ اردگرد کے وہ تمام جاہلی معاشرے اور طبقے جو بندگئ انسان کی بنیاد پر قائم ہیں اس کو نیست ونابود کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے وجود کے تحفظ ودفاع کے لیے خم ٹھونک کر باہر نکل آئیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں نئے اسلامی معاشرے کو بھی اپنے تحفظ ودفاع کا انتظام کرنا ہوگا۔ اس صورتِ حال کا رونما ہونا ناگزیر ہے جوں ہی اسلام کا ظہور ہوگا یہ صورتِ حال بھی لازماً پیدا ہوگی۔ اس کشمکش کو چھیڑنے میں اسلام کی پسند وناپسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ یہ

کشمکش تو اسلام پر ٹھونسی جاتی ہے۔ یہ وہ طبعی کشمکش ہے جو دو ایسے نظاموں کے مابین چھڑ کر رہتی ہے جو زیادہ عرصہ تک بقائے باہم کے اصول پر ساتھ نہیں رہ سکتے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس میں مجال شک نہیں ہے۔ اور اسی نفس الامری حقیقت کی رُو سے اسلام کے لیے اپنی مدافعت ضروری ہو جاتی ہے۔ اُسے یہ مسلط کردہ دفاعی جنگ لڑے بغیر چارہ نہیں ہے۔

جاہلیت کے مقابلے میں اسلام ''جنگ بندی'' نہیں کرسکتا

لیکن اس حقیقت نفس الامری کے علاوہ ایک اور اٹل حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے جو اس پہلی حقیقت سے زیادہ اہم اور روشن ہے۔ اسلام کی فطرت کا ایک اٹل تقاضا ہے کہ وہ بنی نوع انسان کو غیر اللہ کی بندگی کے گڑھے سے نکالنے کے لیے روزِ اوّل ہی سے پیش قدمی شروع کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے جغرافیائی حدود کی پابندی ناممکن ہے۔ اور نہ وہ نسلی حد بندیوں میں محصور ہو کر رہ سکتا ہے، اُسے یہ گوارا نہیں ہے کہ وہ مشرق سے لے کر مغرب تک پھیلی ہوئی پوری نوع انسانی کو شر و فساد اور بندگی غیر اللہ کا لقمہ بنتے دیکھتے اور پھر اسے چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کر لے۔ اسلام کے مخالف کیمپوں پر تو ایک ایسا وقت آسکتا ہے کہ ان کی مصلحت کا تقاضا یہ ہو کہ اسلام کے خلاف کوئی جارحانہ کاروائی نہ کی جائے بشرطیکہ اسلام انہیں اس بات کی اجازت دے دے کہ وہ اپنی علاقائی حدود کے اندر رہ کر بندگئ غیر اللہ کی ڈگر پر چلتے رہیں، اسلام انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے اور انہیں اپنی دعوت اور اپنے اعلانِ آزادی کی پیروی پر مجبور نہ کرے۔ مگر اسلام اُن کے ساتھ جنگ بندی کا موقف اختیار نہیں کرسکتا۔ اِلّا یہ کہ وہ اسلام کے اقتدار کے آگے اپنا سر خم کر دیں، اور جزیہ دینا قبول کر لیں۔ جو اس امر کی ضمانت ہوگا کہ انہوں نے دعوتِ اسلام کے لیے اپنے دروازے کھول دیے ہیں، اور اس کی راہ میں کسی سیاسی طاقت کے بل پر روڑے نہیں اٹکائیں گے۔ اس دین کا یہی مزاج ہے اور اللہ کی عالمی ربوبیت کا اعلان، اور مشرق و مغرب کے انسانوں کے لیے غیر اللہ کی بندگی سے نجات کا پیغام ہونے کی حیثیت سے اس کا یہ

ناگزیر فرض بھی ہے۔ اسلام کے اس تصور میں اور اس تصور میں جو اس کو جغرافیائی اور نسلی حدود میں مقید کر دیتا ہے، اور جب تک کسی بیرونی جارحیت کا خطرہ نہ ہو۔ اس کو کسی اقدام کی اجازت نہیں دیتا۔ فرق ظاہر ہے! پہلی حالت میں وہ ایک زندہ اور متحرک قوت ہے، جبکہ دوسری صورت میں وہ تمام داخلی اور فطری محرکاتِ عمل سے یکسر محروم ہو جاتا ہے!

اسلام کی پیش قدمی اور حرکت پسندی کے وجوہ جواز زیادہ مؤثر اور واضح طور پر سمجھنے کے لیے یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ اسلام انسانی زندگی کا خدائی نظام ہے، یہ کسی انسان کا وضع کردہ نہیں ہے، نہ یہ کسی انسانی جماعت کا خود ساختہ مسلک ہے، اور نہ یہ کسی مخصوص انسانی نسل کا پیش کردہ طریقِ حیات ۔اسلام کی تحریک جہاد کے اسباب خارج میں ڈھونڈنے کی ضرورت صرف اسی وقت پیش آتی ہے جب ہماری نگاہوں سے یہ عظیم حقیقت اوجھل ہو جاتی ہے، اور ہم بھول جاتے ہیں کہ دین کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکومت کے قیام کے ذریعے سارے مصنوعی خداؤں کی خدائی کی بساط لپیٹ دی جائے ۔یہ ناممکن ہے کہ انسان اس اہم اور فیصلہ کن حقیقت کو اپنے ذہن میں ہر وقت تازہ بھی رکھے اور پھر جہاد اسلامی کے سلسلے میں کسی خارجی وجہ جواز کی تلاش وجستجو میں سرگرداں بھی ہو۔

اسلام کے بارے میں دو تصور اور ان کا فرق

اسلام کے ان دو تصوروں کے درمیان جو فرق ہے اس کا صحیح اندازہ سفر کی پہلی منزل پر نہیں ہو سکتا۔ ایک تصور تو یہ ہے کہ اسلام کو جاہلیت کے خلاف غیر ارادی طور پر جنگ لڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس لیے کہ اس کے وجود کا طبعی تقاضا تھا کہ جاہلی معاشرے اس پر حملہ آور ہوں۔ اور اسلام بامرِ مجبوری مدافعت کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ اور دوسرا تصور یہ ہے کہ اسلام لازماً بذاتِ خود شروع سے پیش قدمی کرے گا اور بالآخر معرکۂ کارزار میں داخل ہوگا۔ اختلافِ مسلک کے آغاز میں تو ان دونوں حالتوں میں لازماً اسلام کو جن گاہ میں اترنا پڑے گا لیکن منزل پر پہنچ جانے پر معلوم ہوگا کہ دونوں تصوروں میں زمین وآسمان کا

فرق ہے۔اسلام کے بارے میں دونوں کے احساسات وجذبات میں اور خیالات وتصورات میں بڑا بنیادی اور نازک سا فرق ہے۔

اس خیال میں اسلام الٰہی نظام حیات ہے اور اس خیال میں کہ وہ ایک علاقائی نظام ہے بہت بڑا اور غیر معمولی فرق ہے۔اول الذکر خیال کے مطابق اسلام دنیا میں اس لیے آیا ہے کہ وہ اللہ کی زمین پر اللہ کی حکومت کا اعلان کرے،اور تمام انسانوں کو ایک الٰہ کی بندگی کی دعوت دے،اور اپنے اعلان اور دعوت کو عملی سانچے میں ڈھالے،اور پھر ایک ایسا معاشرہ تیار کرے جس میں انسان انسانوں کی بندگی سے آزاد ہوں اور بندگیٔ رب پر جمع ہوں،ان پر صرف شریعت الٰہی جو اللہ کی بالاتر اقتدار کی نمائندگی کرتی ہے حکمران ہو۔صرف اسی اسلام کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اُن تمام موانع کو زائل کرے جو اس کے راستے میں حائل ہوں۔تا کہ وہ ریاست کے سیاسی نظام یا انسانوں کی خودساختہ معاشرتی روایات کی دیواروں کو ڈھانے کے بعد افراد کے عقل ووجدان سے آزادانہ اپیل کر سکے۔ثانی الذکر خیال کی رو سے اسلام محض ایک وطنی نظام ہے اور اُسے صرف اتنا حق حاصل ہے کہ اس کی علاقائی حدود پر جب کوئی طاقت حملہ کرے تو وہ اپنا دفاع کرے۔اب یہ دونوں تصور آپ کے سامنے ہیں۔بے شک اسلام دونوں حالتوں میں جہاد کو قائم کرتا ہے،لیکن دونوں حالتوں میں جہاد کے محرکات،جہاد کے مقاصد اور جہاد کے نتائج سے جو دو عملی تصویریں بنتی ہیں وہ ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں۔فکر ونظر کے لحاظ سے بھی اور منصوبہ ورجحان کے اعتبار سے بھی۔

بے شک اسلام کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ابتداء ہی پیش قدمی سے کرے۔اسلام کسی قوم یا وطن کی میراث نہیں ہے۔یہ اللہ کا دین ہے اور تمام دنیا کے لیے ہے۔اسے یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ ان موانع کو پاش پاش کردے جو روایات اور نظاموں کی شکل میں پائے جاتے ہیں اور جو انسان کی آزادیٔ انتخاب کو پابندِ سلاسل کرتے ہیں۔وہ افراد پر حملہ نہیں کرتا اور نہ ان پر اپنا عقیدہ زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے ،وہ صرف حالات ونظریات سے تعارض کرتا ہے تا کہ افرادانسانی کو ان فاسد اور زہریلے اثرات سے

بجائے جنہوں نے اُن کی فطرت کو مسخ کر دیا ہے اوران کی آزادیٔ انتخاب کو پامال کرر کھا ہے۔

اسلام اپنے اس حق سے بھی کسی طور پر دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں کہ وہ انسانوں کو بندوں کی آقائی سے نکال کر صرف ایک اللہ کی بندگی پر جمع کرے۔تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور انسانوں کی آزادی کامل کی تحریک کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔تصوراسلامی اورامرِ واقع دونوں کے نقطۂ نظر سے اللہ تعالیٰ کی بندگی اپنی پوری شان سے صرف اسلام نظام ہی کے سائے میں روبعمل آسکتی ہے۔اسلامی نظام ہی ایک ایسا منفرد نظام ہے جس میں تمام انسانوں کا خواہ وہ حاکم ہوں یا محکوم ہوں، کالے ہوں یا گورے ،غریب ہوں یا امیر،قریب ہوں یا دور کے،صرف اللہ تعالیٰ ہی قانون ساز ہوتا ہے،اوراس کا قانون سب کے لیے برابر ہوتا ہے اور سب انسان یکساں طور پر اُس کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں۔رہے دوسرے نظام ہائے حیات تو ان میں انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کی بندگی کرتے ہیں،اوروہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی گھڑی ہوئی شریعت کی اطاعت کرتے ہیں۔شریعت سازی الوہیت کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے۔جوانسان یہ دعویٰ کرے کہ انسانوں کے لیے حسب منشا قانون بنانے کا اُسے اختیار ہے تو بالفاظ دیگراس کے دعوے کا مطلب یہ ہے کہ وہ الوہیت کا مدعی ہے،خواہ وہ زبان سے الوہیت کا دعویٰ کرے یا نہ کرے،جوشخص ایسے مدعی کا یہ حق یعنی آزادانہ قانون سازی کا حق تسلیم کرے گا گویا اُس نے اس کے حق الوہیت کو تسلیم کیا چاہے وہ اسے الوہیت کا نام دے یا اس کے کچھ دوسرے نام اوراصطلاحیں تجویز کرتا پھرے۔

اسلام محض عقیدہ وفکر کا نام نہیں ہے کہ وہ لوگوں تک محض وعظ وبیان کے ذریعے اپنا پیغام پہنچادینے پر اکتفاء کرلے۔اسلام ایک طریقِ زندگی ہے جو منظّم تحریک کی صورت میں انسان کی آزادی کے لیے عملی اقدام کرتا ہے۔غیر اسلامی معاشرے اور نظام ہائے حیات اُسے یہ موقع نہیں دیتے کہ وہ اپنے نام لیواؤں کواپنے طریقِ کار کے تحت منظّم کرسکے۔اس لیے اسلام کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے نظاموں کو،جو انسان کی آزادیٔ کامل کے لیے سدِّ راہ بن رہے ہوں،ختم کرے۔صرف اسی صورت میں دین پورے

کا پورا اللہ کے لیے قائم ہوسکتا ہے۔ پھر نہ کسی انسان کا اقتدار باقی رہے گا اور نہ کسی انسان کی بندگی کا سوال پیدا ہوگا۔ جیسا کہ دوسرے نظامہائے زندگی کا حال ہے جو انسان کی آقائی اور انسان کی بندگی پر اپنی عمارت قائم کرتے ہیں۔

اسلام میں مغرب کے تصور جہاد کی گنجائش نہیں

ہمارے وہ معاصر مسلمان محقق جو حالات حاضرہ کے دباؤ اور مستشرقین کی مکارانہ تنقیدوں سے مرعوب ہیں وہ اسلام کی مذکورہ بالا حقیقت کے اظہار و اِثبات کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ مستشرقین نے اسلام کی جو تصویر بنائی ہے اُس میں اسلام کو ایک خون آشام تحریک کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، جو شمشیر بدست انسانوں پر اپنے عقائد و نظریات ٹھونستی پھرتی ہے۔ یہ بدطینت مستشرقین خوب جانتے ہیں کہ اسلام اس تصور سے قطعاً پاک ہے۔ لیکن اس ہتھکنڈے سے کام لے کر دراصل وہ اسلامی جہاد کے محرکات واسباب کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ہمارے مسلمان محققین یہی شکست خوردہ محققین اسلام کی پیشانی سے اس ''داغ'' کو دھونے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ایسے دلائل کی تلاش میں لگ جاتے ہیں جن سے وہ یہ ثابت کرسکیں کہ اسلام میں جہاد سے مراد صرف ''مدافعانہ جنگ'' ہے۔ چونکہ یہ لوگ اسلام کی فطرت اور اس کے اصل کارنامے سے قطعاً نابلد ہیں، انہیں یہ تک معلوم نہیں ہے کہ اسلام ایک عالمی اور انسانی مذہب --- کا یہ ناگزیر حق ہے کہ وہ انسانوں کی آزادی کے لیے خود اقدام کرے۔ عصر حاضر کے ان مرعوب و ہزیمت خوردہ اربابِ تحقیق کے ذہنوں پر وہ تصور غالب ہے جو اصلاً مغرب کا تصور مذہب ہے۔ مغربی تصور کے لحاظ سے دین محض ایک عقیدہ کا نام ہے، اس کا مقام ضمیر ہے، زندگی کے عملی نظام سے اُسے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین کے نام پر جب کوئی جنگ لڑی جاتی ہے تو اہلِ مغرب کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ دوسروں پر اپنا عقیدہ اور نظریہ جنگ کے ذریعے زبردستی ٹھونسنا چاہتے ہیں۔

لیکن اسلام میں دین کا یہ تصور کبھی نہیں رہا، اور نہ اس تصور کے تحت اس نے کبھی علم جہاد بلند کیا ہے ۔اسلام انسانی زندگی کا خدائی نظام ہے۔ جو صرف اللہ کی بندگی کا قائل ہے، اس کے نزدیک الوہیت کا صحیح مظہر حاکمیت اللہ ہے، اس طرح یہ نظام انسان کی عملی زندگی کے بڑے سے بڑے مسائل سے لے کر روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے معاملات کی مکمل تنظیم کرتا ہے۔ اُس کا نظام جہاد دراصل اس خدائی نظام کو برپا کرنے اور اسے غالب کرنے کی کوشش ہی کا دوسرا نام ہے۔ رہا عقیدہ کا معاملہ تو ظاہر ہے کہ اُس تعلق آزادئ رائے سے ہے، اسلام چاہتا ہے کہ انسانی رائے کو متاثر کرنے کی راہ میں حائل ہونے والی تمام رکاوٹیں دُور ہوں، اور ہمہ پہلو اسلام کا نظام غالب ہو جائے، فرد کو ہر قسم کے عقیدہ اور نظریہ کے ردّ و قبول کی آزادی ہو، اور وہ اپنی آزاد مرضی سے جو عقیدہ چاہے اختیار کر سکے۔ ظاہر ہے کہ دین کا یہ نقشہ اُس نقشے سے اپنے اساسی نظریات اور تفصیل دونوں کے لحاظ سے سرتاپا مختلف ہے جو مغرب نے پیش کیا ہے۔

چنانچہ جہاں کہیں بھی ایسا اسلامی معاشرہ پایا جاتا ہے جو الٰہی نظام حیات کی عملی تفسیر و تعبیر ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اقدام کرے اور آگے بڑھ کر اقتدار کی زمام ہاتھ میں سنبھال لے اور جریدۂ عالم پر الٰہی نظام حیات کا نقش ثبت کر دے۔ البتہ عقیدہ اور ایمان کے مسئلے کو وہ انسان کے وجدان اور آزاد رائے پر چھوڑ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو ایک معین عرصہ تک اگر جہاد سے روکا تھا تو یہ منصوبہ بندی کے طور پر تھا۔ نہ کہ کسی اصول و ضابطے کی تعلیم تھی۔ یہ تحریک ایک خاص مرحلے کی ضروریات کا مسئلہ تھا، نہ کہ اسلام کے بنیادی عقیدہ اور نظریہ کا مسئلہ۔ اسی واضح بنیاد کی روشنی میں ہمیں قرآن مجید کی بکثرت ایسی آیات کا مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے جن کا تعلق تحریک کے بدلتے ہوئے مراحل سے رہا ہے۔ ان آیات کو پڑھتے وقت ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ان کا ایک مفہوم وہ ہے جو اس مرحلے کے ساتھ وابستہ ہے جس میں یہ نازل ہوئی تھیں، اور دوسرا ان کا عمومی مفہوم ہے جس کا تعلق اسلامی تحریک کی ناقابل تغیر اور اندی شاہراہ حیات سے ہے۔ ہمیں ان دونوں حقیقتوں کو کبھی گڈ مڈ

نہ کرنا چاہیے۔

❀❀❀❀❀

باب پنجم

لا الٰہ الا اللہ: اسلام کا نظامِ حیات

اِسلامی نظامِ زندگی

''لا الٰہ الا اللہ'' (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) اسلامی عقیدہ کے رکن اول یعنی کلمہ شہادت کا پہلا جزو ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ بندگی وعبادت کے لائق صرف ایک اللہ ہے۔ ''محمد رسول اللہ'' اس کا دُوسرا جزو ہے اور اس میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اس بندگی کی کیفیت اور اس کا طریقہ صرف رسول اللہ ﷺ ہی سے حاصل کیا جائے گا۔ مومن اور مسلم کا دل وہ دل ہے جن کی گہرائیوں میں یہ کلمہ اپنے دن دونوں اجزا سمیت پوری طرح جا گزیں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں شہادتوں کے بعد ایمان کے جتنے ستون اور اسلام کے جتنے ارکان ہیں وہ دراصل ان شہادتوں ہی کے تقاضے میں پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ملائکہ پر ایمان، اللہ کی کتابوں پر ایمان، اللہ کے رسولوں پر ایمان، آخرت پر ایمان، تقدیر خیر وشر پر ایمان، اسی طرح نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج، اور پھر حدود، تعزیرات، حلال وحرام، معاملات، قوانین، اسلامی ہدایات وتعلیمات ان سب کی اساس اللہ کی عبودیت پر استوار ہوتی ہے، اور ان سب کا منبع وہ تعلیم ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کی طرف سے ہم تک پہنچائی ہے۔

اسلامی معاشرہ وہ معاشرہ ہے جو کلمہ شہادت اور اس کے تمام تقاضوں کی عملی تفسیر ہو۔ اگر یہ کلمہ اور اس کے تقاضوں کی کوئی جھلک معاشرے کے عملی زندگی میں نہ پائی جائے تو وہ اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔ گویا کلمہ شہادت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ایک ایسے مکمل نظام کی بنیاد ٹھہرتے ہیں جس پر امت مسلمہ کی

زندگی اپنی تمام تفصیلات اور ضروریات سمیت تعمیر ہوتی ہے۔اس بنیاد کے قیام سے پہلے زندگی کی تعمیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اسی طرح اگر اس بنیاد کے ماسوا کسی اور بنیاد پر زندگی کی عمارت اٹھائی جائے یا اس بنیاد کے ساتھ کسی اور بنیاد کو یا متعدد خارجی بنیادوں کو بھی شامل کر کے زندگی کی تعمیر کی کوشش کی جائے تو اس کے نتیجے میں قائم ہونے والے معاشرے کو اسلامی زندگی کا نمائندہ کسی طرح بھی نہیں کہا جاسکے گا۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ، اَمَرَ اَنۡ لَا تَعۡبُدُوۡا اِلَّا اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ. (یوسف:٤٠)

''حکم صرف اللہ کا ہے۔اُس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کی جائے، یہی دین قیّم (ٹھیٹھ اور سیدھا طریق زندگی) ہے''۔

مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ. (النساء:٨٠)

''جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی''۔

یہ مختصر اصولی اور فیصلہ کن بیان دین حق اور اس کی عملی تحریک سے تعلق رکھنے والے بنیادی مسائل کے بارے میں دوٹوک فیصلہ کرنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

اوّلاً: یہ ''مسلم معاشرے کی فطرت'' کے تعین میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

ثانیاً: ''مسلم معاشرے کی طریقہ تعمیر'' کی نشان دہی میں ہمیں اس سے مدد ملتی ہے۔اور

ثالثاً: ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اسلام نے جاہلی معاشروں کے ساتھ نمٹنے کے لیے کیا طریقِ تجویز کیا ہے ۔اور

رابعاً: وہ یہ تعین کرتا ہے کہ انسانی زندگی کی عملی صورتِ حال کو بدلنے کے لیے اسلام کا ضابطۂ کار کیا ہے۔یہ تمام مسائل وہ ہیں جو قدیم زمانے سے لے کر آج تک اسلامی تحریک کے نظام کار میں نہ صرف اساسی اہمیت کے حامل رہے ہیں بلکہ بڑے نازک اور فیصلہ کن سمجھے جاتے رہے ہیں۔

اسلامی معاشرے کا امتیازی وصف

مسلم معاشرے کا امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ معاشرہ اپنے تمام معاملاتِ زندگی میں صرف اللہ کی عبودیت کی اساس پر قائم ہوتا ہے، کلمۂ شہادت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اسی عبودیت کا اظہار کرتا ہے اوراس کی کیفیت متعین کرتا ہے۔ انسان کا اعتقاد بھی اسی عبودیت کا مظہر ہوتا ہے، عبادات وشعائر میں بھی اسی عبودیت کا پرتو پایا جاتا ہے، قوانین وضوابط اس کی عملی تصویر ہوتے ہیں۔ جو شخص اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وحدانیت پر یقین نہیں رکھتا تو اُس نے دراصل صرف ایک اللہ کی بندگی اختیار ہی نہ کی:

وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝ وَ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ۝

(النحل:۵۱-۵۲)

''اور اللہ کا فرمان ہے کہ دو الٰہ نہ بنالو۔ الٰہ تو بس ایک ہی ہے، لہٰذا تم مجھی سے ڈرو، اُسی کا ہے وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو اس زمین میں ہے اور خالصاً اُسی کا دین (کائنات میں) چل رہا ہے۔ پھر کیا اللہ کو چھوڑ کر کسی اور سے تقویٰ کرو گے''۔

اسی طرح جو شخص اللہ کے سوا کسی اور ہستی کے آگے یا اللہ کے ساتھ کسی اور ذات کو شریک کر کے عبادات وشعائر بجالاتا ہے وہ اللہ واحد کا بندہ نہیں ہوسکتا:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (انعام:۱۶۲-۱۶۳)

کہہ دیجیے میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔

اسی طرح جو شخص ان قوانین کو چھوڑ کر جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو دیے ہیں کسی اور منبع قوانین کو اخذ کرتا ہے تو وہ بھی اللہ کی بندگیٔ خالص سے محروم ہے:

اَمْ لِلّٰهِ شُرَكَاؤُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاذَنْ بِهِ اللّٰهُ. (شوری:۲۱)

کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریکِ اللہ رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے اذن نہیں دیا۔

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَانَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا. (حشر:۷)

جو کچھ رسول تمہیں دے اُسے پکڑ لو اور جس چیز سے روکے اُس سے رک جاؤ۔

یہ ہیں اسلامی معاشرے کی اقدارِ اصلی۔ اس معاشرے میں جس طرح افراد کے معتقدات وتصوارت میں بندگیٔ رب رچی بسی ہوتی ہے، اسی طرح ان کی عبادات اور شعائر ومناسک پر بھی بندگیٔ خالص کا رنگ چڑھا ہوتا ہے اور ان کا جماعتی نظام اور قوانین وضوابط بھی بندگیٔ رب کے عملی پیکر ہوتے ہیں۔ ان پہلوؤں میں سے ایک پہلو میں بھی اگر بندگی کا رنگ معدوم ہو تو پورے کا پورا اسلام کالعدم ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس طرح اسلام رکن اوّل، کلمہ شہادت جس پر اسلام کی بنیاد ہے سرے سے وجود پذیر ہی نہیں ہو سکتا۔

اوپر ہم نے عرض کیا ہے کہ اسلامی معاشرے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے افراد کے اعتقادات بھی اسی جذبۂ عبودیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ اسلامی اعتقاد کیا ہے؟

اسلامی اعتقاد کیا ہے؟

''اسلامی اعتقاد'' کس چیز کا نام ہے، دراصل یہ ایک ایسا اعتقاد اور تصور ہے جس کا پودا انسان کے شعور وادراک میں اس وقت پھوٹتا ہے جب وہ عقیدۂ اسلام کے حقائق ورموز کو براہ راست ربانی سرچشمۂ

ہدایت (قرآن) سے اخذ کرتا ہے۔اور جب اس تصوراوراعتقاد کانقش پوری طرح انسان کے ذہن پر مرتسم ہوجاتا ہےتو پھر اسے اپنے رب کی حقیقت کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔جس کائنات میں وہ سانس لے رہا ہوتا ہےاُس کی خفی اور جلی حقیقتیں بھی اُسی وقت اُس پر منکشف ہوتی ہیں،جس زندگی کی بدولت وہ زندہ انسانوں میں شمار ہوتا ہےاوران کےساتھ مربوط ہوتا ہےاُس کے پنہاں اورعیاں حقائق بھی اُس پر روشن ہوجاتے ہیں۔اورساتھ ہی عرفانِ ذات بھی اسے نصیب ہوتا ہے۔یعنی وہ خودانسان کی اصلیت سے باخبر ہوجاتا ہے۔پھراسی تصور کی بنیاد پر وہ تمام حقائق کےساتھ اپنے معاملات کی کیفیت متعین کرتا ہے،اپنے پروردگار کےساتھ ایسارویہ اختیار کرتا ہےجس میں اس کی عبودیت اور بندگی کے نور کا پرتو ہو،کائنات اور کائنات کےقوانین ونوامیس،ذی روذح مخلوقات ،نوع انسانی اوراس ک مختلف ادواروں کے بارے میں وہ ایسارویہ اختیار کرتا ہےجس کی جڑیں اللہ کےدین کےساتھ پیوست ہوتی ہیں اوراُس تعلیم سے ماخوذ ہوتی ہیں جورسول اللہ ﷺ کےذریعے انسانوں تک پہنچتی ہے۔اس طرح وہ اپنے پورے رویۂ زندگی کےاندراللہ کی عبودیت وبندگی کا اظہار کرتا ہے،اوریوں اس کی زندگی کی تمام سرگرمیوں پراسی پاکیزہ روش کی مُہر ثبت ہوتی جاتی ہے۔

اسلامی معاشرہ کووجود میں لانے کا طریقِ کار

مسلم معاشرے کے حدود اربعہ متعین ہوجانے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ اس نوعیت کا معاشرہ کیسے وجود میں آتا ہے؟اوراس کی تعمیر کا کیا طریقِ کار ہے؟

یہ معاشرہ اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتا جب تک پہلے ایک ایسا انسانی گروہ ظہور پذیر نہ ہو جو یہ فیصلہ کرچکا ہو کہ اس کی بندگی اورعبودیت تمام کی تمام صرف اللہ کے لیے مخصوص ہوگی،اور وہ اللہ کی بندگی کےساتھ کسی اورہستی کی بندگی کی شراکت کو گوارا نہیں کرے گا،نہ عقیدہ وتصور کےلحاظ سے غیر اللہ کی بندگی کوقبول کیا جائے گا،نہ عبادات وشعائر میں غیر اللہ کی اطاعت کودخل اندازی کا موقع دیا جائے

گا ،اور نہ ہی قوانین اور نظام زندگی کے اندر غیر اللہ کی بندگی کا کوئی شائبہ برداشت کیا جائے گا۔اس فیصلہ کے بعد یہ گروہ انسانی بالفعل اپنی زندگی کو اللہ کی عبودیت خالصہ کی بنیاد پر منظّم کرنا شروع کر دیتا ہے ۔اور اپنے ضمیر اور دل کی دنیا سے وہ ان تمام اعتقادات وتصورات کو کھرچ دیتا ہے جو غیر اللہ کی الوہیت کے قائل یا اللہ کی الوہیت میں کسی اور کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں۔اس معاشرے کی تمام مراسم عبادات ایک اللہ کے لیے مخصوص ہو جاتے ہیں اور اس کے سوا باقی سب اس کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔اس طرح کے مثالی اسلامی معاشرے کے تمام قوانین کا ماخذ صرف اللہ کی ذات ہوتی ہے۔اور ان الٰہی قوانین میں وہ کسی اور قانون کی آمیزش کو گوارا نہیں کرتا۔

یہی وہ رویہ ہے جس کو اختیار کرنے کے بعد یہ جماعت صحیح معنوں میں مسلم جماعت کہلائے گی اور جو معاشرہ یہ جماعت منظّم کرے گی اُسے ''مسلم معاشرہ'' کہا جا سکے گا۔کوئی انسانی جماعت اس طرز پر جو ہم نے اوپر بیان کی ہے اللہ کی خالص عبودیت کا اقرار کرنے سے قبل مسلم جماعت نہیں شمار ہو سکتی ،اور نہ عبودیت کی اساس پر اپنے نظامِ حیات کو استوار اور منظّم کرنے سے قبل اُس کا قائم کردہ معاشرہ ''مسلم معاشرہ قرار دیا جا سکتا ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ اولین بنیاد جس پر اسلام کی عمارت قائم ہوتی ہے اور مسلم معاشرہ تشکیل پاتا ہے یعنی ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کی شہادت ،وا پنے دونوں اجزاء سمیت قائم نہیں ہوتی ہے۔

اس لیے قبل اس کے کہ اسلام کے اجتماعی نظام کو قائم کرنے کے بارے میں سوچ بچار کیا جائے اور اس نظام کی اساس پر ایک مسلم معاشرے کے قیام کی تدبیریں تلاش کی جائیں ،ضروری ہے کہ اولین توجہ افراد کے قلب وضمیر کو غیر اللہ کی بندگی کی تمام صورتوں سے پاک کرنے پر صرف کی جائے۔اور جن لوگوں کے قلوب واذہان غیر اللہ کی بندگی سے پُوری طرح پاک وصاف ہوتے جائیں وہ سب مل کر ایک جماعت بنائیں ،یہی جماعت جس کے افراد اپنے اعتقادات وتصورات کے لحاظ سے ،مراسم عبادت کے لحاظ سے اور شریعت وقانون کے لحاظ سے غیر اللہ کی بندگی سے پوری طرح آزاد ہوں

،اسلامی معاشرے کی داغ بیل ڈالی جاسکتی ہے، اور جو شخص بھی اسلامی معاشرے میں زندگی بسر کرنا چاہے گا وہ اس میں شامل ہوتا جائے گا،اور اسے اس کا عقیدہ اس کی عبادات اور اس کا وہ قانون اختیار کرنا ہوگا جس میں اللہ کی عبودیت خالص کے سوا کسی اور چیز کا شائبہ تک نہ ہوگا یا دوسرے لفظوں میں وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی قولی شہادت کی عملی تصویر ہوگا۔یہی وہ نہج ہے جس کے مطابق دنیا کی پہلی اسلامی جماعت تشکیل ہوئی اور پہلا اسلامی معاشرہ منصۂ شہود پر آیا۔آئندہ بھی اسی نہج پر اسلامی جماعت کی نشو ونما ہوسکتی ہے اور اسلامی معاشرہ پھل پھول سکتا ہے۔

اسلامی معاشرہ اسی صورت میں آشنائے وجود ہوسکتا ہے کہ انسانی افراد اور گروہ اللہ کے ماسوا ہر ہستی کو چاہے وہ مستقل بالذات ہو یا اللہ کی شریک ہو۔ٹھکرا کر صرف اللہ واحد ولاشریک کی بندگی کو اپنائیں ،اور مستقل طور پر طے کرلیں کہ وہ اپنا نظامِ زندگی اللہ کی بندگی پر استوار کریں گے،اسی اجتماع اور فیصلہ سے ایک نیا معاشرہ جنم لے گا جو اگرچہ قدیم جاہلی معاشرہ ہی کے اندر سے برآمد ہوگا،مگر اپنے نئے عقیدہ وفکر اور نئے نظامِ زندگی کی بدولت فرسودہ جاہلی معاشرے کے لیے ایک چیلنج ثابت ہوگا۔یہ نیا نظامِ زندگی اسلام کے رکن اوّل توحید،اور رسالت محمدی ﷺ (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کے نور ازلی کی جلوہ گاہ ہوگا!!

عین ممکن ہے کہ قدیم جاہلی معاشرہ کلیتًا نئے اسلامی معاشرے میں مدغم ہوجائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو۔یہ بات بھی خارج از امکان نہیں کہ جاہلی معاشرہ مسلم معاشرے کے ساتھ مصالحت کرنے کی کوشش کرے۔اسی مسلم معاشرے کے خلاف جاہلیت کا ردِّعمل مسلح تصادم کی صورت بھی اختیار کرسکتا ہے۔ویسے اس باب میں سنت الٰہی تو یہی چلی آرہی ہے کہ جاہلی معاشرہ ہی اسلام پر شب خون مارتا ہے۔کبھی اس نے جیشِ اسلام کے اُس ہراول دستے پر چڑھائی کی، جو اسلامی معاشرے کی داغ بیل ہی سے ابھی فارغ نہ ہوا تھا،اور متفرق افراد اور گروہوں کی شکل میں بٹا ہوا تھا۔اور کبھی اس نے اسلامی معاشرہ کے قیام کے بعد اُس پر چڑھائی کی۔حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک بلا

استثناء اسلامی دعوت کی پوری تاریخ میں یہی صورت حال پیش آتی رہی ہے۔

یہ ایک واضح اور طبعی حقیقت ہے کہ نیا اسلامی معاشرہ اس وقت تک نہ تعمیر کے کسی مرحلے کو طے کر سکتا ہے اور نہ اپنے وجود کو منوا سکتا ہے، جب تک وہ اس درجہ قوت حاصل نہ کر لے کہ اس کے بل پر قدیم جاہلی معاشرہ کے دباؤ کا بآسانی مقابلہ کر سکے۔ یہی نہیں بلکہ یہ قوت ہمہ جہتی اور ہمہ گیر بھی ہونی چاہیے ۔اعتقاد اور تصور کی قوت، اخلاق اور نفسیاتی تربیت کی قوت، تنظیم کی قوت اور جماعتی نظام کی قوت، اور ساری قوتیں جن کی مدد سے وہ جاہلی معاشرے کا مقابلہ کر سکے، اور اُس پر اگر غلبہ حاصل نہ کر سکے تو کم از کم اُس کے سامنے ڈٹا رہے اور کسی طرح کی ہزیمت کا شکار نہ ہو۔

جاہلی معاشرے کی خصوصیات

اب آیئے یہ دیکھیں کہ ''جاہلی معاشرہ'' کی کیا حقیقت ہے اور اسلام اُس کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا طریقِ کار اختیار کرتا ہے؟

مختصر لفظوں میں اسلام کی نظر میں مسلم معاشرہ کے سوا ہر دوسرا معاشرہ جاہلی معاشرہ ہے۔ اگر ہم اس کی صحیح منطقی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ: ہر وہ معاشرہ جو اپنی بندگی کو خواہ وہ اعتقاد و تصور میں ہو، مراسم عبادت میں ہو یا قانونی نظام میں، صرف اللہ کے لیے خالص نہیں کرتا، وہ جاہلی معاشرہ کہلائے گا۔ اس تعریف کی رُو سے آج دنیا میں جتنے معاشرے پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب ''جاہلی معاشرے'' ہیں

کمیونسٹ معاشرے اس سلسلے میں سرِ فہرست ہیں۔

اوّلاً: اس بنا پر کہ انہوں نے اللہ سبحانہ وتعالٰی کی ذات برتر کے متعلق الحادی کی روش اختیار کر رکھی ہے اور اللہ کی ہستی کے سرے سے منکر ہیں۔ اور اس نظریہ کے علمبردار ہیں کہ اس کائنات کا خالق اور علت مادہ یا نیچر ہے، اور انسان اور اس کی تاریخ کا خالق اور محرک اقتصادیا آلات پیداوار ہیں۔

ثانیاً: اس بنا پر کہ جو نظامِ زندگی وہ قائم کرتے ہیں اس میں بندگی کا حق اللہ تعالیٰ کو نہیں بلکہ کمیونسٹ پارٹی کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کی دلیل وہ اقتدار اور پیشوائی ہے جو کمیونسٹ ملکوں میں بالفعل کمیونسٹ پارٹی کو حاصل ہوتی ہے۔ مزید براں کمیونزم کے ان تصورات اور اس نظام کے جو نتائج عملاً مترتب ہوتے ہیں وہ بھی ایک ''جاہلی معاشرہ'' ہی کے رنگ ڈھنگ ہیں۔ مثلاً انہی تصورات کا یہ شاخسانہ ہے کہ انسان کے ''بنیادی مطالبات'' صرف وہی سمجھے جاتے ہیں جو حیوان کے مطالبات ہوتے ہیں۔ یعنی کھانا پینا، لباس، مکان اور جنسی تسکین، انسان کو ایک جانور سمجھنے کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بحیثیت انسان اس میں جو اعلیٰ اخلاقی اوصاف پائے جاتے ہیں، انہیں پوری طرح پامال کیا جاتا ہے۔ اور ان تمام ضروریات اور تقاضوں میں سرفہرست اللہ پر ایمان، اس ایمان کو اختیار کرنے کی کُھلی آزادی اور اس کے اظہار و اعلان کا غیر مشروط حق ہے۔ اسی طرح انسان کے لیے اظہارِ ''انا'' کی آزادی بھی انسانیت کی خاص خصوصیت ہے۔ یہ انا گونا گوں رُوپوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ انفرادی ملکیت میں اسی انا کا ظہور ہوتا ہے۔ نوعیت کار کے انتخاب اور اس میں خصوصی مہارت پیدا کرنے میں بھی اسی کو دخل ہوتا ہے۔ فن کے ذریعے شخصیت کے اظہار میں بھی اس کا اضطراب کارفرما ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اشترا کی نظام ہر اُس آزادی سے انسان کے لیے پیغام حرمان نصیبی لے کر آتا ہے جو انسان اور حیوان اور انسان اور مشین کے درمیان مابہ الامتیاز ہے۔

تمام بت پرست اور مشرک معاشرے بھی جاہلی معاشروں کی صف میں شامل ہیں۔ اس نوعیت کے معاشرے آج تک ہندوستان، جاپان، فلپائن اور افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ جو بات انہیں جاہلی معاشروں میں داخل کرتی ہے وہ یہ ہے کہ:

اوّلاً: یہ معاشرے اللہ کے ماسوا کچھ اور ہستیوں کی صفت الوہیت میں اعتقاد رکھتے ہیں یا الوہیت میں اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں۔

ثانیاً: انہوں نے طرح طرح کے دیوتا اور معبود تراش رکھے ہیں جن کے بارے میں نہ صرف وہ

الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہیں بلکہ ان کے سامنے عملاً مراسم عبودیت و نیاز مندی بھی بجالاتے ہیں۔ یہ بات بھی ان معاشروں کو جاہلی معاشرہ ٹھہرانے کے لیے کافی ہے کہ ان میں جو قوانین اور شرائع نافذ کیے جاتے ہیں اُن کا منبع و ماخذ بھی اللہ اور اس کی شریعت نہیں بلکہ دوسری ہستیاں ہوتی ہیں، خواہ وہ پادری ہوں یا کاہن پروہت ہوں یا جادوگر ہوں، اکابر قوم ہوں یا وہ سیکولر ادارے ہوں جو شریعتِ الٰہی سے بے نیاز ہوکر قانون سازی کرتے ہیں، اور جنہیں قوم، پارٹی یا کسی ہستی کے نام پر حاکمیت اعلیٰ کا منصب حاصل ہوتا ہے، حالانکہ حاکمیت اعلیٰ کا منصب سوائے اللہ کے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اور اُسے صرف اسی شکل میں بروئے کار لایا جاسکتا ہے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعے اپنے بندوں کے لیے پسند فرمائی ہے۔

روئے زمین پر پائے جانے والے تمام یہودی اور عیسائی معاشرے بھی جاہلی معاشرے ہیں، انہوں نے اپنے عقائد میں تحریف کررکھی ہے اور الوہیت کو صرف اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت قرار دینے کے بجائے دوسروں کو بھی اُس میں شریک ٹھہراتے ہیں۔ اس شرک نے کئی صورتیں اختیار کررکھی ہیں۔ کہیں یہ ابنیت کی صورت شکل میں ہے اور کہیں تثلیث کی شکل میں۔ کہیں اس نے اللہ کے بارے میں ایسا تصور قائم کررکھا ہے جو اللہ کی حقیقت کے منافی ہے۔ کہیں اس نے مخلوق کے ساتھ اللہ کے تعلق کو ایسا رنگ دے رکھا ہے جو سراسر خلافِ حق ہے۔

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ. (توبة: ٣٠)

یہودی کہتے ہیں عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں اُن لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے۔ اللہ کی مار ان پر یہ کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہیں۔

لَقَدُ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَمَا مِنُ اِلٰهٍ اِلَّا اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَ اِنُ لَّمُ يَنُتَهُوُا عَمَّا يَقُوُلُوُنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيُنَ كَفَرُوُا مِنُهُمُ عَذَابٌ اَلِيُمٌ (مائده:٧٢-٧٣)

یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے، حالانکہ ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اُس کو دردناک سزا دی جائے گی۔

وَ قَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتُ اَيُدِيُهِمُ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا بَلُ يَدَاهُ مَبُسُوُطَتٰنِ يُنُفِقُ كَيُفَ يَشَآءُ. (مائده:٦٤)

یہودی کہتے ہیں اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، باندھے گئے ان کے ہاتھ اور لعنت پڑی ہے اِن پر اُس بکواس کی بدولت جو یہ کرتے ہیں، اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

وَ قَالَتِ الْيَهُودُ وَ النَّصٰرٰى نَحُنُ اَبُنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ قُلُ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمُ بِذُنُوُبِكُمُ بَلُ اَنۡتُمُ بَشَرٌ مِّمَّنُ خَلَقَ. (مائده:١٨)

یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ان سے پوچھو پھر وہ تمہارے گناہوں پر تمہیں سزا کیوں دیتا ہے۔ درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو اور انسان اللہ نے پیدا کیے ہیں۔

یہ معاشرے اس بھی جاہلی ہیں کہ انہوں نے اپنے لیے عبودیت کے جو مراسم اور پرستش کی جو شکلیں وضع کر رکھی ہیں وہ ان کے گمراہانہ عقائد اور مشرکانہ تصورات سے ماخوذ ہیں اور اس لیے بھی یہ جاہلی معاشرے ہیں کہ ان کے تمام قوانین و شرائع بندگیٔ رب کی اساس پر قائم نہیں ہیں، نہ وہ اللہ کی بے ہمتا حاکمیت کا اقرار کرتے ہیں اور نہ اللہ کی شریعت کو اختیارات کی واحد اساس تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے انسانوں پر مشتمل ایسے ادارے قائم کر رکھے ہیں جنہوں نے حاکمیتِ اعلیٰ کے اُس منصب و مقام پر

قبضہ جما رکھا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ قرآن نے اپنے نزول کے دور میں ایسے لوگوں کو مشرک اور کافر کا لقب دیا تھا۔ کیونکہ ان لوگوں نے حاکمیت کا یہی حق اپنے احبار و رھبان کو دے رکھا تھا، جو من مانی شریعت وضع کرتے تھے اور یہ لوگ اسے بے چوں و چرا قبول کرتے تھے۔

اِتَّخَذُوْآ اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ مَآ اُمِرُوْآ اِلَّا لِيَعْبُدُوْآ اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ. (توبة:٣١)

انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا ربّ بنالیا ہے اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں ہے، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

یہ لوگ اپنے احبار و رھبان کی الوہیت کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے اور نہ ان کے سامنے مراسم بندگی بجالاتے تھے۔ بلکہ فقط یہ تسلیم کرتے تھے کہ احبار و رھبان کو حاکمیت کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ وہ اللہ کے اذن و حکم سے بے نیاز ہو کر جو شریعت سازی کرتے تھے یہ لوگ اُسے اختیار کر لیتے تھے۔ اگر اُس وقت قرآن نے انہیں مشرک اور کافر کہہ کر پکارا تھا تو آج تو بدرجہ اولیٰ ان کا مشرک اور کافر ہونا ثابت ہے۔ اس لیے کہ آج انہوں نے جن لوگوں کو یہ حق دے رکھا ہے وہ احبار و رھبان نہیں ہیں بلکہ ان کے ہم پلہ افراد ہیں۔

اس سلسلے میں آخری بات سمجھ لینی چاہیے کہ موجودہ دور میں پائے جانے والے نام نہاد ''مسلم'' معاشرے دراصل جاہلی معاشرے ہیں۔ جس بنا پر ہم انہیں جاہلی معاشروں شمار کرتے ہیں وہ یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور ہستی کی الوہیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یا غیر اللہ کے سامنے مراسم بندگی بجالاتے ہیں بلکہ وہ اس معنی میں جاہلی معاشرے ہیں کہ ان کا نظامِ حیات بندگئ رب کے اصول پر نہیں چل رہا ہے۔ وہ اگرچہ اللہ کے سوا کسی اور الٰہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر انہوں نے الوہیت کی صفت

خاص یعنی حاکمیت کو دوسروں کے حوالے کررکھا ہے،اور غیر اللہ کی حاکمیت تسلیم کررکھی ہے۔یہی حاکمیت ان کے نظام زندگی ،قوانین ،اقدار ومعیار حیات ،روایات ،رسم ورواج الغرض تقریباً ان کی پوری حیات اجتماعی کی اساس ہے۔ارباب حاکمیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشار ہے:

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ. (مائدہ:٤٤)

جولوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

اورمحکومین کے بارے میں فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ. (النساء:٦٠)

اے نبی !تم نے دیکھانہیں اُن لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس کتاب پر جوتمہاری طرف نازل کی گئی ہےاوران کتابوں پر جوتم سے پہلے نازل کی گئی تھیں،مگر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کاحکم دیا گیا تھا۔

فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا. (النساء:٦٥)

نہیں اے محمد (ﷺ) تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں،پھر جو کچھ تم فیصلہ کرواسے اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں۔بلکہ سربسر تسلیم کرلیں۔

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہود اور نصاریٰ کو اسی جرم کا مرتکب قرار دیا تھا۔اوران کے جرائم کی فہرست میں شرک ،کفر،اللہ کی بندگی سے انحراف ،اوراس کے مقابلے میں احبار ورھبان کی بندگی اختیار کرلینا بتایا تھا،اوران تمام جرائم کی واحد بنیاد یہ بتائی کہ انہوں نے احبار ورھبان کو وہی حقوق اوراختیارات

دے رکھے تھے جو آج اسلام کا دعویٰ کرنے والوں انے اپنی ہی ملت کے کچھ لوگوں کو دے رکھے ہیں ۔یہود اور نصاریٰ کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کے نزدیک ویسا ہی شرک قرار پایا جیسا شرک نصاریٰ کا عیسیٰ ابن مریم کو رب اور الٰہ بنانا، اور اُن کی بندگی کرنا تھا۔ اسلام کے نزدیک شرک کی ان دو اقسام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں یکساں لحاظ سے اللہ واحد کی بندگی سے خروج، دین الٰہی سے سرتابی اور لا الٰہ الا اللہ کی شہادت سے انحراف کے مترادف ہیں۔

موجودہ مسلم معاشروں میں سے بعض تو برملا اپنی ''لادینیت'' کا اعلان کرتے ہیں۔ اور دین کے ساتھ اپنے ہر گونہ تعلقات کی کلی طور پر نفی کرتے ہیں۔ بعض معاشرے سے زبان کی حدتک ''دین کا احترام'' کرتے ہیں۔ مگر اپنے نظام اجتماعی سے انہوں نے دین کو فارغ خطی دے رکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ''غیب'' کے قائل نہیں ہیں، ہم اپنے اجتماعی نظام کی عمارت ''علم وتجربہ'' پر اٹھائیں گے۔ جہاں ''علم اور تجربہ'' ہوگا وہاں ''غیب'' نہیں چل سکے گا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں ۔لیکن ان کا یہ خیال بذات خود ایک نوع کی جہالت ہے، اور صرف وہی لوگ اس طرح کی باتیں کر سکتے ہیں جو سراسر جہالت کے پتلے ہوں کچھ ایسے معاشرے بھی ہیں جنھوں نے حاکمیت کی زمامِ کار عملاً غیر اللہ کا سونپ رکھی ہے، وہ جیسی شریعت چاہتے ہیں گھڑ لیتے ہیں، اور پھر اپنی اس خانہ ساز شریعت کے بارے میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ''یہ اللہ کی شریعت ہے'' یہ تمام معاشرے اس لحاظ سے مساوی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کی بنیادیں بندگیٔ رب پر قائم نہیں ہیں۔

اس اصولی حقیقت کے الم نشرح ہو جانے کے بعد ان تمام جاہلی معاشروں کے بارے میں اسلام کا موقف ایک فقرے میں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ''اسلام ان تمام معاشروں کی اسلامیت اور قانونی جواز کو تسلیم نہیں کرتا''۔ اسلام کی نظر ان لیبلوں، ٹائٹلوں اور سائن بورڈوں پر نہیں ہے جو ان معاشروں نے اپنے اوپر لگا رکھے ہیں۔ اس ظاہر فریبی کے باوجود ان تمام معاشروں میں ایک بات مشترک پائی جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان سب کا نظامِ زندگی اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی سے خالی ہے۔ اس لحاظ سے یہ

معاشرے دوسرے کافر اور مشرک معاشروں کے ساتھ جاہلیت کے وصف میں ہم رنگ اور ہم آہنگ ہیں۔

اس بحث سے اب ہم خود بخود اس آخری نکتہ پر پہنچ گئے ہیں، جسے ہم نے اس فصل کے آغاز میں بیان کیا ہے، یعنی انسانی زندگی میں تبدیلی لانے کے لیے اسلام کا دائمی اور ابدی طریق کار کیا ہے۔ وہ طریقِ کار جو قیدِ زمان ومکان سے آزاد ہے۔ اور ہر زمانے میں خواہ وہ دور حاضر ہو یا آنے والا کوئی دور بعید۔ اسلام کا واحد طریقہ کار رہے گا۔ اس سوال کا جواب ہم اُس بحث کی روشنی میں معلوم کر سکتے ہیں جو ہم اوپر "مسلم معاشرے کی فطرت وحقیقت" کے عنوان سے کر چکے ہیں، اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلم معاشرہ اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے کو اللہ کی بندگی پر قائم کرتا ہے۔ مسلم معاشرے کی یہ فطرت معین ہو جانے کے بعد ہمیں ایک اور اہم سوال کا دوٹوک جواب بھی مل سکتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ وہ اصل کیا ہے جسے انسانی زندگی کا ماخذ ومرجع اور بِنا اساس ہونا چاہیے؟ کیا اللہ کا دین اور اس کا پیش کردہ نظام حیات ہماری یہ ضروریات پوری کرسکتا ہے؟ یا اس کے لیے ہمیں کسی انسانی نظام حیات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا؟

اسلام اس سوال کا نہایت دوٹوک اور غیر مبہم اور جواب بلا تأمل وتردد ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کو من حیث المجموع جس اصل کو اپنا مرجع واساس قرار دینا چاہیے وہ اللہ کا دین اور اس کا تجویز کردہ نظام حیات ہے۔ جب تک اس کو حیات اجتماعی کی اساس اور اس کا محور ومرکز نہ بنایا جائے گا لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت جو اسلام کا رکن اوّل ہے نہ قائم ہو سکے گا اور نہ اپنے حقیقی اثرات ونتائج ہی پیدا کر سکے۔ جب تک اس اصل کو تسلیم نہ کیا جائے اور بے چوں وچرا اس کا اتباع نہ کیا جائے اُس وقت تک اللہ کی بندگیٔ خالص کا تقاضا رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقہ کار کے مطابق ہرگز پورا نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَانَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا. (حشر:۷)

رسول جو کچھ تمہیں دے اُسے پکڑ لو اور جس چیز سے منع کرے اُس سے رک جاؤ۔

مزید براں اسلام انسان کے سامنے یہ سوال بھی رکھتا ہے کہ:انتم اعلم ام اللّٰه؟ (کیا تم زیادہ علم رکھتے ہو یا اللہ؟) اور پھر خود ہی یہ جواب دیتا ہے کہ:و اللّٰه یعلم و انتم لاتعلمون (اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے) و ما اوتیتم من العلم الا قلیلا (جو کچھ تمہیں علم دیا گیا ہے وہ بہت کم ہے)۔اب ظاہر ہے کہ وہ ہستی جو علم رکھتی ہے، جس نے انسان کو پیدا کیا، اور جو اس کی رزق رساں ہے اُسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ انسان کی حکمران بھی ہو اور اُس کا دین زندگی کا نظام ہو، اور اسی کو زندگی کا مرجع و منبع ٹھہرایا جائے ۔رہا انسان کے خود ساختہ افکار و نظریات تو ان میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔اور وہ انحراف کا شکار ہو جاتے ہیں، کیوں کہ وہ انسانی علوم پر مبنی ہوتے ہیں اور ناقص ہوتے ہیں۔انسان خود ناآشنائے راز ہے۔اور جو علم اسے دیا گیا ہے وہ بہت تھوڑا اور ناقص ہے۔

اللہ کا دین کوئی چیستاں نہیں ہے اور نہ اس کا پیش کردہ نظامِ حیات کوئی سیال شئے ہے کلمۂ شہادت کے دوسرے جزء میں اُس کی واضح حد بندی کر دی گئی ہے۔اور اُن نصوص اور قواعد و اصول میں اُسے منضبط کر دیا گیا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائے ہیں۔اگر کسی معاملے میں نص موجود ہو تو وہی بنائے فیصلہ ہوگی اور نص کے ہوتے ہوئے اجتہاد کی گنجائش نہ ہوگی، اور اگر نص نہ پائی جائے گی تو اجتہاد اپنا رول ادا کرے گا، مگر اُن اصولوں اور ضابطوں کے تحت جو اللہ نے اپنے نظامِ حیات میں بیان کر دیے ہیں نہ کہ اہواء و خواہشات کا تابع بن کر:

فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ. (النساء:۵۹)

اگر کسی بات میں تمہارے درمیان نزاع برپا ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔

اجتہاد و استنباط کے اصول بھی مقرر کر دیئے گئے ہیں۔اور وہ معلوم و معروف ہیں۔ان میں کوئی ابہام نہیں پایا جاتا ہے اور نہ اُن میں کسی نوعیت کا ڈھیلا بن پایا جاتا ہے۔مگر کسی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ

اپنے بنائے قانون کواللہ کی شریعت بتائے۔البتہ اگراللہ کی حاکمیت اعلیٰ کا اعلان کر دیا جائے،اورقوت واختیار کا ماخذ صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہو،کوئی قوم یا پارٹی یا کوئی فرد بشر اس کا سرچشمہ نہ ہو،اورمنشائے الٰہی معلوم کرنے کے لیے اللہ کی کتاب اوراس کے رسول کی سنت کی طرف رجوع کیا جاتا ہوتو ایسی صورت میں جو قانون سازی ہوگی وہ شریعت کی حدود کے اندر شمار ہوگی۔مگر یہ حق ہر اُس شخص کونہیں دیا جاسکتا جواللہ کے نام پر اپنے اقتدار کا سکہ جمانا چاہتا ہو۔جیسا کہ کسی زمانے میں یورپ تھیا کریسی اور''مقدس بادشاہت'' کے پردے میں اس کا مزہ چکھ چکا ہے۔اسلام میں اس طرز کی حکومت کی کوئی گنجائش نہیں ہے، یہاں رسول اللہ ﷺ کے سوااللہ کے نام پر کسی اورکواپنا حکم چلانے کا اختیار نہیں ہے ۔یہاں واضح اوربیّن نصوص موجود ہیں جوشریعت الٰہی کے حدودواربعہ کاتعین کردیتی ہیں۔

''دین زندگی کے لیے ہے'' یہ ایک ایسا جملہ ہے جسے انتہائی غلط معنی پہنائے گئے ہیں اوراسے یکسر غلط استعمال کیا جاتا رہا ہے۔بےشک''دین زندگی کے لیے ہے'' مگرکس قسم کی زندگی کے لیے؟

یہ دین اس زندگی کے لیے ہے جسے یہ خودتعمیر کرتا ہے،اوراپنے طریقِ کار کے مطابق پروان چڑھاتا ہے۔یہ زندگی انسانی فطرت سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوتی ہے اورانسان کی تمام حقیقی ضروریات کی کفیل ہوتی ہے۔ضروریات سے مرادوہ''ضروریات''نہیں جن کوانسان بزعم خویش اپنی ضروریات سمجھ بیٹھتا ہے، بلکہ ان کاتعین صرف وہی ہستی طے کرسکتی ہےاورکرے گی،جس نے انسان کو پیدا کیااوراس کی اوراپنی اوردوسری مخلوق کی تمام ضروریات سے بخوبی واقف ہے۔

اَلَا يَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيۡفُ الۡخَبِيۡرُ. (ملك:١٤)

کیا جس نے مخلوق کو پیدا کیا ہے وہ اس کے حال کونہیں جانتا ہے۔وہ تو باریک بین اورباخبر ہے۔

دین کا کام یہ نہیں ہے کہ جس طرز کی بھی زندگی ہووہ اُسے برحق ثابت کرتا پھرے،اوراس کے لیے سند جوازفراہم کرکے دے اورایسا شرعی فتوے اُس کے لیے مہیا کردے جسے وہ مستعار لیبل کی طرح اپنے

اوپر چسپاں کرلے۔ بلکہ دین تو اس لیے ہے کہ وہ زندگی کو اپنی کسوٹی پر پرکھے، جو کھرا ہواُسے برقرار رکھے اور جو کھوٹا ثابت ہواُسے اٹھا کر پرے پھینک دے۔ اگر زندگی کا پورا نظام بھی اس کی مرضی کے خلاف ہوتو وہ اُسے ختم کرکے اُس کی جگہ نئی زندگی کی تعمیر کرے۔

دین کی تعمیر کردہ یہ زندگی ہی اصل اور برحق زندگی ہوگی۔ اس فقرے کا مفہوم یہی ہے کہ اسلام زندگی کا دین ہے۔ اس فقرے میں اس کے علاوہ کسی اور مفہوم کی تلاش کسی طرح بھی صحیح اور درست نہیں ہوگی!

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ ''کیا بشری مصلحت ہی وہ اصل چیز نہیں ہے جسے انسانی زندگی کی صورت گری کرنا چاہیے؟'' لیکن ہم یہاں پھر اسی سوال کو قارئین کے سامنے رکھیں گے، جسے اسلام خود اٹھاتا ہے اور خود ہی اس کا جواب دیتا ہے کہ: انتم أعلم ام اللہ (کیا تمہیں زیادہ علم ہے یا اللہ کو) واللہ یعلم وانتم لاتعلمون (دراصل اللہ ہی جانتا اور علم رکھتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو)۔ شریعت الٰہی جس شکل میں اللہ نے نازل فرمائی ہے اور جس شکل میں اللہ کے رسول نے ہم تک پہنچائی ہے وہ خود بشری مصالح کا پُورا پُورا لحاظ کرتی ہے۔ اگر کبھی انسان کو یہ گمان ہوتا ہے کہ اس کی مصلحت اس قانون کی پابندی میں نہیں بلکہ خلاف ورزی میں ہے جو اللہ نے انسانوں کے لیے تجویز فرمایا ہے تو اوّلاً تو اس کے اس قیاس اور احساس کی حیثیت ایک واہمہ اور وسوسہ سے زیادہ نہیں:

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَ لَقَدْ جَآءَ هُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝
اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَ الْاُوْلٰى ۝ (النجم:۲۳-۲۵)

یہ لوگ بس اٹکل اور اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں اس کے باوجود کہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔ کہیں انسان کو من مانی مراد بھی ملی ہے۔ سو آخرت اور دنیا میں سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

اور ثانیاً اسے یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ شریعت کے بارے میں اس موقف کا اختیار کرنا کفر کے مترادف ہے۔ آخر یہ کیوں ہوسکتا ہے کہ ایک شخص یہ اعلان بھی کرے کہ اس کی رائے میں مصلحت

ومنفعت شریعت الٰہی کی مخالفت میں ہے اور اس کے باوجود اس دین کا پیرو بھی رہے، اور صرف پیرو ہی نہ رہے بلکہ اہل دین میں شمار ہو!!

❁❁❁❁❁

باب ششم

آفاقی ضابطۂ حیات

اِسلام فکر وعمل کی دنیا میں اپنے عقیدہ کی عمارت اللہ کی بندگیٔ کامل کی نیاد پر اٹھاتا ہے۔اس کے اعتقادات،عبادات اور جملہ قوانین حیات سب میں یکساں طور پر اس بندگی کا اظہار ہوتا ہے بندگی کی اسی جامع صورت کو وہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کی قولی شہادت کا صحیح عملی تقاضا گردانتا ہے اور رسول اللہ ﷺ سے کیفیت بندگی کی تفصیل کا حصول اس کے نزدیک ''محمد رسول اللہ'' کی شہادت کا ناگزیر عملی نتیجہ ہے۔اسلام اپنی عمارت اس طرح اٹھاتا ہے کہ کلمۂ شہادت کے دونوں حصے اسلامی نظامَ زندگی کا تعین کریں اس کے نورانی خدوخال کی صورت گری کریں اور اس کی خصوصیات کو طے کریں،اسلام اگر ایسی لاثانی طرز پر اپنی عمارت چنتا ہے جو تاریخ کے تمام انسانی نظاموں سے اُسے جداگانہ حیثیت دے دیتی ہے تو دراصل اسلام اپنے اس رویّے کی بدولت اُس ''مرکزی قانون'' سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے جو صرف انسانی وجود ہی کو نہیں پوری کائنات کو بھی محیط ہے،اور جس کا دائرہ عمل صرف انسانی زندگی کے نظام تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ پورے نظام ہستی کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

پوری کائنات ایک ہی مرکزی قانون کے تابع ہے

اسلامی نظریہ کے مطابق اس تمام کائنات کو اللہ نے خلعتِ تخلیق بخشا ہے،اللہ تعالیٰ نے اُس کو جود میں لانے کا ارادہ فرمایا اور وہ وجود پذیر ہوگئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ایسے نوامیس فطرت ودیعت کردیے جن کی بدولت وہ حرکت کررہی ہے۔اسی کے طفیل اُس کے تمام اجزاء اور پرزوں کی حرکت

میں بھی تناسب اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اس کی کلی حرکت میں بھی نظم وضبط اور تناسب وتوازن ملتا ہے:

اِنَّمَا قَوۡلُنَا لِشَیۡءٍ اِذَآ اَرَدۡنٰہُ اَنۡ نَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ. (نحل:۴۰)

جب ہم کسی چیز کو وجود میں لانا چاہتے ہیں تو اُسے صرف یہی کہنا ہوتا ہے کہ ہو جا اور بس وہ ہو جاتی ہے۔

وَ خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا. (فرقان:۲)

اور اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اُسے ٹھیک ٹھیک اندازے پر رکھا۔

اس کائنات کے پس پردہ ایک ارادہ کارفرما ہے جو اس کی تدبیر کرتا ہے، ایک طاقت ہے جو اسے حرکت بخشتی ہے، ایک قانون ہے جو اسے پابند نظم رکھتا، یہی قوت اس کائنات کے مختلف اجزاء میں نظم وضبط قائم رکھتی ہے اور ان کی حرکت وگردش کو ایک ضابطے میں کس کر رکھتی ہے۔ چنانچہ نہ وہ کبھی ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، نہ ان کے نظام میں کبھی کوئی خلل ہی واقع ہوتا ہے، وہ کبھی متعارض و بے ہنگم نہیں ہوتے، اُن کی مسلسل و منظّم حرکت میں کبھی ٹھہراؤ راہ نہیں پاتا، وہ اُس وقت تک جاری ہے اور رہے گی جب تک مشیتِ الٰہی اُسے جاری رکھنا چاہے گی۔ یہ کائنات اس مدبر ارادے، محرک قوت اور غالب وقاہر ضابطے کی مطیع اور تابع اور اس کے آگے سر عجز و نیاز خم کیے ہوئے ہے۔ حتیٰ کہ ایک لمحے کے لیے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ اس الٰہی ارادے سے سرتابی کرے، اس کی نافرمانی کرے اور اس کے بنائے ہوئے قانون کے خلاف چلے۔ اسی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری کی وجہ سے یہ کائنات صحیح وسلامت گردش کر رہی ہے، اور اس وقت تک اس میں کوئی خرابی اور فساد اور انتشار راہ نہیں پا سکتا جب تک مشیت الٰہی اسے ختم کرنے کا فیصلہ نہ کر دے۔

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّہَارَ یَطۡلُبُہٗ حَثِیۡثًا وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ وَ النُّجُوۡمَ

مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِہٖ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ. (اعراف:٥٤)

درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا ، پھر اپنے تختِ سلطنت پر متمکن ہوا ، جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔ جس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کیے۔ سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو ، اُسی کی خلق ہے اور اُسی کا امر ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ، سارے جہانوں کا مالک اور پروردگار۔

انسان غیرارادی پہلوؤں میں مرکزی قانون کا تابع ہے

انسان اس کائنات کا ایک جز ہے۔ جو قوانین انسان کی فطرت پر فرمانروائی کرتے ہیں وہ اس مرکزی نظام سے مستثنیٰ نہیں ، جو پوری کائنات کو محیط ہے۔ اس کائنات کو بھی اللہ ہی نے خلعت وجود بخشا۔ اور انسان کا خالق بھی اللہ ہے۔ انسان کی جسمانی ساخت اسی زمین کی مٹی سے کی گئی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر کچھ ایسی خصوصیات بھی رکھ دی ہیں جو ایک ذرّہ خاکی سے فزوں تر ہیں۔ انہی کی بدولت آدمی انسان بنتا ہے، لیکن یہ خصوصیات اللہ تعالیٰ نے ایک مقرر اندازے کے مطابق اُسے ارزانی فرمائی ہیں۔ انسان اپنے جسمانی وجود کی حد تک طوعاً وکرھاً اُس قانون کا تابع ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُس کے لیے مقرر فرما دیا ہے۔ اس کی تخلیق کا آغاز اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے نہ کہ اس کی اپنی مرضی سے یا اپنے باپ اور ماں کی مرضی سے۔ اس کے ماں اور باپ صرف باہمی اتصال پر قادر ہیں، لیکن قطرۂ آب کو وجود انسانی میں بدلنے کی طاقت وہ ہرگز نہیں رکھتے۔ اللہ نے مدتِ حمل اور طریقۂ ولادت کے لیے جو اصول وضع فرما دیا ہے انسان اُسی کے مطابق پیدا ہوتا ہے۔ اور اُسی ہوا میں سانس لیتا ہے جو اللہ نے اُس کے لیے پیدا کی ہے، اور اتنی مقدار میں اور اسی کیفیت کے تحت لیتا ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دی ہے۔ وہ قوت احساس وادراک رکھتا ہے، درد سے متاثر ہوتا ہے، اُسے بھوک اور پیاس ستاتی

ہے، وہ کھاتا اور پیتا ہے، الغرض وہ چاہے نہ چاہے اس کو اپنی پوری زندگی ناموسِ الٰہی کے مطابق بسر کرنا پڑتی ہے، اور اُس کے ارادہ واختیار کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے اس میں اور اس کائنات اور اس میں پائی جانے والی ذی روح اور غیر ذی روح مخلوق میں سرِ مُو فرق نہیں ہے۔ سب اللہ کی مشیت قدرت اور قانون کے آگے غیر مشروط طور پر سر تسلیم واطاعت خم کیے ہوئے ہیں۔

جس اللہ نے اس کائنات کو وجود بخشا اور انسان کو پیدا کیا، اور جس نے انسان کو بھی ان قوانین کے تابع بنایا جن قوانین کے تابع یہ پوری کائنات ہے، اُسی ذات بے عیب نے انسان کے لیے ایک شریعت مقرر فرمائی ہے جس سے وہ اپنی ارادی زندگی کی بھی تنظیم کرسکتا ہے اور اُسے طبعی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ بھی کرسکتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ شریعت اُسی ہمہ گیر قانونِ الٰہی کا ایک حصہ ہے جو انسان کی فطرت پر اور اس مجموعی کائنات کی فطرت پر فرماں روائی کر رہا ہے۔ اور اس کو ایک لگے بندھے ضابطے کے تحت چلا رہا ہے۔

اللہ کا ہر کلمہ، اس کا ہر امر ونہی، اس کی ہر وعید، اس کا ہر قانون، اور اس کی ہر ہدایت کائنات کے مرکزی قانون ہی کا ایک حصہ ہے اور ویسے ہی سر بسر سچائی اور صحت پر مبنی ہے جو ان قوانین میں پائی جاتی ہیں جنہیں ہم نوامیس فطرت۔ یا اللہ کے کائناتی قوانین۔ سے تعبیر کرتے ہیں اور جو اپنی پوری فطری اور ازلی صداقت کے ساتھ ہمیں اس کائنات میں روبعمل نظر آتے ہیں۔ ان کی کارفرمائی میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ان اندازوں کا پرتو ملتا ہے جو اس نے ان کے لیے ٹھیرا رکھے ہیں۔

شریعت الٰہی مرکزی قانون سے ہم آہنگ ہے

یہ اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ وہ شریعت جسے اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کی تنظیم کے لیے وضع فرمایا ہے دراصل ایک کائناتی شریعت ہے، اس حقیقت کے پیش نظر شریعت الٰہی کا اتباع انسانی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت بن جاتا ہے کیوں کہ صرف اسی طرح انسان اور کائنات میں جس میں وہ جی رہا

ہے،توافق اور ہم آہنگی پیدا ہوسکتی ہے ۔صرف یہی نہیں بلکہ واقع یہ ہے کہ انسان کی طبعی زندگی(Physical Laws) کے (اخلاقی)قوانین (Moral Laws)میں بھی ہم آہنگی شریعت الٰہی کے اتباع ہی سے اُبھر سکتی ہے۔صرف اس طریقہ سے''اندر''اور''باہر'' کے انسان کو وحدت اور یگانگی سے ہم کنار کیا جاسکتا ہے۔انسان کائنات کے تمام قوانین اوراس میں کارفرما مرکزی نظام کے ادراک سے عاجز اور قاصر ہے۔کائناتی قوانین کا ادراک فہم تو بڑی بات ہے۔وہ تو اس قانون کوبھی نہیں سمجھ پاتا جس کے ضابطے میں اس کی ذات جکڑی ہوئی ہے،اور جس سے سرِ موانحراف بھی اس لیے ناممکن ہے۔یہی وہ عجز ودر ماندگی ہے جس کی وجہ سے انسان اس بات پر قادر نہیں کہ وہ اپنی زندگی کے لیےکوئی ایسی شریعت وضع کر سکے جس کی تنفیذ سے حیات انسانی اورحرکت کائنات کے مابین ہمہ گیرتوافق تو کجا خوداس کی اپنی فطرت خفی اورحیات ظاہری کے درمیان ہی ہم آہنگی قائم ہوسکے ۔یہ قدرت صرف اُسی ذات کوحاصل ہے جوکائنات کی صانع ہےاورانسان کی خالق بھی،جوکائنات کی تدبیر وانتظام بھی کرتی ہے اورانسانی معاملات کی مدبّر ومنتظم بھی ہے۔اورسب کواُسی ایک مرکزی قانون میں جکڑے ہوئے ہے جسےاس نے خودمنتخب وپسندفرمایاہے۔

پس یہی وہ حقیقت ہے جوشریعت کےاتباع کولازم اورناگزیر بنادیتی ہے۔تاکہ کائنات کےساتھ مکمل ہم موافقت پیدا ہوسکے۔اس کااتباع اتنا ہی لازم وناگزیر ہے جتنا اعتقادی اورنظری طور پراسلام کا قیام۔کسی فرد یاجماعت کی زندگی اس وقت تک اسلام کے رنگ سے خالی رہے گی جب تک بندگی کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیےمخصوص نہ کیا جائے،اور بندگی کو بجالانے کاوہ طریقہ نہ اپنایا جائے گا،جورسول اللہ ﷺ نے انسانوں کوسکھایاہے۔بالفاظ دیگر جب تک اسلام کے رکن اوّل کے دونوں اجزاءلاالٰہ الااللہاورمحمدرسول اللہ کاعملی زندگی میں ظہورنہ ہوگا،زندگی خواہ وہ انفرادی ہو یااجتماعی نورِاسلام سے بے بہرہ ہوگی۔

شریعت الٰہی کا اتباع کیوں لازم ہے

انسانی زندگی اور قانون کائنات کے مابین ہمہ گیر توافق نوع انسان کے لیے سراسر خیر وفلاح کا موجب ہے۔ یہی ایک صورت ہے جس سے انسانی زندگی فساد وشر سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ انسان کو اگر کائنات کے ساتھ سلامتی کا رویہ اختیار کرنا ہے، اور خود اپنی ذات سے بھی امن میں رہنا ہے، تو اس کے لیے کائنات سے توافق وہم آہنگی پیدا کرنا ایک ناگزیر ضرورت ہے! اب رہا کائنات کی جانب سے انسان کے مامون ومصئون رہنے کی صورت تو وہ صرف انسان اور کائنات کی حرکت میں باہمی مطابقت اور یک جہتی پر موقوف ہے۔ اسی طرح خود انسان اور اس کی اپنی ذات کے درمیان امن وسلامتی کا قیام بھی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کی ظاہری حرکت اور اس کے صحیح فطری تقاضوں میں مکمل ہمنوائی ہو تا کہ انسان اور فطرت کے درمیان تصادم اور معرکہ آرائی کی کیفیت رونما نہ ہو۔ یہ صرف شریعتِ الٰہی ہی کا کمال ہے کہ اس کے ذریعے انسان کی مادی زندگی اور اس کی فطرتِ حقیقی کے درمیان نہایت سہولت اور ہمواری کے ساتھ توافق اور تعاون پیدا کیا جاسکتا ہے اور جب فطرت کے ساتھ انسان تعاون ویکجہتی کی فضا پیدا کر لیتا ہے تو اس کے نتیجہ میں انسانوں کے باہمی تعلقات اور زندگی کی عمومی جدوجہد کے درمیان ازخود توافق کی عمل داری قائم ہو جاتی ہے، کیوں کہ انسان جب فطرت کے ساتھ تعاون کی روش اختیار کرتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیات انسانی اور کائنات میں مکمل توافق جنم لیتا ہے، اور انسان کی زندگی اور کائنات میں ایک ہی نظام کی کارفرمائی قائم ہو جاتی ہے، یُوں انسان کی زندگی کا اجتماعی پہلو بھی باہمی تصادم وتعارض سے پاک ہو جاتا ہے۔ اور انسانیت خیر کلی سے بہرہ اندوز ہو جاتی ہے۔ اُس کے بعد کائنات کے مختلف اسرار بھی اس کے لیے اسرار نہیں رہتے۔ انسان فطرت کا آشنائے راز بن جاتا ہے، کائنات کی مخفی طاقتیں اس کے سامنے آشکار ہو جاتی ہیں، اور کائنات کی پہنائیوں میں چھپے ہوئے خزانوں کا سراغ اُسے مل جاتا ہے۔ وہ ان قوتوں اور خزانوں کو اللہ کی شریعت

کی رہنمائی میں انسانیت کی کلی فلاح وسعادت کے لیے استعمال کرتا ہے اس طرح کہ نہ کہیں تصادم پیدا ہوتا ہے، اور نہ انسان اور فطرت میں رسہ کشی اور نزاع کی نوبت آتی ہے، بصورت دیگر ان دونوں میں مستقل طور پر کھینچاتانی ہوتی رہتی ہے اور اللہ کی شریعت کے بالمقابل انسان کی خواہشات اور نفسانی اہواء سر اٹھاتی رہتی ہیں۔ اس بارے میں اللہ کا ارشاد ہے کہ:

وَلَوِاتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوَاتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ. (مومنون)

اور اگر حق ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین اور آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

''حق'' نا قابلِ تقسیم ہے

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی نظریہ کی رُو سے ''حق'' ایک اکائی ہے۔ یہی اس دین کی بنیاد ہے، اور اسی پر زمین وآسمان کا نظام قائم ہے، اور اسی سے دنیا وآخرت کے تمام معاملات درست ہوتے ہیں، اُسی کے بارے میں انسانوں کو اللہ تعالیٰ کے روبرو جواب دہی کرنی ہے۔ اور جو اس سے تجاوز کرتے ہیں ان کو وہ سزا بھی دیتا ہے۔ حق ایک وحدت ہے، جس کی تقسیم ناممکن ہے۔ اور یہ کائنات کے اُسی مرکزی قانون سے عبارت ہے جس کو اللہ جل شانہ نے تمام حالات کے لیے جاری فرما رکھا ہے اور جس کے آگے عالم وجود کی تمام انواع اور تمام ذی روح وغیر ذی روح مخلوقات سر اطاعت خم کیے ہوئے ہیں اور مکمل طور پر اس کی گرفت میں ہیں:

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ وَ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝ لَا تَرْكُضُوْا وَ ارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰهُمْ حَتّٰى

جَعَلۡنٰهُمۡ حَصِیۡدًا خٰمِدِیۡنَ ۝ وَ مَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَهُمَا
لٰعِبِیۡنَ ۝ لَوۡ اَرَدۡنَاۤ اَنۡ نَّتَّخِذَ لَهۡوًا لَّاتَّخَذۡنٰهُ مِنۡ لَّدُنَّاۤ اِنۡ کُنَّا فٰعِلِیۡنَ ۝ بَلۡ
نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَی الۡبَاطِلِ فَیَدۡمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَ لَکُمُ الۡوَیۡلُ مِمَّا
تَصِفُوۡنَ ۝ وَ لَهٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَنۡ عِنۡدَهٗ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ
عِبَادَتِهٖ وَلَا یَسۡتَحۡسِرُوۡنَ ۝ یُسَبِّحُوۡنَ الَّیۡلَ وَ النَّهَارَ لَا یَفۡتُرُوۡنَ ۝ (انبیاء)

بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے ۔کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔ کتنی ہی ظالم بستیاں ہیں جن کو ہم نے پیس کر رکھ دیا اور اُن کے بعد دوسری کسی قوم کو اٹھایا۔ جب اُن کو ہمارا عذاب محسوس ہوا تو لگے سر پٹ دوڑ نے (کہا گیا) بھاگو نہیں، جاؤ اپنے گھروں اور عیش کے سامانوں میں جن کے اندر تم چین کر رہے تھے، شاید کہ تم سے پوچھا جائے۔ کہنے لگے ہائے ہماری کم بختی ، بے شک ہم خطاوار تھے، اور وہ یہی پکارتے رہے یہاں تک کہ ہم نے کھلیان کر دیا۔ اور وہ بھسم ہو کر رہ گئے۔ ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ بھی ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے۔ مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے، اور تمہارے لیے تباہی ہے اُن باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو۔ زمین و آسمان میں جو مخلوق بھی ہے وہ اللہ کی ہے۔ اور جو (فرشتے) اس کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو بُرا سمجھ کر اس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں۔ شب و روز اُسی کی تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ دَم نہیں لیتے۔

کائنات ''حق'' پر قائم ہے

انسان کی فطرت اپنی گہرائیوں میں اس ''حق'' کا پورا پورا ادراک رکھتی ہے۔ایک طرف انسان کی اپنی ہیئت اور ساخت اور دوسری طرف اس کے اردگرد پھیلی ہوئی وسیع وعریض کائنات کی ساخت وترکیب ہر لحظہ انسان کو یاد دلاتی رہتی ہے کہ یہ کائنات حق پر استوار ہے،اور حق ہی اس کا اصل وجوہر ہے،اور یہ ایک ایسے مرکزی قانون سے مربوط ہے جس نے اس کو اثبات ودوام بخش رکھا ہے۔چنانچہ اس کائنات میں کوئی اختلال پیدا نہیں ہوتا۔اس کی راہیں جدا جدا نہیں ہیں،اس میں اختلاف دور نہیں ہے،اُس کے اجزاء میں کوئی تضاد نہیں ہے،وہ الل ٹپ طریقے پر کام نہیں کررہی ہے،نہ وہ محض بخت واتفاق کی مرہون منت ہے،نہ ہی ایک باقاعدہ منصوبے اور اسکیم کے بغیر رواں دواں ہے،وہ ہر آن بدلتی ہوئی خواہشات اور سرکش اہواء انسانی کے ہاتھوں محض ایک کھلونا بھی نہیں ہے،بلکہ وہ اپنے جزرس،سخت گیر اور مقررہ نظام کی شاہراہ پر بے چون وچرا چل رہی ہے۔اختلاف کا آغاز انسان اور اس کی فطرت کے درمیان تصادم پیدا ہوجانے سے ہوتا ہے۔اور وہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان اُس ''حق'' سے منحرف ہوجاتا ہے،جو اُس کی فطرت کی اتھاہ گہرائیوں میں پنہاں ہے اور اس کی خواہشات اُس پر حاوی ہوجاتی ہے،اور پھر وہ اپنا قانون حیات اللہ کی شریعت سے اخذ کرنے کے بجائے خواہشات کی شریعت سے حاصل کرنے لگتا ہے،اور جس طرح یہ کائنات اپنے مولیٰ کے آگے سرافگندہ ہے اُسی طرح وہ اپنے ارادہ واختیار سے اُس کے آگے سرافگندہ ہونے کے بجائے سرتابی اور سرکشی کو شیوہ بنالیتا ہے۔

حق سے انحراف کے نتائج

جس طرح انسان اور اس کی فطرت اور انسان اور کائنات کے درمیان تصادم اور اختلاف پیدا ہوجاتا ہے اسی طرح یہی اختلاف بڑھتے بڑھتے انسانی افراد،انسانی گروہوں،قوموں اور ملتوں اور مختلف انسانی نسلوں کے باہمی اختلاف کی صورت بھی اختیار کرلیتا ہے،اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کائنات کی تمام

قوتیں اور ذخائر وخزائن بجائے اس کے کہ نوعِ انسانی کی فلاح وترقی میں استعمال ہوں، الٹا اس کے حق میں وسائل ہلاکت اور اسباب شقاوت بن جاتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اس واضح مقصد جس کے لیے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کا قیام مطلوب ہے وہ صرف آخرت کے لیے ذخیرۂ عمل جمع کرنا ہی نہیں ہے۔ دنیا اور آخرت دو مختلف چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی منزل کے دو مرحلے ہیں، دونوں برابر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی شریعت ایک طرف انسانی زندگی میں ان دونوں مرحلوں میں توافق کا رنگ پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف پوری انسانی زندگی کو کائنات کے ساتھ مربوط کرتی ہے۔ چنانچہ کائنات کے مرکزی قانون کے ساتھ جب توافق پیدا ہوگا تو اس کے نتیجے میں انسان کو سعادت وخوش بختی کی جو دولت ملے گی وہ آخرت تک کے لیے ملتوی نہیں رکھی جائے گی بلکہ پہلے مرحلہ (دنیا) میں بھی اُس کے فوائد ظاہر ہوں کر رہیں گے۔ البتہ آخرت میں اوجِ کمال اور نقطۂ عروج کو پہنچے گی۔

یہ ہے اس پوری کائنات کے بارے میں اور اس کے ایک ایک جزء انسانی وجود کے بارے میں اسلامی تصور کی بنیاد۔ یہ تصور اپنی فطرت واصلیت کے لحاظ سے اُن تمام تصورات سے بنیادی اختلاف رکھتا ہے جو دنیا میں اب تک رائج رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کس دوسرے تصور اور نظریہ حیات میں نہیں ملتے ۔اس تصور کی رو سے شریعت الٰہی کا اتباع دراصل اس ضرورت کا اقتضاء ہے کہ حیات انسانی اور حیات کائنات کے درمیان اور اُس قانون کے درمیان جو انسانی فطرت اور کائنات میں کارفرما ہے کامل ارتباط ہونا چاہیے۔ اسی ضرورت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ کائنات کے مرکزی قانون کے درمیان اور حیات انسانی کی تنظیم کرنے والی شریعت کے درمیان بھی پوری مطابقت ہو۔ نیز شریعت الٰہی کی اتباع ہی سے انسان کما حقہ، اللہ کی بندگی کا فریضہ انجام دے سکتا ہے جس طرح یہ کائنات صرف اللہ کی بندگی کر رہی ہے اور کوئی انسان اپنے لیے اس کی بندگی کا مدعی نہیں ہے۔

جس توافق اور مطابقت کی ضرورت کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اُسی کا اشارہ اُس گفتگو میں بھی موجود ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام امت مسلمہ کے باپ اور نمرود کے درمیان ہوئی۔ یہ شخص ایک جابر فرمانروا تھا اور ملک کے اندر بندگان خدا پر اپنی خدائی کا دعویدار تھا۔ مگر اس کے باوجود افلاک اور سیاروں اور ستاروں کی دنیا اس کے دعویٰ خدائی سے خارج رہی۔ اس کے سامنے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دلیل پیش کی کہ "جو ذات اس پوری کائنات کے اقتدار کی مالک ہے صرف اُسی ذات کو انسانی زندگی پر بھی اقتدار (Sovereignty) حاصل ہونا چاہیے"۔ تو وہ مبہوت ہو کر رہ گیا، اس دلیل کا اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا، قرآن نے اس قصے کو یوں نقل کیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرَاهِيْمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ اِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَ اُمِيْتُ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ. (بقرہ:۲۵۸)

کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا، اس بات پر کہ ابراہیم کا رب کون ہے۔ اور اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے، تو اُس نے جواب دیا زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔ ابراہیم نے کہا: اچھا اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اُسے مغرب سے نکال لا، یہ سن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا۔ مگر اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔

بے شک اللہ نے سچ فرمایا:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ. (آل عمران:۸۳)

اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دین اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں ،حالانکہ زمین وآسمان کی ساری چیزیں چاروناچار اللہ ہی کی تابع فرمان ہیں،اور اُسی کی سب کو پلٹنا ہے۔

ساتواں باب

اسلام ہی اصل تہذیب ہے

اِسلامی معاشرے اور جاہلی معاشرے کا بُنیادی فرق

اِسلام صرف دو قسم کے معاشروں کو جانتا ہے۔ایک اسلامی معاشرہ اور دوسرا جاہلی معاشرہ۔اسلامی معاشرہ وہ ہے جس میں انسانی زندگی کی زمامِ اقتدار قیادت اسلام کے ہاتھ میں ہو۔انسانوں کے عقائد وعبادات پر،ملکی قانون اورنظامِ سیاست پر،اخلاق ومعاملات پر غرضیکہ زندگی کے ہر پہلو پر اسلام کی عملداری ہو۔جاہلی معاشرہ وہ ہے جس میں اسلام عملی زندگی سے خارج ہو۔نہ اسلام کے عقائد وتصورات اُس پر حکمرانی کرتے ہوں،نہ اسلامی اقدار اور ردّ وقبول کے اسلامی پیمانوں کو وہاں برتری حاصل ہو،نہ اسلامی قوانین وضوابط کا سکہ رواں ہواور نہ اسلامی اخلاق ومعاملات کسی درجہ فوقیت رکھتے ہوں۔

اِسلامی معاشرہ وہ نہیں ہے جو''مسلمان'' نام کے انسانوں پر مشتمل ہو،مگر اسلامی شریعت کو وہاں کوئی قانونی پوزیشن حاصل نہ ہو۔ایسے معاشرے میں اگر نماز روزے اور حج کا اہتمام بھی موجود ہو،تو بھی وہ اسلامی معاشرہ نہیں ہوگا، بلکہ وہ ایک ایسا معاشرہ ہے جو اللہ اور رسول کے احکام اور فیصلوں سے آزاد ہو کر اپنے مطالبۂ نفس کے تحت اسلام کا ایک جدید ایڈیشن تیار کر لیتا ہے،اور اسے برسبیل مثال''ترقی پسند اسلام'' کے نام سے موسوم کرتا ہے!

جاہلی معاشرہ مختلف بھیس بدلتا رہتا ہے، جو تمام کے تمام جاہلیت ہی سے ماخوذ ہوتے ہیں۔کبھی وہ ایک ایسے اجتماع کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے،جس میں اللہ کے وجود کا سرے سے انکار کیا جاتا ہے اور انسانی تاریخ

کی مادی اور جدلی تعبیر (Dialectal Interpretation) کی جاتی ہے اور ''سائنٹفک سوشلزم'' کو نظام زندگی کی حیثیت سے عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ کبھی وہ ایک ایسی جمعیت کے رنگ میں نمودار ہوتا ہے جو اللہ کے وجود کی تو منکر تو نہیں ہوتی، لیکن اُس کی فرماں روائی اور اقتدار کو صرف آسمانوں تک محدود رکھتی ہے۔ رہی زمین کی فرماں روائی تو اس سے اللہ کو بے دخل رکھتی ہے۔ نہ اللہ کی شریعت کو نظامِ زندگی میں نافذ کرتی ہے، اور نہ اللہ کی تجویز کردہ اقدارِ حیات کو جسے اللہ نے انسانی زندگی کے لیے ابدی اور غیر متغیر اقدار ٹھہرایا ہے فرماں روائی کا منصب دیتی ہے۔ وہ لوگوں کو تو اجازت دیتی ہے کہ وہ مسجدوں، کلیساؤں اور عبادت گاہوں کی چار دیواری کے اندر اللہ کی پوجا پاٹ کرلیں، لیکن یہ گوارا نہیں کرتی کہ لوگ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے اندر بھی شریعتِ الٰہی کو حاکم بنائیں۔ اس لحاظ سے وہ جمعیت تختۂ زمین پر اللہ کی الوہیت کی باغی ہوتی ہے کیونکہ وہ اسے عملی زندگی میں معطل کر کے رکھ دیتی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا صریح فرمان ہے: هو الذی فی السماء اله و فی الارض اله (وہی اللہ ہے جو آسمان میں بھی الٰہ ہے اور زمین میں بھی)۔ اس طرز عمل کی وجہ سے یہ معاشرہ اللہ کے اس پاکیزہ نظام کی تعریف میں نہیں آتا جسے اللہ تعالیٰ نے آیت ذیل میں ''دین قیّم'' سے تعبیر فرمایا ہے:

اِنِ الْحُکْمُ لِلّٰهِ ، اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ. (یوسف: ٨٤)

حکم صرف اللہ کا ہے۔ اُسی کا فرمان ہے کہ اُس کے سوا کسی کی بندگی نہ کی جائے۔ یہی دین قیّم (ٹھیٹھ سیدھا طریقِ زندگی) ہے۔

یہی وہ اجتماعی طرزِ عمل ہے جس کی وجہ سے یہ معاشرہ بھی جاہلی معاشروں کی صف میں شمار ہوتا ہے۔ چاہے وہ لاکھ اللہ کے وجود کا اقرار کرے اور لوگوں کو مسجدوں اور کلیساؤں اور صوامع کے اندر اللہ کے آگے مذہبی مراسم کی ادائیگی سے نہ روکے۔

صرف اسلامی معاشرہ ہی مہذب معاشرہ ہوتا ہے

آغاز میں ہم اسلامی معاشرہ کی جو تعریف کر آئے ہیں اُس کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صرف اسلامی معاشرہ ہی درحقیقت ''مہذب معاشرہ'' ہے۔ جاہلی معاشرے خواہ جس رنگ و روپ میں ہوں بنیادی طور پر پسماندہ اور غیر مہذب معاشرے ہوتے ہیں۔ اس اجمال کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے اپنی ایک زیرِ طبع کتاب کا اعلان کیا اور اُس کا نام رکھا ''نحو مجتمع اسلامی متحضر'' (مہذب اسلامی معاشرہ) لیکن اگلے اعلان میں میں نے ''مہذب'' کا لفظ حذف کر دیا اور اس کا نام صرف ''اسلامی معاشرہ'' رہنے دیا۔ اس ترمیم پر ایک الجزائری مصنف کی جو فرانسیسی زبان میں لکھتے ہیں نظر پڑی اور انہوں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس تبدیلی کا محرک وہ نفسیاتی عمل ہے جو اسلام کی مدافعت کے وقت ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ موصوف نے افسوس کیا کہ یہ عمل جو ناپختگی کی علامت ہے مجھے اصل مشکل کا حقیقت پسندانہ سامنا کرنے سے روک رہا ہے۔ میں اس الجزائری مصنف کو معذور سمجھتا ہوں۔ میں خود بھی پہلے اُنہی کا ہم خیال تھا۔ اور جب میں نے پہلی مرتبہ اس موضوع پر قلم اٹھایا تو اُس وقت بھی اُسی انداز پر سوچ رہا تھا جس انداز پر وہ آج سوچ رہے ہیں۔ اور جو مشکل آج انہیں درپیش ہے وہی مشکل اس وقت مجھے خود درپیش تھی۔ یعنی یہ کہ ''تہذیب کسے کہتے ہیں؟'' اُس وقت تک میں نے اپنی اُن علمی اور فکری کمزوریوں سے نجات نہیں پائی تھی جو میری ذہنی اور نفسیاتی تعمیر میں رچ بس چکی تھیں۔ ان کمزوریوں کا ماخذ مغربی لٹریچر اور مغربی افکار و تصورات تھے جو بلاشبہ میرے اسلامی جذبہ و شعور کے لیے اجنبی تھے۔ اور اس دور میں بھی وہ میرے واضح اسلامی رجحان اور ذوق کے خلاف تھے۔ تاہم ان بنیادی کمزوریوں نے میری فکر کو غبار آلود اور اس کے پاکیزہ نقوش کو مسخ کر رکھا تھا ۔تہذیب کا وہ تصور جو یورپی فکر میں پایا جاتا ہے میری آنکھوں میں سمایا رہتا تھا، اس نے میرے ذہن پر پردہ ڈال رکھا تھا اور مجھے نکھری ہوئی اور حقیقت رسا نظر سے محروم کر رکھا تھا۔ مگر بعد میں اصل تصویر

نکھر کر سامنے آ گئی اور مجھ پر یہ راز کھلا کہ اسلامی معاشرہ ہی دراصل مہذب معاشرہ ہوتا ہے۔ میں نے اپنی کتاب کے نام پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس میں لفظ ''مہذب'' زائد ہے۔ اور اس سے مفہوم میں کسی نئی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ لفظ الٹا قاری کے احساسات پر اُس اجنبی فکر کی پرچھائیاں ڈال دے گا جو میرے ذہن پر بھی چھائی رہی ہیں اور جنہوں نے مجھے صحت مندانہ نگاہ سے محروم کر رکھا تھا۔

اب موضوع زیر بحث یہ ہے کہ ''تہذیب کسے کہتے ہیں'' اس حقیقت کی وضاحت ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔

جب کسی معاشرے میں حاکمیت صرف اللہ کے مخصوص ہو، اور اس کا عملی ثبوت یہ ہو کہ اللہ کی شریعت کو معاشرے میں بالاتری حاصل ہو تو صرف ایسے معاشرے میں انسان اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے کامل اور حقیقی آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی کامل اور حقیقی آزادی کا نام ''انسانی تہذیب'' ہے۔ اس لیے کہ انسان کی تہذیب ایک ایسا بنیادی ادارہ چاہتی ہے جس کی حدود میں انسان مکمل اور حقیقی آزادی سے سرشار ہو اور معاشرے کا ہر فرد غیر مشروط طور پر انسانی شرف وفضیلت سے متمتع ہو۔ اور جس معاشرے کا حال یہ ہو کہ اس میں کچھ لوگ رب اور شارع بنے ہوں اور باقی ان کے اطاعت کیش غلام ہوں، تو ایسے معاشرے میں انسان کو بحیثیت انسان کوئی آزادی نصیب نہیں ہوتی اور نہ وہ اُس شرف وفضیلت سے ہمکنار ہو سکتا ہے جو لازمۂ انسانیت ہے۔

یہاں ضمناً یہ نکتہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ قانون کا دائرہ صرف قانونی احکام تک ہی محدود نہیں ہوتا ، جیسا کہ آج کل لفظ شریعت کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں محدود اور تنگ مفہوم پایا جاتا ہے ۔ بلکہ تصورات، طریقہ زندگی ، اقدار حیات، ردّ وقبول کے پیمانے ، عادات وروایات یہ سب بھی قانون کے دائرے میں آتے ہیں۔ اور افراد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر انسانوں کا ایک مخصوص گروہ یہ سب بیڑیاں یا دباؤ کے اسالیب ہدایت الٰہی سے بے نیاز ہو کر تراش لے اور معاشرے کے دوسرے افراد کو ان میں مقیّد کر کے رکھ دے تو ایسے معاشرے کو کیوں کر آزاد معاشرہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو ایسا معاشرہ

ہے جس میں بعض افراد کو مقام ربوبیت حاصل ہے اور باقی لوگ ان ارباب کی عبودیت میں گرفتار ہیں ۔اس وجہ سے یہ معاشرہ پسماندہ معاشرہ شمار ہوگا یا اسلامی اصطلاح میں اُسے جاہلی معاشرہ کہیں گے۔

صرف اسلامی معاشرہ ہی وہ منفرد اور یکتا معاشرہ ہے جس میں اقتدار کی زمام صرف ایک الٰہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔اورانسان اپنے ہم جنسوں کی غلامی کی بیڑیاں کاٹ کر صرف اللہ کی غلامی میں داخل ہوجاتے ہیں۔اور یوں وہ کامل اور حقیقی آزادی سے جوانسان کی تہذیب کا نقطۂ ماسکہ ء، بہرہ ور ہوتے ہیں۔اس معاشرے میں انسانی فضیلت وشرف اُسی حقیقی صورت حال میں نور افگن ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے تجویز فرمائی ہے۔اس معاشرے میں انسان ایک طرف زمین پر اللہ کی نیابت کے منصب پر سرفراز ہوتا ہے،اور دوسری طرف ملا اعلیٰ میں اس کے لیے غیر معمولی اعزاز اور مرتبہ بلند کا اعلان بھی ہوجاتا ہے۔

اِسلامی معاشرہ اور جاہلی معاشرہ کی جوہری خصوصیات

جب کسی معاشرے میں انسانی اجتماع اور مدنیت کے بنیادی رشتے عقیدہ،تصور،نظریہ،اور طریقِ حیات سے عبارت ہوں اور اُن کا ماخذ ومنبع صرف ایک الٰہ ہو اور انسان نیابت کے درجہ پر سرفراز ہو۔اور یہ صورت نہ ہو کہ فرمانروائی کا سرچشمہ زمینی ارباب ہوں اور انسان کے گلے میں صرف ایک اللہ کی غلامی کا طوق پڑا ہو۔بلکہ اس کے برعکس انسان صرف ایک اللہ کے بندے ہوں،تو تبھی ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ انسانی اجتماع میں وجود میں آسکتا ہے،جو ان تمام اعلیٰ انسانی خصائص کی جلوہ گاہ ہوتا ہے جو انسان کی روح اور فکر میں ودیعت ہیں۔لیکن اس کے برعکس اگر معاشرے کے اندر انسانی تعلقات کی بنیاد پر رنگ ونسل،اور قوم وملک اور اسی نوعیت کے دوسرے رشتوں پر رکھی گئی ہو ظاہر ہے کہ یہ رشتے زنجیریں ثابت ہوتے ہیں اور انسان کے اعلیٰ خصائص کو ابھرنے کا موقع نہیں دیتے۔انسان رنگ ونسل اور قوم ووطن کی حد بندیوں سے آزاد رہ کر بھی انسان ہی رہے گا مگر روح اور عقل کے بغیر وہ انسان نہیں

رہ سکتا۔مزید براں یہ کہ وہ اپنے عقیدہ وتصوراورنظریۂ حیات کواپنے آزادارادے سے بدلنے کا اختیار بھی رکھتا ہے،مگراپنے رنگ اوراپنی نسل میں تبدیلی پر قادرنہیں ہے،اور نہ اس بات کی اسے قدرت حاصل ہے کہ وہ کسی مخصوص قوم یامخصوص وطن میں اپنی پیدائش کا فیصلہ کرے۔لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ وہ معاشرہ جس میں انسانوں کا اجتماع ایک ایسی بات پر ہوجس کاتعلق اُن کی آزادمرضی اوراُن کی ذاتی پسند سے ہووہی معاشرہ نورتہذیب سے منور ہے۔اس کے برعکس وہ معاشرہ جس کےافراداپنے انسانی ارادے سے ہٹ کرکسی اور بنیاد پرمجتمع ہوں،وہ پس ماندہ معاشرہ ہے۔یااسلامی اصطلاح میں وہ جاہلی معاشرہ ہے۔

اسلامی معاشرہ ہی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس میں اجتماع کا بنیادی رشتہ عقیدہ پراستوار ہوتا ہے،اور اُس میں عقیدہ ہی وہ قوی سند ہوتا ہے جوکالےاور گورےاوراحمر وزرد،عربی اوررومی،فارسی اورحبشی اور ان تمام اقوام کوجوروئے زمین پرآباد ہیں ایک ہی صف میں کھڑا کردیتا ہےاورایک ہی امت میں انہیں جمع کردیتا ہے۔جس کا پروردگارصرف اللہ ہوتا ہےاور وہ صرف اسی کے آگے سرعجز ونیاز جھکاتی ہے ،اُس میں معزز وہ ہے جوزیادہ متقی اوراللہ ترس ہوگا،اس کےتمام افراد یکساں حیثیت رکھتے ہیں اوروہ سب ایسے قانون پرمتفق ہوتے ہیں جوکسی انسان کا بنایا ہوانہیں بلکہ اللہ نے اُن کے لیے وضع فرمایا ہے۔

جب معاشرے کےاندرانسان کی انسانیت ہی اعلیٰ قدرسمجھی جاتی،اورانسانی خصوصیات ہی مستحق تکریم اور لائق قدر ہوں تو یہ معاشرہ مہذب معاشرہ ہوتا ہے۔اوراگر مادیت خواہ وہ کسی شکل وصورت میں ہو۔قدراعلیٰ کادرجہ رکھتی ہو،قطع نظراس کے کہ وہ نظریہ کی صورت میں ہوجیسے تاریخ کی مارکسی تعبیر میں قدراعلیٰ مادہ پرستی ہے،یامادی پیداوار کےرنگ میں ہوجیسا کہ امریکہ،یورپ اوراُن تمام معاشروں کا حال ہے جومادی پیداوارکوہی اعلیٰ قدرقرار دیتے ہیں اوراس کی قربان گاہ پرتمام دوسری اقداراورانسانی خصوصیات کو بھینٹ چڑھادیتے ہیں۔تو یہ معاشرہ پسماندہ معاشرہ کہلائے گا یا اسلامی اصطلاح میں

اُس جاہلی معاشرہ کہیں گے۔

مہذب معاشرہ۔یعنی اسلامی معاشرہ۔مادہ کو حقارت سے نہیں دیکھتا۔نہ نظری طور پر اُسے خارج از اعتبار ٹھیراتا ہے،اور نہ مادی پیداوار میں ہی اُسے نظر انداز کرتا ہے۔اس کا نظریہ یہ ہے کہ یہ کائنات جس میں ہم جی رہے ہیں اور جس پر ہم اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور جس سے اثر پذیر بھی،مادی ہی سے بنی ہے۔مادی پیداوار کو وہ دنیا میں خلافت الٰہیہ کا پشتیبان سمجھتا ہے۔پس فرق یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ مادہ کو قدرِ اعلیٰ کا لباس پہنا کر اُسے ایک ایسا معبود قرار نہیں دیتا جس کے آستانہ تقدس پر انسان کی تمام روحانی و عقلی خصوصیات اور لوازم انسانیت کو نچھاور کر دیا جائے،فرد کی آزادی اور شرف اس پر قربان کر دیا جائے،خاندانی نظام کی بنیاد واساس کو اس کی خاطر منہدم کر دیا جائے،معاشرتی اخلاق اور معاشرے کے مقدس رشتوں کو پامال کر دیا جائے۔الغرض تمام بلند تر اقدار فضائل و مکارم اور عزّ وشرف کو خاک میں ملا دیا جائے۔جیسا کہ تمام جاہلی معاشرے مادی پیداوار کی فراوانی کے لیے یہ سب کچھ کر ڈالتے ہیں۔

اگر اعلیٰ انسانی اقدار اور ان پر تعمیر ہونے والے انسانی اخلاق کے ہاتھ میں معاشرے کی زمامِ کار ہو تو لاریب ایسا معاشرہ ہی صحیح معنوں میں گہوارۂ تہذیب ہوگا۔انسانی اقدار اور انسانی اخلاق کوئی ڈھکی چھپی چیز یا ایسی چیز نہیں جو گرفت میں نہ آسکتی ہو،اور یہ تاریخ کی مادی تعبیر اور سائنٹفک سوشلزم کے دعوے کے مطابق زمانے کے ساتھ ساتھ ''ترقی'' کرنے والی اور یوں ہر آن مادۂ تغیر رہنے والی ہیں کہ کسی حال پر انہیں ٹھیراؤ نہ وہ اور کسی اصل و مرکز کے ساتھ ان کے قلابے ملے ہوئے نہ ہوں۔ بلکہ یہ وہ اقدار و اخلاق ہیں جو انسان کے اندر اُن انسانی خصائص کی آبیاری کرتی ہیں جو اُسے حیوان سے ممیّز کرتی ہیں،اور جو انسان کے اندر اُس جوہر کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرتی ہیں جو اُسے حیوانوں کی صف سے نکال کر انسانوں کی صف میں لاتا ہے۔یہ اقدار و اخلاق ایسے نہیں ہیں کہ یہ انسان کے اندر اُن صفات کی پرورش کریں اور ان پہلوؤں کو اُبھاریں جن میں انسان اور حیوان یکساں طور پر شریک ہیں۔

تہذیب کا اصل پیمانہ

مسئلہ تہذیب کو جب اس پیمانے سے ناپا جائے تو ایک ایسا قطعی، اٹل اور نا قابل تغیر خط فاصل اُبھر کر سامنے آجاتا ہے جو ان تمام کوششوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے جو ترقی پسندوں اور سائنٹفک سوشلزم کے علمبرداروں کی طرف سے تہذیبی اقدار و اخلاق کو مادۂ سیال بنانے کے لیے متواتر صرف کی جارہی ہیں۔ مسئلہ تہذیب کی تشریح بالا سے یہ بھی عیاں ہو گیا کہ "ماحول" اور "عُرف" کی اصطلاحیں دراصل اخلاقی اقدار کا تعین نہیں کرتی ہیں بلکہ بدلتے ہوئے ماحول اور عُرف کے پس پردہ ایک ایسی ٹھوس اور تغیر نا آشنا میزان ہوتی ہے جو ان کا تعین کرتی ہے، اور اس میزان کے اندر اس امر کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ کچھ اخلاق اور اقدار "زرعی" کہلائیں اور کچھ "صنعتی" یا کچھ اخلاق و اقدار "سرمایہ دارانہ" ہوں اور کچھ "سوشلسٹ" یا "بورژوا اخلاق" اور "پرولتاری اخلاق"۔ اور پھر ان اخلاقیات کو وجود بھی ختم ہو جاتا ہے جو ماحول، معیارِ زیست، عبودی دور اور ایسے ہی دیگر سطحی اور متغیر پیمانوں کی پیداوار ہوں۔ بلکہ اس تقسیم اور تعبیر کے برعکس یہاں "انسانی" اخلاق و اقدار ہوتی ہیں یا ان کے برعکس "حیوانی" اخلاق و اقدار۔ اسلامی اصطلاح میں اسی بات کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اخلاقیات کی صرف دو ہی اصناف ہیں: اسلامی اخلاق و اقدار اور جاہلی اخلاق و اقدار!

یہ انسانی اخلاق و اقدار انسان کے نفس میں اُن پہلوؤں کو جِلا دیتے ہیں جو انسان کو حیوان سے جُدا اور ممتاز کرتے ہیں اسلام ان تمام معاشروں کے اندر جن پر اُسے غلبہ و سیادت نصیب ہوتی ہے ان اخلاق و اقدار کی تخم ریزی کرتا ہے اور پھر انہیں سینچتا ہے، پروان چڑھاتا ہے، ان کی دیکھ بھال کرتا ہے، اور ان کی جڑوں کو مضبوط تر کرتا ہے۔ خواہ یہ معاشرے زرعی دور سے گزر رہے ہوں اور جانوروں اور مویشیوں پر ان کی گزر بسر ہو، خواہ متمدّن اور قرار یافتہ ہوں، خواہ نادار اور مفلس ہوں اور خواہ تو انگر اور سرمایہ دار۔ اسلام ہر حالت میں انسانی خصائص کو ترقی دیتا رہتا ہے اور حیوانیت کی طرف جانے سے

انہیں بچائے رکھتا ہے۔دراصل اخلاق واقدار کی دنیا میں وہ خط فاصل جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کرآئے ہیں اُس کا اُبھار نیچے سے اُوپر کی طرف ہے۔حیوانیت کی پست سطح سے انسانیت کی سطح مرتفع کی طرف جاتا ہے اور اگر یہ خط معکوس شکل اختیار کر لے تو مادی ترقی (تہذیب) کے ہوتے ہوئے بھی اس کو تہذیب کا نام نہ دیا جاسکے گا، بلکہ یہ تنزل و پسماندگی ہوگی یا جاہلیت۔

تہذیب کے فروغ میں خاندانی نظام کی اہمیت

اگر خاندان معاشرے کی اکائی ہو اور خاندان کی بنیاد اس اصول پر ہو کہ زوجین کے درمیان تقسیم کار ہو اور جو جس کام کی خصوصی صلاحیت اور فطری اہلیت لے کر دنیا میں آیا ہے اُسی کے مطابق اپنی ذمہ داریاں ادا کرے، اور نئی پود کی تربیت ونگہداشت خاندان کا اصل وظیفہ ہو تو ایسا معاشرہ بلاشبہ مہذب معاشرہ ہوتا ہے۔اس طرز کا خاندانی نظام اسلامی اصول حیات کے تحت وہ ماحول مہیا کر دیتا ہے جس میں اعلیٰ انسانی قدروں اور انسانی اخلاق کے شگوفے کھلتے ہیں اور نمو پذیر ہوتے ہیں اور نژادنو کو اپنی تازگی اور نکہت سے نوازتے ہیں۔ یہ قدریں اور اخلاق خاندانی اکائی کے علاوہ کسی اور اکائی کے اندر شرمندۂ وجود نہیں ہو سکتے۔لیکن اگر جنسی تعلقات، جنہیں ''آزاد جنسی تعلقات'' کا نام دیا جاتا ہے، اور ناجائز نسلی معاشرے کی بنیادی اینٹ ہوں، اور مرد وعورت کا باہمی رشتہ نفسانی خواہش جنسی بُھوک اور حیوانی اکساہٹ پر قائم ہو اور خاندانی ذمہ داریوں اور قدرتی صلاحیتوں کے مطابق تقسیم کار کے اصول پر استوار نہ ہو۔عورت کا کام صرف زینت وآرائش، دلرُبائی اور نازک اندازی ہو، اور وہ نئی پود کی تربیت ونگہداشت کے منصب اساسی سے دست بردار ہو جائے، خود یا معاشرے کی طلب پر کسی ہوٹل ، یا بحری جہاز یا ہوائی جہاز میں ''مہمان نواز'' بننے کو ترجیح دے، اور اس طرح وہ اپنی تمام صلاحیتیں اور قوتیں انسان سازی کے بجائے مادّی پیداوار اور زیادہ نفع بخش، زیادہ عزت افزا اور زیادہ باعثِ نمود ونمائش ہے پس جب نوبت یہ آجائے تو اسے انسانیت کے لیے تہذیبی پس ماندگی اور تہذیبی افلاس کا

پیغام سمجھنا چاہیے۔اسی حالت کو اسلامی اصطلاح میں جاہلیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔خاندانی نظام اور زوجین کے باہمی تعلقات کی بنیاد یہ ایک ایسا اہم مسئلہ ہے جو معاشرے کی حیثیت متعین کرنے میں فیصلہ کن اور حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے۔اسی کے ذریعہ سے ہم جان سکتے ہیں کہ کوئی معاشرہ پسماندہ ہے یا مہذب، جاہلی ہے یا اسلامی۔جن معاشروں پر حیوانی اقدار و اخلاق اور حیوانی جذبات ورجحانات کی سیادت ہوتی ہے وہ کبھی مہذب معاشرے نہیں ہوسکتے۔چاہے صنعتی، اقتصادی اور سائنسی ترقی میں وہ کتنے ہی عروج پر ہوں۔یہ وہ پیمانہ ہے جو''انسانی ترقی'' کی مقدار معلوم کرنے میں کبھی غلطی نہیں کرتا۔

تہذیب مغرب کا حال

عہدِ حاضر کے جاہلی معاشروں میں اخلاق کا مفہوم اس حد تک محدود ہو کر رہ گیا ہے کہ اس کے دائرے سے ہر وہ پہلو خارج ہو چکا ہے جو انسانی صفات اور حیوانی صفات میں خطِ فاصل کا کام دے سکتا ہے ۔ان معاشروں کی نگاہ میں ناجائز جنسی تعلقات بلکہ افعال ہم جنسی تک بھی اخلاقی رذالت اور عیب شمار نہیں ہوتے۔اخلاق کا مفہوم قریب قریب اقتصادی معاملات کے اندر محصور ہو کر رہ گیا ہے،اور کبھی کبھار سیاست کے اندر بھی اس کا چرچا ہوتا ہے مگر ریاست کے مفادات کی حد تک۔چنانچہ مثال کے طور پر کریسٹن کیلر اور برطانوی وزیر پروفیمو کا اسکینڈل جنسی پہلو سے برطانوی معاشرے کے اندر گھناؤنا واقعہ نہیں تھا۔یہ اگر''شرمناک'' تھا تو صرف اس پہلو سے کہ کریسٹن کیلر بیک وقت پروفیمو کی معشوقہ بھی تھی اور روسی سفارت خانے کے ایک بحری اتاشی سے بھی اُس کا معاشقہ تھا۔اس وجہ سے نوعمر حسینہ کے ساتھ ایک وزیر کا تعلقات قائم کرنا۔ریاست کے رازوں کے لیے باعث خطرہ تھا۔اس پر اضافہ یہ ہوا کہ اس وزیر نے دروغ گوئی سے کام سے لیا اور برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے اُس کے جھوٹ کا پول کھل گیا۔اسی واقعہ سے ملتے جلتے وہ اسکینڈل ہیں جو امریکی سینیٹ کے اندر افشا ہوتے رہتے ہیں۔اوران انگریز اور امریکی جاسوسوں اور سرکاری ملازمین کی حیا سوز داستانیں جو فرار ہو کر

رُوس پناہ لے چکے ہیں مگر یہ سب واقعات اس پہلو سے کوئی اخلاقی حادثہ نہیں سمجھے گئے کہ ان کے پیچھے فعل ہم جنسی کا گھناؤنا پس منظر ہے بلکہ انہیں صرف اس وجہ سے اہمیت حاصل ہوگی ہے کہ ریاست کے رازان کی لپیٹ میں آتے تھے۔

دُور ونزدیک کے تمام جاہلی معاشروں میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ارباب نگارش، اہل صحافت اور ادباء وافسانہ نویس نوخیز دوشیزاؤں اور شادی شدہ جوڑوں کو برملا یہ مشورد دے رہے ہیں کہ آزاد جنسی تعلقات قطعاً اخلاقی عیب نہیں ہیں۔ ہاں اگر کوئی لڑکا اپنی گرل فرینڈ یا کوئی لڑکی اپنے فرینڈ بوائے سے سچی محبت کے بجائے جھوٹا پیار کرے تو بلاشبہ عیب کی بات ہے۔ بُرائی یہ ہے کہ بیوی ایسی صورت میں بھی اپنی عفت وناموس کی حفاظت کرتی رہے جب کے اس کے سینے میں اپنے خاوند کی محبت کی آگ بجھ چکی ہو۔ اور خوبی یہ ہے کہ وہ کوئی دوست تلاش کرے اور فراخ دل کے ساتھ اپنا جسم اسے پیش کر دے ۔ بیسیوں ایسی تحریریں ملتی ہیں جن میں اسی آوارگی اور آزادخیالی کی دعوت دی جارہی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اخبارات کے اداریے، فیچر، کارٹون، سنجیدہ اور مزاحیہ کالم اِسی طرزِ حیات کا مشورہ دے رہے ہیں۔

خاندانی نظام کا اصل رول

انسانیت کے نقطۂ نگاہ کی رو سے اور ارتقائے انسانیت کے پیمانے کے مطابق ایسے معاشرے پسماندہ اور بیگانۂ تہذیب معاشرے ہیں۔ انسانیت کے ارتقاء کا خط جس سمت کو جاتا ہے اُس میں ہم دیکھتے ہیں کہ حیوانی جذبات کو لگام دی جاتی ہے، اور اُن کی تسکین کا دائرہ محدود کیا جاتا ہے۔ اس غرض کے لیے ایک خاندان کی بنیاد ڈالی جاتی ہے۔ اور اس میں کام اور فرائض کی تقسیم طفری صلاحیتوں اور ذمہ داریوں کے مطابق کی جاتی ہے، اس خاندانی نظام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ جذبات وہ اصل انسانی وظیفہ سرانجام دیں جس کی غرض وغایت محض لذت پسندی نہیں ہے بلکہ ایسی انسانی نسل کی فراہمی ہے جو نہ

صرف موجودہ نسل کی جانشین ہو بلکہ اس ممتاز اور بے نظیر انسانی تہذیب کی سچی وارث بن کر اُٹھے جس میں انسانی خصوصیات واوصاف کے گلہائے رنگ رنگ عطر بیز رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی انسانی نسل جو حیوانی خصائص وجذبات کو پابجولار رکھے اور انسانی خصائص کو زیادہ سے زیادہ ترقی وکمال تک پہنچائے صرف اُسی گہوارہ سے نکل سکتی ہے۔ جس کے چاروں طرف تحفظات کی ایسی باڑھ کھڑی کر دی گئی ہو جس کے اندر ذہنوں کو پُورا سکون نصیب ہو اور جذبات کسی ہیجان خیزی کا نشانہ نہ بننے پائیں اور جس گہوارہ کی داغ بیل ایک ایسے اہم فرض کو ادا کرنے کے لیے ڈالی گئی ہو جو وقتی جذبات اور ہنگامی تاثرات سے متاثر نہیں ہوتا۔ مگر جس معاشرے کی آبیاری ناپاک تعلیمات اور زہر آلود مشورے کر رہے ہوں اور جس میں اخلاقی دائرہ اس حد تک سکڑ جائے کہ وہ معاشرہ تمام جنسی آداب سے عاری ہو جائے تو ایسے معاشرے میں انسانیت ساز گہوارہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اسلامی اقدار و اخلاق اور اسلامی تعلیمات وتحفظات ہی انسان کے لیے مفید اور مناسب ہو سکتے ہیں اور ترقی ٹھوس اور غیر متغیر پیمانے کی رُو سے اسلامی ہی اصل تہذیب ہے اور اسلامی معاشرہ ہی تہذیب کی اصل جلوہ گاہ ہے۔

خدا پرست تہذیب اور مادّی ترقی

خلاصہ یہ کہ جب انسان اس دنیا کے اندر اللہ کی خلافت کو ہمہ پہلو قائم کرتا ہے، اور اس کے تقاضے میں وہ صرف اللہ کی بندگی کے لیے وقف ہو جاتا ہے، غیر اللہ کی ہر نوعیت کی عبودیت سے کاملتاً چھٹکارا پالیتا ہے، صرف اللہ کے پسندیدہ نظام کو قائم کرتا ہے اور دوسرے تمام غیر الٰہی نظام ہائے حیات کے جواز کو مسترد کر دیتا ہے، اپنی زندگی کے ہر زاویے پر اللہ کی شریعت کو فرماں روا بناتا ہے اور دوسرے ہر قانون اور شریعت سے دستبردار ہو جاتا ہے، ان اقدار و اخلاق کو آویزۂ گوش بناتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائے ہیں اور نام نہاد اخلاق واقدار کو دیوار پر دے مارتا ہے۔ ایک طرف وہ یہ رویّہ اختیار کرتا ہے اور

دوسری طرف اُن کائناتی قوانین کا کھوج لگاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے مادی اسباب کے اندر ودیعت کرر کھے ہیں، اورزندگی کوترقی سے ہمکنار کرنے کے لیےان قوانین سےاستفادہ کرتا ہے،انہیں زمین کے بے بہا خزانوں اورخوراک کے اُن لامتناہی ذخیروں کی دریافت کے لیےاستعمال کرتا ہے جواللہ تعالیٰ نے سینۂ کائنات کےاندر چھپار کھے ہیں اوراپنے نوامیس سےانہیں سربمہر کرر کھا ہےاورانسان کو یہ قدرت دے دی ہے کہ وہ ان مہروں کواس حدتک توڑسکتا ہےجس حدتک ایسا کرنا اس کے لیے نیابت الٰہی کا فرض سرانجام دینے کے لیےضروری اورناگزیر ہو۔الغرض جب انسان دنیاکےاندراللہ کےعہد ومیثاق کے مطابق خلافت الٰہیہ کا بول بالا کرتا ہےاوراس خلافت کے زیرسایہ وہ رزق کے خزانوں کاانکشاف کرتا ہے، مادۂ خام کوصنعت میں تبدیل کرتا ہےاورگوناگوں صنعتیں وجود میں لاتا ہے اوراُن سارے فنی تجربوں اورعلمی معلومات کوکام میں لاتا ہے جوانسانی تاریخ کا حاصل ہیں۔وہ ان تمام امورکوایک اللہ پرست انسان،اللہ کاخلیفۂ برحق اورسچاعبادت گرارہونے کی حیثیت سےانجام دیتا ہے جب انسان زندگی کے مادی اوراخلاقی پہلوؤں میں یہ رویہ اختیار کرتا ہےتو بلاشبہ اُس وقت انسان تہذیبی لحاظ سے درجۂ کمال کو پہنچتا ہےاورایساانسانی معاشرہ تہذیب کے بامِ عروج پر متمکن ہوتا ہے ۔رہیں مادی ترقی اورجاہلیت ایک دوسرے کےمنافی نہیں ہیں۔عین ممکن ہے کہ معاشرے کےاندر مادّی ترقی عروج پرہومگراس کے باوجوداس میں جاہلیت کادوردورہ ہوبلکہ اللہ تعالیٰ نےقرآن حکیم میں متعددمقامات پرجاہلیت کاذکرکرتے وقت جاہلی معاشرے کی مادّی ترقی کوبھی بیان کیا ہے۔ذیل کی آیات میں اس کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں:

اَتَبۡنُوۡنَ بِكُلِّ رِيۡعٍ اٰيَةً تَعۡبَثُوۡنَ ۝ وَتَتَّخِذُوۡنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمۡ تَخۡلُدُوۡنَ ۝ وَ اِذَا بَطَشۡتُمۡ بَطَشۡتُمۡ جَبَّارِيۡنَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيۡعُوۡنِ ۝ وَاتَّقُوا الَّذِىۡۤ اَمَدَّكُمۡ بِمَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝ اَمَدَّكُمۡ بِاَنۡعَامٍ وَّ بَنِيۡنَ ۝ وَجَنّٰتٍ وَّ عُيُوۡنٍ ۝ اِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ۝ (الشعراء:۱۲۸-۱۳۵)

یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اُنچے مقام پر لا حاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو، اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے۔ اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبّار بن کر ڈالتے ہو۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ڈرو اس سے جس نے وہ کچھ تمہیں دیا ہے جو تم جانتے ہو۔ تمہیں جانور دیے، اولادیں دیں، باغ دیے اور چشمے دیے۔ مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

اَتُتۡرَکُوۡنَ فِیۡ مَا ھٰهُنَاۤ اٰمِنِیۡنَ ۝فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ۝ وَّ زُرُوۡعٍ وَّ نَخۡلٍ طَلۡعُهَا هَضِیۡمٌ ۝وَ تَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا فٰرِهِیۡنَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ۝ وَ لَا تُطِیۡعُوۡۤا اَمۡرَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ۝ الَّذِیۡنَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا یُصۡلِحُوۡنَ ۝(الشعراء:١٤٦-١٥٢)

کیا تم اُن سب چیزوں کے درمیان، جو یہاں ہیں، بس یونہی اطمینان سے رہنے دیے جاؤ گے؟ اِن باغوں اور چشموں میں؟ اِن کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں؟ تم پہاڑ کھود کھود کر فخر یہ ان میں عمارتیں بناتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اُن بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔

فَلَمَّا نَسُوۡا مَا ذُکِّرُوۡا بِهٖ فَتَحۡنَا عَلَیۡهِمۡ اَبۡوَابَ کُلِّ شَیۡءٍ ؕ حَتّٰۤی اِذَا فَرِحُوۡا بِمَاۤ اُوۡتُوۡۤا اَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَةً فَاِذَا هُمۡ مُّبۡلِسُوۡنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ؕ وَ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ (انعام:٤٣-٤٤)

پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو، جو انہیں کی گئی تھی، بُھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ اُن بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب یہ

حال تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے اللہ رب العالمین کے لیے (کہ اس نے ان کی جڑ کاٹ دی)

حَتّٰٓی اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّيَّنَتْ وَ ظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَيْلاً اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ. (یونس:۲۴)

پھر عین اس وقت جب کہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوریں کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں۔یکا یک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ گیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔

لیکن جیسا کہ پہلے ہم عرض کر چکے ہیں اسلام مادّی ترقی اور مادّی وسائل کے خلاف نہیں ہے اور ان کی اہمیت کو کم نہیں کرتا بلکہ نظام الٰہی کے زیر سایہ ہونے والی مادّی ترقی کو اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت کی حیثیت دیتا ہے۔اور اطاعت و فرمانبرداری کے صلہ میں انسانوں اس نعمت کی بشارت بھی دیتا ہے۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلُ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ (نوح)

(حضرت نوح علیہ السلام کہتے ہیں کہ) میں نے قوم سے کہا کہ تم اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کرو۔بے شک وہ مغفرت قبول کرنے والا ہے۔وہ تم پر مُوسلا دھار بارشیں برسائے گا اور اموال اور اولادوں سے تمہیں قوت بخشے گا اور تمہارے لیے باغ بنائے گا اور ان میں تمہارے لیے نہریں جاری کرے گا۔

وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ. (الاعراف:۹۶)

اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمانوں
اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے، مگر اُنھوں نے تو جھٹلایا، لہٰذا ہم نے
اُس بُری کمائی کے حساب میں اُنہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔

مادی ترقی اصل چیز نہیں ہے بلکہ اصل چیز وہ بنیادی تصور ہے جس پر مادّی اور صنعتی ترقی کی عمارت قائم ہوتی ہے اور وہ اقدارِ حیات ہیں جن کو معاشرے میں قدر و منزلت حاصل ہوتی ہے اور جن کے مجمعی عمل سے انسانی تہذیب کے خصائص و نقوش تیار ہوتے ہیں۔

اسلامی معاشرے کا آغاز اور ارتقاء کا فطری نظام

اسلامی معاشرہ کا ایک تحریکی بنیاد پر قائم ہونا اور اس کا ایک نمو پذیر نظام کی حیثیت اختیار کرنا یہ دونوں خوبیاں مل کر اسلامی معاشرے کو اپنی طرز کا منفرد اور لاثانی معاشرہ بنا دیتی ہیں جس پر وہ نظریات و رجحانات منطبق نہیں ہو سکتے جو جاہلی معاشروں کے قیام اور ان کی نمو پذیر فطرت کے لیے مناسب ہوتے ہیں۔اسلامی معاشرے کی ولادت ایک تحریک کی جدوجہد کی رہین منت ہوتی ہے۔ یہ تحریکی نظام اس کے اندر برابر برسرِ عمل رہتا ہے، یہ تحریک ہی معاشرے کے ہر فرد کی قیمت اور اس کا مرتبہ و مقام متعین کرتی ہے، اور پھر اس اصل قیمت کی روشنی میں معاشرے کے اندر اُس کی اصل ڈیوٹی اور اجتماعی حیثیت طے کرتی ہے۔ جس تحریک کے بطن سے یہ معاشرہ جنم لیتا ہے اس تحریک کا فکری و عملی ماخذ عالمِ آب و گِل سے ماوراء اور بشری دائرہ سے خارج ہوتا ہے۔ یہ تحریک درحقیقت اُس عقیدہ کی متحرک تصویر ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر نازل کیا گیا ہے اور جو انسان کو کائنات اور زندگی اور انسانی تاریخ کے بارے میں مخصوص تصور دیتا ہے، زندگی کے مقاصد اور اقدار کا نیا مفہوم عطا کرتا ہے اور جدوجہد کا مخصوص طریقہ سکھاتا ہے جو اس کے مزاج اجتماعی کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ چنانچہ وہ محرّک اوّلین جو آفتابِ تحریک کے طلوع کا باعث بنتا ہے اُس کی چنگاریوں کا مرکز انسانی نفوس نہیں ہوتے

اور نہ مادی کائنات کا کوئی گوشہ اُس کی حرارت اور سرگرمی کا ماخذ ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے وہ محرّک کرہ ارضی سے ماوراء اور عالم بشری سے بالاتر ماخذ سے صادر ہوتا ہے۔ اور یہی وہ خاص خوبی ہے جو اسلامی معاشرے اور اُس کے اجزائے ترکیبی کو دوسرے تمام معاشروں سے ممیّز کرتی ہے۔

تحریک اسلامی کے فطری مراحل اور اس کا مخصوص نظامِ عمل

یہ غیر مادی عنصر جو تقدیرِ الٰہی سے پردۂ غیب سے وجود میں آتا ہے اس کے وجود میں آنے سے پہلے انسان کا ذہن بالکل خالی ہوتا ہے اور اُس کے آغاز میں بھی انسان کی کسی کوشش کو دخل نہیں ہوتا۔ اسی عنصر کے مطالبے پر تحریک ایک اسلامی معاشرے کی تخم ریزی کا پہلا قدم اُٹھاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اُس کی طرف سے ''انسان سازی'' کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اور ایک ایسے انسان کی تیاری کی مہم شروع ہو جاتی ہے جو اس عقیدہ پر ایمان رکھتا ہو جو منبع غیب سے القا ہوا ہے اور جسے خالصًا تقدیر الٰہی نے جاری فرمایا ہے۔ اگر ایک انسانی فرد بھی اس عقیدہ پر ایمان لے آتا ہے تو اصولاً اسلامی معاشرے کی داغ بیل پڑ جاتی ہے۔ یہ فرد واحد اس نئے عقیدہ کو قبول کرنے کے بعد اُسے اپنے نہان خانۂ دماغ کی زینت بنا کر نہیں رکھتا، بلکہ وہ اسے لے کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس عقیدے کی یہی فطرت ہے اور ایک توانا اور فعال تحریک کی فطرت بھی یہی ہوتی ہے۔ جس بالاتر طاقت نے اس عقیدہ کا چراغ انسان کے دل میں روشن کیا ہے وہ خوب جانتی ہے کہ یہ عقیدۂ وادئ دل سے نکل کر کائنات انسانی کے ذرّہ ذرّہ پر نقش ثبت کر کے رہے گا، اور وہ پہلا شعلۂ فروزاں جس کی بدولت دل کی دنیا نور عقیدہ سے منور ہوتی ہے وہ لازماً باہر کی دنیا میں بھی پھیل کر رہے گا۔

اس عقیدہ پر ایمان لانے والوں کی تعداد جب تین افراد تک پہنچ جاتی ہے تو یہ عقیدہ ان کو بتاتا ہے کہ: ''اب تم ایک معاشرہ بن گئے ہو، ایک جداگانہ اسلامی معاشرہ، اور اس جاہلی معاشرے سے ممتاز معاشرہ، جو اس عقیدہ کو تسلیم نہیں کرتا اور جس میں اس عقیدہ کی بنیادی اقدار کو بالاتری حاصل نہیں ہوتی

(وہی بنیادی اقدار جن کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں)۔'' اب اسلامی معاشرہ بالفعل وجو میں آ گیا ہے۔ یہی تین افراد بڑھ کر دس بن جاتے ہیں، اور دس کی جدوجہد سے سو۔ ہزار۔۱۲ ہزار بن جاتے ہیں۔ اور اِس طرح اسلامی معاشرے کا ڈھانچہ متشکل ہو جاتا ہے، اور اس کی جڑیں گہری ہو جاتی ہیں۔ اس تحریکی ترقی کے دوران میں جاہلیت سے کشمکش بھی چھڑ چکی ہوتی ہے، ایک طرف وہ نومولود معاشرہ ہوتا ہے جو عقیدہ اور تصور کے لحاظ سے، اقدار حیات اور تہذیبی پیمانوں کے لحاظ سے، اپنے تنظیمی ڈھانچے اور جداگانہ وجود کے لحاظ سے جاہلی معاشرے سے الگ ہو چکا ہوتا ہے، اور دوسری طرف جاہلی معاشرہ ہوتا ہے جس کے اندر سے اسلامی معاشرہ موزوں افراد کو چھانٹ کر اپنے اندر جذب کرتا ہے۔ یہ تحریک اس درمیانی مرحلہ میں جو اس کے آغاز سے لے کر اُس کے ایک نمایاں اور قائم بالذات معاشرے کی صورت میں نمایاں ہونے تک کی مدت پر پھیلا ہوتا ہے، اپنے معاشرے کے ہر ہر فرد کو وہی مرتبہ و مقام اور وزن دیتی ہے جس کا وہ اسلامی میزان اور اسلامی کسوٹی کی رُو سے مستحق ہوتا ہے۔ معاشرے کی طرف سے خود بخود اُس کے مرتبہ و مقام کا اعتراف کیا جاتا ہے اور اُس کو اس بات کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ خود بڑھ کر اپنی اہلیت کا ثبوت پیش کرے اور پھر اُس کا اعلان کرتا پھرے۔ بلکہ اُس کا عقیدہ اور وہ مقدس اقدار جنہیں اُس کی ذات پر اور اُس معاشرے پر بالاتری حاصل ہوتی ہے اُسے مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان نگاہوں سے اپنے آپ کو چھپا کر رکھے جو اُس کے آس پاس اُس کی جانب اٹھ رہی ہیں اور اُسے کوئی ذمہ دارانہ منصب سونپنا چاہتی ہیں۔ لیکن تحریک۔ جو عقیدہ اسلامی کا طبعی نتیجہ اور اس عقیدہ کی کوکھ سے جنم لینے والے معاشرے کا فطری جوہر ہے۔ اپنے کسی فرد کو گوشۂ خمول کی نذر نہیں ہونے دیتی۔ اس تحریک کے ہر فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ سرگرمِ عمل ہو، اس کے عقیدہ میں جوش و خروش ہو۔ اس کے خون میں حرارت ہو، اُس کا معاشرہ سیمابی کیفیت کا حامل ہو اور اس توانا معاشرے کی تکمیل کے لیے ہر شخص دانۂ سپند کی مانند مضطرب و بے قرار ہو۔ اور اس جاہلیت کا بھرپور مقابلہ کرے جو اُس کے ماحول پر مسلط ہے جس کے بچے کھچے اثرات خود اس کے اپنے نفس میں اور اس

کے ساتھیوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔ پس یہ کشمکش ایک دوامی کشمکش ہے۔ یہی مفہوم ہے اس ارشاد نبوی ﷺ کا جس میں فرمایا گیا ہے کہ جہاد قیامت تک کے لیے جاری وساری رہے گا۔

اپنے سفر کے دَوران میں تحریک جن نشیب وفراز سے گزرتی ہے وہی دراصل یہ طے کر دیتے ہیں کہ تحریکی معاشرے کے اندر ہر ہر رکن کی حیثیت اور اُس کا دائرہ کار کیا ہے۔ یہ بات نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ افراد اور مناصب وفرائض کے درمیان اعلیٰ قسم کی مناسبت اور ہم آہنگی کی بدولت ہی تحریک پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہے۔ اسلامی معاشرے کا یہ طرزِ آغاز ونشو ونما اور یہ اسلوب تکمیل کی اس کی دو ایسی نمایاں خصوصیتیں ہیں جو اس کے وجود وترکیب کو، اس کے مزاج اور شکل کو، اس کے نظام اور اس کے عملی طریق کار کو دوسرے تمام معاشروں سے ممیّز کرتی ہیں اور اسے منفرد اور جداگانہ حیثیت عطا کرتی ہیں۔ اس کے بعد یہ سوال ہی خارج از بحث ہو جاتا ہے کہ دوسرے اجتماعی نظریات کے ذریعہ بھی اسلامی معاشرہ اور اس کے ان تمام اوصاف کو جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے حاصل کیا جا سکتا ہے، یا کسی ایسے نظامِ تعلیم کے ذریعہ ان کو سمجھا جا سکتا ہے جو اس کی فطرت کے خلاف ہو، یا انہیں کسی دوسرے نظامِ حیات سے مستعار طریقہ کار کے ذریعہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی تہذیب پوری انسانیت کی میراث ہے

عام ڈگر سے ہٹ کر ہم نے ''تہذیب'' کی جو تعریف کی ہے، اس کی روشنی میں اسلامی معاشرہ محض ایک تاریخی مرحلے ہی کا نام نہیں ہے جسے صرف اوراق ماضی میں تلاش کیا جا سکتا ہے، بلکہ یہ عہدِ حاضر کی طلب اور مستقبل کی آرزو اور تمنا ہے۔ یہ وہ گوہر مقصود ہے جس سے تمام انسانیت آج بھی شرف یاب ہو سکتی ہے اور آئندہ بھی۔ اور اس کی بدولت وہ جاہلیت کے اُس قعر مذلت سے نکل سکتی ہے جس میں آج وہ لڑھک رہی ہے۔ اس قعر مذلت میں وہ قومیں بھی گری ہوئی ہیں جو صنعتی اور اقتصادی ترقی میں دوسروں کی امام ہیں وہ بھی جو پس ماندہ اور کمزور کہلاتی ہیں۔

یہ اقدار جن کی طرف ہم مجمل اشارہ کر آئے ہیں، انسانی اقدار ہیں انسانیت نے ان قدار کو اب تک صرف ایک دور میں جلوہ گر دیکھا ہے، اور وہ تھا ''اسلامی تہذیب'' کا دور۔ ''اسلامی تہذیب'' سے ہماری مراد وہ تہذیب ہے جس میں یہ اقدار بدرجہ اتم پائی جاتی ہوں۔ اور جو تہذیب ان اقدار سے خالی ہو چاہے وہ صنعت و اقتصاد اور سائنس میں کتنی ہی بام عروج پر ہو، اسلامی تہذیب ہرگز نہ ہوگی۔

یہ اقدار محض تخیّل کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ سرتاپا عملی اقدار ہیں اور حقیقت کی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں ۔انسان جب بھی صحیح اسلامی مفہوم کی روشنی میں ان کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے گا، ان کو پا لے گا ۔ان کو ہر ماحول میں عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے، خواہ وہاں کوئی سا نظام زندگی پایا جاتا ہو اور صنعت و اقتصاد اور سائنس میں اس کی ترقی کی حد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اقدار خلافت ارضی کے کسی بھی پہلو میں انسان کو ترقی سے نہیں روکتیں۔ کیونکہ اسلامی عقیدہ کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ ہمہ پہلو ترقی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اقدارِ حیات ان ممالک کے اندر خاموش تماشائی بن کر رہنے پر بھی راضی نہیں جو اخلاقی میدان میں پسماندہ ہیں۔ یہ ایک عالم گیر تہذیب ہے اور ہر ماحول میں اور ہر خطے میں پروان چڑھ سکتی ہے مگر انہی اقدار کے ستونوں پر جو اس کی اپنی امتیازی اقدار ہیں ۔رہیں ان اقدار کی مادّی تشکیلات اور مظاہر تو ان کی تحدید اور حصر ناممکن ہے کیونکہ مادّی تشکیلات ہر ماحول میں اُنہی صلاحیتوں اور قوتوں کو، جو بالفعل وہاں پائی جاتی ہیں، استعمال کرتی ہیں اور ان کو نشو ونما دیتی ہیں۔

اس سے یہ واضح ہوگیا کہ اسلامی معاشرہ اپنی ہیئت وصورت، حجم و وسعت اور طرز زندگی کے اعتبار سے تو بلاشبہ جامد اور غیر متبدل تاریخی تصویر نہیں ہے مگر اسلامی معاشرہ کا وجود اور اس کی تہذیب لازماً ایسی اقدار سے موبوط ہوتا ہے جو حد درجہ ٹھوس، تغیر نا آشنا اور تاریخ انسانی کے اٹل حقائق ہیں۔ زندگی کی ان اسلامی اقدار کو جب ہم ''تاریخی حقائق'' کہتے ہیں، تو اس سے ہماری مراد صرف اتنی ہوتی ہے کہ یہ اقدار تاریخ کے ایک مخصوص مرحلے میں جلوہ گر رہی ہیں اور انسان ان کو خوب جانتا پہچانتا ہے ان کو

تاریخی اقدار قرار دینے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ یہ تاریخ کی پیدا کردہ ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ اقدار اپنی فطرت کے لحاظ سے کسی مخصوص زمانے کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں، بلکہ ہر دور کے لیے ہیں، اور یہ انسانوں کے پاس اُس سرچشمۂ ازل سے آئی ہیں جو ربانی منبع ہے، اور جو دائرہ انسانیت سے بلکہ خود مادّی کائنات کے دائرہ سے ماوراء اور بالاتر ہے۔

اِسلامی تہذیب کی مادّی شکلیں زمانے اور ماحول کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں

اِسلامی تہذیب اپنی مادّی اور ظاہری تنظیم کے لیے گوناگوں اور بوقلموں شکلیں اختیار کرسکتی ہے لیکن یہ تہذیب جن اصولوں اور قدر رواں پر استوار ہوتی ہے وہ بے شک دائمی اور جامد اقدار ہیں، اس لیے کہ وہ اس تہذیب کے حقیقی پشتیبان ہیں، اور وہ ہیں: صرف اللہ کی بندگی، عقیدۂ توحید کی بنیاد پر انسانی اجتماع، مادیت پر انسانیت کا غلبہ، انسانی اقدار کا فروغ اور اس کے ذریعے انسان کے اندر حیوان کی تسخیر اور انسانیت کی نشو ونما میں اس کا استعمال، خاندانی نظام کا احترام، زمین پر اللہ کی خلافت کے تمام معاملات پر صرف اللہ کی شریعت اور الٰہی طریق حیات کی حکمرانی!

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اسلامی تہذیب مادی تنظیمات کے لیے اُن صلاحتیوں کو استعمال کرتی ہے جو بالفعل کسی ماحول میں موجود ہوتی ہیں، اس لیے اسلامی تہذیب کی مادی صورتیں اور خاکے پائیدار اور ابدی اقدار پر استوار ہونے کے باوجود صنعتی، اقتصادی اور سائنٹفک ترقی کے مختلف درجوں اور مرحلوں سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان شکلوں اور خاکوں میں برابر تبدیلی ہوتے رہنا ناگزیر ہے۔ بلکہ یہ تبدیلی بجائے خود یہ ضمانت فراہم کرتی ہے کہ اسلام کے اندر ایسی لچک اور گنجائش موجود ہے کہ وہ ہر قسم اور سطح کے ماحول میں داخل ہو کر زندگی کو اپنے حسب منشا ڈھال سکتا ہے۔ اسلامی تہذیب کی ظاہری اور خارجی صورتوں میں لچک اور تغیر پذیری کا وجود عقیدۂ اسلام پر جو تہذیب کا ماخذ ہے، کہیں باہر سے ٹھونسا نہیں گیا ہے بلکہ یہ خود اس عقیدہ کی فطرت اور مزاج کا تقاضا ہے۔ البتہ پیش نظر رہے کہ کسی چیز

کے لچک دار ہونے کا معنی یہ نہیں ہے کہ اُسے مادۂ سیال میں بتدیل کر دیا جائے۔ لچک میں اور اس طرح کے سیال پن میں بہت بڑا فرق ہے۔

اسلام نے وسطی افریقہ کے اندر رنگ ڈھڑنگ اقوام کے اندر تہذیب کی بنیاد ڈال تھی، اور اس کا اثر یہ تھا کہ جہاں جہاں جیسے جیسے وہ اسلام سے متاثر ہوتے عریانی اور ننگے جسم ستر پوش ہوتے جاتے۔ اور برہنہ گھومنے والے انسان لباس پہن کر دائرہ تہذیب میں داخل ہوجاتے۔ یہ سب اسلامی تعلیمات کا ہی کرشمہ تھا، ان تعلیمات کا، جو فکر انسانی کو عزلت وتنہائی سے نکال کر بصیرت افروز حقائق سے روشناس کرتیں۔ انسانی ذہنوں کو جلا بخشتیں اور انسانوں کو اس قابل بنا دیتیں کہ وہ کائنات کے مادی خزانوں کو اپنے تصرف میں لاسکیں۔ ان کے زیر اثر انسان قبیلہ اور برادری کے محدود دائروں سے نکل کر امت اور ملت کے دائرہ میں داخل ہوجاتے۔ اور غاروں میں بیٹھ کر سورج دیوتا کی پرستش کرنے کے بجائے پروردگار عالم کی بندگی اختیار کر لیتے۔ پس اگر اس عظیم انقلاب کا نام تہذیب نہیں ہے تو پھر تہذیب کس بلا کا نام ہے؟ یہ اس خاص ماحول کی تہذیب ہے جو اپنے اندر بالفعل پائے جانے والے وسائل وذرائع پر اعتماد کرتا ہے۔ اگر اسلام کسی اور ماحول میں داخل ہوگا، تو وہاں وہ اپنی تہذیب کو وہ شکل دے گا جو اس ماحول کے وسائل وذرائع اور اُس کے اندر بالفعل پائی جانے والی صلاحیتوں کو استعمال کرنے اور انہیں مزید نشو ونما دینے کے لیے ضروری ہے۔ الغرض اسلامی طریق حیات کے تحت تہذیب کا قیام وفروغ صنعتی، اقتصادی اور علمی ترقی کے لیے کسی مخصوص معیار پر موقوف نہیں ہے، تہذہب جہاں بھی قائم ہوگی وہاں کے مادی وسائل وامکانات موجود نہ ہوں گے وہاں تہذیب خود ان کو مہیا کرے گی اور اُن کے نشو ونما اور ترقی کا انتظام کرے گی، لیکن قائم بہرحال وہ اپنے مستقل، پائدار اور ابدی اصولوں پر ہی ہوگی۔ اور اُس کے ذریعہ جو اسلامی معاشرہ میں وجود میں آئے گا اُس کا مخصوص مزاج اور مخصوص تحریکی نظام ہر حال میں باقی رہے گا، وہ مزاج اور تحریکی نظام جو اس اسلامی معاشرے کے وجود میں آنے کے بعد پہلے روز سے ہی اسے دوسرے تمام جاہلی معاشروں کے مقابلے میں ممتاز اور الگ کر دیتا ہے

ـ ”صبغة اللّٰه و من احسن من اللّٰه صبغة؟“

باب ھشتم

اِسلام اور ثقافت

چھٹی فصل میں ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام کے پہلے رُکن کا پہلا جز یہ ہے کہ بندگیٔ مطلق صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے اور لا الٰہ الا اللہ میں اسی مفہوم اور مقتضیٰ کی شہادت ادا کی جاتی ہے۔ اِس رُکن کا دوسرا جز یہ ہے کہ اس کی بندگی کی تفصیل اور صحیح کیفیت جاننے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے۔ ''محمد رسول اللہ'' کی شہادت میں اسی امر کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ کی بندگیٔ مطلق کی عملی صورت یہ ہے کہ صرف اللہ کی ذات کو اعتقاداً، عملاً اور قانوناً معبود تسلیم کیا جائے۔ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اللہ کے سوا کسی اور کو بھی خدائی کا منصب حاصل ہے۔ اور نہ مسلمان ہوتے ہوئے کوئی شخص یہ تصور رکھ سکتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی مخلوق کی عبادت بھی کی جاسکتی ہے یا کسی کو حاکمیت کا مقام دیا جاسکتا ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم یہ بات بھی واضح کر آئے ہیں کہ عبودیت، عقیدہ اور عبادت کا صحیح مفہوم و مدعا کیا ہے۔ زیر بحث فصل میں ہم یہ بتائیں گے کہ حاکمیت (Sovereignty) کا صحیح مفہوم کیا ہے اور اس مفہوم کا ثقافت (Culture) کے ساتھ کیا تعلق ہے؟۔

شریعتِ الٰہی کا دائرہ کار

اسلامی نظریہ کی رُو سے اللہ کی حاکمیت کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ قانونی احکام صرف اللہ سے اخذ کیے جائیں، اور پھر انہیں احکام کی طرف فیصلوں کے لیے رجوع کیا جائے اور انہیں کے مطابق فیصلے

کیے جائیں۔اسلام میں خود ''شریعت'' کا مفہوم بھی محض قانونی احکام کے دائرے تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ حکمرانی کے اصولی ضوابط ،اُس کے نظام اور اُس کی مختلف تشکیلات تک بھی محدود نہیں ہے۔شریعت کا یہ محدود اور تنگ تصور اسلامی شریعت اور اسلامی نظریہ کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔اسلام جس چیز کو شریعت الٰہی کہتا ہے وہ اُس پوری اسکیم پر حاوی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کی تنظیم کے لیے وضع فرمائی ہے۔فکر ونظر کے ضابطے بھی اس میں شامل ہیں اور اصولِ حکمرانی بھی،اصولِ اخلاق وتمدن بھی اسی دائرے میں آتے ہیں اور قوانین معاملات اور ضوابط علم وفن بھی۔شریعت الٰہی انسانی فکر ونظر کے ہر زاویے کا احاطہ کرتی ہے۔

ذات الٰہی کے بارے میں انسان کا تصور ہو، یا کائنات کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر، مادی دنیا ہو جو انسان کے ادراک اور مشاہدے کی زد میں ہے، یا ماورالطبیعت حقائق، جو انسانی حواس وادراک کی گرفت سے باہر ہیں، زندگی کا تکوینی دائرہ ہو یا تشریعی ،انسان کی حقیقت وماہیت کا سوال ہو یا اس کائنات میں خود انسان کی حیثیت کی بحث ،شریعت اسلامی انسانی زندگی کے ان تمام گوشوں سے بحث کرتی ہے۔اسی طرح زندگی کے عملی شعبوں مثلاً سیاست ومعاشرت اور اقتصاد وعدالت اور ان کے اساسی اصول وقواعد سے بھی شریعت اسلامی صرف نظر نہیں کرتی ، بلکہ چاہتی ہے کہ ان کے اندر بھی اللہ واحد کی عبودیت کا ملہ کا سکہ رواں ہو۔اس کے ساتھ ہی وہ اپنی عمل داری اُن قانونی احکام پر بھی قائم کرنا چاہتی ہے جو ان عملی شعبہ ہائے حیات کی تنظیم کرتے ہیں، یہ وہی چیز ہے جسے بالعموم آج کل ''شریعت '' کا نام دیا جاتا ہے۔حالانکہ شریعت کا یہ تنگ اور محدود مفہوم اُس وسیع تر مفہوم کو ہرگز ادا نہیں کرتا جو اسلام میں اختیار کیا گیا ہے۔)اخلاق اور معاملات کے ضابطوں میں یہ شریعت کارفرما ہوتی ہے،اور اُن اقدار اور پیمانوں کے ذریعہ اس شریعت کا اظہار ہوتا ہے جو معاشرے میں پائے جاتے ہیں اور جو اجتماعی زندگی میں اشخاص اور اشیاء اور اعمال کا وزن اور قیمت طے کرتے ہیں۔علی ہذا القیاس یہ شریعت علم وفن کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوتی ہے اور تمام فکری کاوشوں اور فنی سرگرمیوں میں اس کا ظہور ہوتا

۔ان میں بھی ہم اُسی طرح اللہ کی رہنمائی کے محتاج ہیں جس طرح جدید اور محدود مفہوم کے قانونی احکام میں ہم ہدایت الٰہی کے حاجت مند ہیں۔

چنانچہ جہاں تک حکومت اور قانون کے باب میں حاکمیتِ الٰہی کو تسلیم کرنے کا سوال ہے وہ ہماری گزشتہ بحثوں سے واضح ہوچکی ہوگی۔اسی طرح اخلاق ومعاملات اور معاشرے کی اقدار اور ردّ وقبول کے پیمانوں کے اندر حاکمیت الٰہی کے نفاذ کی ضرورت بھی کسی نہ کسی حد تک امید ہے واضح ہوچکی ہوگی۔اس لیے کہ معاشرے کے اندر جو قدریں پائی جاتی ہیں، ردّ وقبول کے جو پیمانے رائج ہوتے ہیں، اخلاق اور معاملات کے جو ضابطے جاری وساری ہوتے ہیں وہ بلا واسطہ اُن تصورات سے ماخوذ ہوتے ہیں جو اُس معاشرے پر غالب ہوتے ہیں، اُن کے سوتے بھی اُسی سرچشمہ سے پھوٹتے ہیں جہاں سے ان تصورات تہ میں کارفرما عقیدہ ماخوذ ہوتا ہے۔

لیکن جو بات عام لوگوں کے لیے تو کُجا خود اسلامی لٹریچر کے قارئین کرام کے لیے بھی باعث حیرت واستعجاب ہوگی وہ یہ ہے کہ فکری اور فنّی میدانوں میں بھی اسلامی تصور اور ربانی ماخذ ومنبع ہی کو لازماً ہمارا مرجع اور راہنما ہونا چاہیے۔

فن (آرٹ) کے موضوع پر ایک مستقل کتاب منصہ ٔظہور پر آچکی ہے جس میں اس موضوع پر اس نقطہ ٔ نظر سے کلام کیا گیا ہے کہ تمام فنی کاوشیں درحقیقت انسان کے تصورات اور اس کے وجدان وانفعال کی تعبیر ہیں۔اور انسان کے وجدان میں ہستی اور زندگی کی جو اور جیسی کچھ تصویر پائی جاتی ہے وہ اُس کی عکاسی کرتی ہیں۔یہ تمام امور ایسے ہیں جنہیں اسلامی تصور نہ صرف کنٹرول کرتا ہے بلکہ ایک مومن ومسلم کے وجدان میں ان کی تخلیق بھی کرتا ہے۔کیونکہ اسلامی تصور کائنات انسان کی ذات اور زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہوتا ہے اور ان تمام پہلوؤں کا ان کے خالق سے جو تعلق ہے اُس کی نشان دہی کرتا ہے۔اس کا خصوصی موضوع ہے: انسان کی حقیقت اور اِس کائنات کے اندر اُس کی حیثیت، اس کا مقصد وجود، اس کا فرض منصبی، اور اس کی زندگی کی اقدارِ حقیقی!! یہ سب اسلامی تصور کے ضروری اجزا ہیں

کیونکہ اسلامی تصور محض ایک فکری اور تجریدی ڈھانچہ نہیں ہے بلکہ ایک زندہ ،فعال،اثر انگیز اور محرک حقیقت کا نام ہے جو ان تمام جذبات وتاثرات پر تصرف کرتا ہے جو انسان کے اپنے اندر پیدا ہوتے ہیں ۔(یہ اقتباس محمد قطب کی کتاب ''منہج الفن الاسلامی'' سے ماخوذ ہے۔مصنف نے اسی کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے)سیاست واجتماع ،معیشت کے اصول وقواعد،انسانی سرگرمیوں کے محرکات کی توجیہ،یا انسانی تاریخ کی تعبیر سے ہو اللہ کے سوا اور ماخذ ومنبع سے رہنمائی اور روشنی حاصل کرے۔اسی طرح مسلمان اس امر کا پابند ہے کہ وہ اس رہنمائی اور روشنی کے حصول کے لیے ایسے مسلمان کو ذریعہ بنائے جس کے دین وتقویٰ پر اُسے اعتماد ہو اور جس کے عقیدہ وعمل میں تضاد اور دورنگی نہ ہو۔

وہ علوم جن میں انسان وحی الٰہی کا پابند نہیں ہے

البتہ مسلمان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ علوم مجرد کو مسلمان اور غیر مسلم سبھی سے حاصل کرسکتا ہے۔مثلاً کیمیا(Chemistry)طبعیات(Physics)حیاتیات(Biology)فلکیات(Astronomy) طب(Medician)صنعت (Industry)زراعت(Agriculture)نظم ونسق(Administration)(صرف فنی پہلو کی حد تک)،ٹیکنالوجی،فنونِ حرب (فنی پہلو سے)اورانہی جیسے دوسرے علوم وفنون۔اگر چہ اصل الاصول یہ ہے کہ مسلم معاشرہ جب وجود پذیر ہو جائے تو وہ خود کوشش کرے کہ ان تمام میدانوں کے اندر یہ صلاحیتیں بافراط پیدا کرے۔اس لیے کہ یہ تمام علوم وفنون فرض کفایہ ہیں۔ان کے اندر کچھ لوگوں کا خصوصی مہارت اور قابلیت پیدا کرنا ضروری ہے۔اور اگر یہ صلاحیتیں پیدا نہ کی جائیں اور ایسی فضا بھی مہیّا نہ کی جائے جس میں یہ صلاحیتیں اُجاگر ہوں ،پروان چڑھیں ،رُوبعمل ہوں اور مفید نتائج پیدا کریں تو را معاشرہ بحیثیت مجموعی گناہ گار ہوگا ۔لیکن جب تک سب کچھ میسر نہ آئے مسلمان کو اجازت ہے کہ وہ یہ علوم وفنون اور ان کی عملی تشریحات مسلم اور غیر مسلم سبھی سے حاصل کرسکتا ہے،اور مسلم اور غیر مسلم دونوں کی کاوشوں اور تجربوں سے

استفادہ کرسکتا ہے،اور مسلم اور غیر مسلم کو بلاتفریق یہ خدمات سونپ سکتا ہے۔ یہ ان امور میں شامل ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:''انتم اعلم بأمور دنیاکم ''(تم اپنے دنیاوی امور کو زیادہ بہتر سمجھتے ہو)۔ان کا تعلق ان امور سے نہیں ہے جو حیات و کائنات کے بارے میں مسلمان کے تصور سے تعلق رکھتے ہیں یا انسان اور انسان کے مقصد تخلیق اور انسان کی ذمہ داری کی حقیقت اور اِردِگرد کی کائنات سے انسان کے تعلقات کی نوعیت اور خالق ہستی کے ساتھ اس کے تعلق سے بحث کرتے ہیں،ان کا تعلق ان اصول وضوابط اور قوانین وشرائع سے بھی نہیں ہے جو فرد اور جماعت کی زندگی کی تنظیم کرتے ہیں۔اخلاق وآداب اور رسوم وروایات اور ان اقدار ومعیارات سے بھی ان کا تعلق نہیں ہے جن کو معاشرے میں سیادت حاصل ہوتی ہے اور معاشرے میں اپنے نقش ونگار اُبھارتے ہیں لہٰذا ان علوم کے حصول میں مسلمان کو یہ خطرہ نہیں ہے کہ اُس کے عقیدہ میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے گی یا وہ جاہلیت کی طرف پلٹ جائے گا۔

لیکن جہاں تک انسانی جدوجہد کی توجیہ کا تعلق ہے خواہ وہ جدوجہد انفرادی صورت میں ہو یا اجتماعی صورت میں اور اس جدوجہد کا تعلق براہ راست انسان کی ذات اور انسانی تاریخ کے نظریات سے ہے۔اسی طرح جہاں تک کائنات کے آغاز،زندگی کی ابتداء اور خود انسان کی ابتداء کی تعبیر وتوجیہ کا تعلق ہے تو چونکہ ان سب امور کا تعلق ماوراء الطبعیات (Metaphysics) سے ہے(اور کیمسٹری ،فزکس،فلکیات اور طبّ وغیرہ سے اس کا تعلق نہیں ہے)اس لیے ان کی وہی حیثیت ہے جو انسان کی زندگی اور انسانی تگ ودو کو منظّم کرنے والے اصول وضوابط اور قوانین وشرائع کی ہے۔ان کے رشتے بلاواسطہ عقیدہ وتصور سے ملتے ہیں۔لہٰذا کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ان امور کو مسلمان کے سوا کسی اور سے حاصل کرے بلکہ یہ تو اُسے صرف اُسی مسلان سے حاصل کرنے چاہئیں جس کے دین وتقویٰ پر اُسے کامل بھروسہ ہو،اور اُسے پختہ یقین ہو کہ وہ ان امور میں صرف اللہ سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔اصل غرض یہ ہے کہ مسلمان کے احساس وشعور میں یہ حقیقت پوری طرح جاگزیں ہو جائے

کہ ان تمام امور کا تعلق عقیدہ سے ہے، اور وہ یہ اچھی طرح جان لے کہ ان امور میں وحی الٰہی سے روشنی اخذ کرنا اللہ کی بندگی کا لازمی تقاضا یا اس کی شہادت کا ناگزیر نتیجہ ہے جس میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔

اس میں البتہ کوئی قباحت نہیں ہے کہ ایک مسلمان ان امور میں جاہلی تحقیقات اور کاوشوں کے نتائج وآثار کھنگال ڈالے، لیکن اس نقطہ نظر سے نہیں کہ وہ ان امور کے بارے میں ان سے اپنے لیے تصور و ادراک کا سواد حاصل کرے۔ بلکہ صرف یہ جاننے کے لیے کہ جاہلیت نے کیا کیا انحراف کی راہیں اختیار کی ہیں اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ان انسانی گمراہیوں کو ختم کیوں کر کیا جا سکتا ہے، اور کس طرح انسانی کج رویوں کو راست روی میں تبدیل کر کے انسان کو سلامتی تصور حیات اور اسلامی عقیدہ کے تحت صحیح اصولوں سے ہمکنار کیا جا سکتا ہے۔

انسانی علوم پر جاہلیت کے اثرات

فلسفہ، تاریخ انسانی تعبیر، علم النفس (بہ استثنا ان مشاہدات اور اخلاقی آراء کے جو تعبیر وتوجیہ سے بحث نہیں کرتیں)، اخلاقیات، مذہبیات اورت مذاہب کا تقابلی مطالعہ، سماجی اور عمرانی علوم (مشاہدات ، اعداد شمار اور براہِ راست حاصل کردہ معلومات کو چھوڑ کر صرف ان نتائج کی حد تک، جو ان معلومات اور مشاہدات سے کشید کیے گئے ہیں اور وہ اساسی نظریات جو ان کی بنیاد پر مترتب ہوتے ہیں) ان تمام علوم کا مجموعی رُخ اور نصب العین قدیم اور جدید، ہر دور میں اپنے جاہلی عقائد اور خرافات سے براہِ راست متاثر رہا ہے۔ بلکہ جاہلی معتقدات وخرافات پر ہی اُن کی عمارت تعمیر ہوتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان علوم میں سے بیشتر علوم اپنے بنیادی اصولوں میں مذہب سے متصادم ہیں اور مذہب کے تصور سے بالعموم اور اسلامی تصور سے بالخصوص کھلی یا چھپی عداوت رکھتے ہیں۔

انسانی فکر وعلم کے یہ گوشے اُس اہمیت کے حامل نہیں جو کیمسٹری، فزکس، فلکیات، حیاتیات اور طب

وغیرہ کو حاصل ہے، بشرطیکہ مؤخرالذکر علوم صرف عملی تجربات اور عملی نتائج کی حد تک رہیں، اور اس حد کو پھاند کر فلسفیانہ تاویلات وتوجیہات (خواہ کسی صورت میں ہوں) تک تجاوز نہ کریں۔ جیسا کہ مثلاً ڈارون ازم نے حیاتیات میں مشاہدات کے اثبات وترتیب کا کام سرانجام دیتے دیتے اپنی جائز حدود پھلانگ کر بلاکسی دلیل وحجت کے بلکہ بلاکسی ضرورت کے، محض جذبات سے مغلوب ہوکر یہ نظریہ بھی پیش کردیا کہ زندگی کے آغاز اور اُس کے ارتقاء کے لیے طبعی دنیا سے بالاتر کسی قوت کا وجود فرض کرنے کے سرے سے کوئی ضرورت نہیں ہے۔

مسلمان کے پاس ان معاملات کے بارے میں اپنے پروردگار کی طرف سے ضروری اور اٹل معلومات پہنچ چکی ہیں، اور وہ اس درجہ اعلیٰ وارفع ہیں کہ ان کے مقابلے میں انسانی معلومات اور کاوش نہایت مضحکہ خیز اور ہیچ معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے باوجود انسان اس دائرے میں دخل اندازی کا مرتکب ہوتا ہے، جن کا تعلق براہ راست عقیدہ اور بندگیٔ رب سے ہے۔

ثقافت اور صہیونیت

یہ بات کہ ثقافت ایک انسانی میراث ہے، یہ کسی مخصوص وطن سے مقید نہیں ہے، نہ اس کی کوئی مخصوص قومیت ہے اور نہ اس کا کسی معین مذہب سے رشتہ ہے یہ بیان سائنسی اور فنی علوم اور ان کی علمی تشریح کی حد تک توصحیح ہے۔ بشرطیکہ ہم ان علوم کے دائرہ کار کو پھاند کر اس حد تک تجاوز نہ کرجائیں کہ ان علوم کے نتائج کی فلسفیانہ تعبیر (Metaphysical Interpretations) کرنے لگیں، اور انسان، اور انسان کی تگ ودو اور انسانی تاریخ کی فلسفیانہ تاویل میں پڑجائیں۔ اور فن وادب اور وجدانی تعبیر کے مظاہر تک کی فلسفیانہ توجیہ کرڈالیں۔ لیکن ثقافت کے بارے میں یہ نظریہ جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے دراصل عالمی یہودیت کی مختلف چالوں میں سے ایک چال ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ تمام حدود وقیود کو ۔جن میں سرفہرست عقیدہ ومذہب کی حدود وقیود ہیں۔ پامال کردیا جائے تاکہ یہودیت کا زہر تمام دنیا

کے جسم میں جب وہ بے حس، خمار آلود اور نیم جان ہو چکی ہو، بآسانی سرایت کر جائے اور پھر یہودیوں کو دنیا کے اندر اپنی شیطانی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی پوری آزادی حاصل ہو۔ان سرگرمیوں میں سرفہرست سُودی کاروبار ہے۔جس کا مقصد یہ ہے کہ تمام انسانیت کا خون و پسینہ کا حاصل ان یہودی اداروں کے قبضہ میں چلا جائے جو سُود کی بنیاد پر چل رہے ہیں۔

اسلام کے نزدیک ان تمام سائنسی اور فنّی علوم اور ان کے عملی تجربات کے پس منظر میں دو قسم کی ثقافتیں کارفرما ہیں۔ایک اسلامی ثقافت جو اِسلام کے نظریۂ حیات پر قائم ہے اور دوسری جاہلی ثقافت جو بظاہر مختلف النوع کی مناہج پر قائم ہے مگر درحقیقت ان سب کی اساس و بنیاد ایک ہی ہے، اور وہ فکرِ انسانی کو الٰہ کا مقام دینے کا داعیہ اور ادعا، تاکہ اُس کی صحت وعدم صحت کو پرکھنے کے لیے اللہ کو مرجع قرار نہ دیا جائے۔اسلامی ثقافت انسان کی تمام فکری اور عملی سرگرمیوں کو محیط ہے۔اور اُس کا دامن ایسے اصول وقواعد اور مناہج وخصائص سے مالامال ہے جو نہ صرف ان سرگرمیوں کی مزید نشوونما کی ضمانت دیتے ہیں بلکہ ان کو حیاتِ ابدی اور حُسن بھی عطا کرتے ہیں۔

یورپ کے تجرباتی علوم اِسلامی دَور کی پیداوار ہیں

اس حقیقت سے کسی کو بے خبر نہ رہنا چاہیے کہ تجرباتی علوم (Empirical Science) جو عہدِ حاضر میں یورپ کی صنعتی تہذیب کی رُوح رواں ہیں، ان کی جنم بھومی یورپ نہیں بلکہ اندلس اور مشرق کے ممالک کی اسلامی یونیورسٹیاں ہیں۔ان علوم کے بنیادی اصول اسلام کی اُن تعلیمات اور ہدایات سے اخذ کئے گئے تھے جن میں کائنات اور اس کی فطرت اور اُس کے سینے میں مدفون طرح طرح کے ذخائر وخزائن کی جانب واضح اشارے موجود ہیں۔بعد میں اسی نہج پر یورپ کے اندر ایک مستقل علمی تحریک برپا ہوئی۔اور کشاں کشاں وہ ترقی اور تکمیل کے مراحل طے کرتی رہی۔اس عرصہ میں عالمِ اسلامی کا یہ حال ہو گیا کہ وہ اسلام سے دُور ہوتا چلا گیا۔جس کے نتیجے میں اسلامی دنیا میں یہ علمی تحریک

پہلے جمود اور سہل انگاری کا شکار ہوئی اور پھر بتدریج ختم ہوگئی۔اس کے خاتمہ میں متعدد عوامل کو دخل تھا۔کچھ عوامل اس وقت کے اسلامی معاشرے کی داخلی ساخت میں مضمر تھے۔اور بعض کا تعلق اُن لگا تار حملوں سے تھا جو صلیبی اور صہیونی دنیا کی طرف سے اسلامی دنیا پر اس عرصے میں کیے گئے۔یورپ نے اسلامی دنیا سے تجرباتی علوم کا جو طریقِ کار اخذ کیا تھا اس کا رشتہ اس نے اس کی اسلامی بنیادوں اور اسلامی معتقدات سے کاٹ دیا۔اور بالآخر یورپ نے چرچ سے، جو خدائی بادشاہت (Heavenly Kingdom) کی آڑ لے کر انسانوں پر مظالم توڑ رہا تھا، قطعِ تعلق کیا تو اِسی افراتفری کے دوران میں اُس نے تجرباتی علوم کے اسلامی طریقِ کار کو بھی اللہ کی ہدایت سے محروم کر دیا۔یوں یورپ کا فکری سرمایہ مجموعی طور پر ہر دَور اور ہر جگہ کے جاہلی فکر کی طرح ایک بالکل نئی چیز بن کر رہ گیا جو اپنی فطرت و بنیاد میں اسلامی تصور سے نہ صرف اجنبی تھا بلکہ اسلامی تصور کے بالکل متضاد بھی تھا، اور اس سے سر بسر متصادم تھا۔بنابریں ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ صرف اِسلامی تصورِ زندگی کے اصول وقواعد کو اپنا مرجع ٹھیرائے اور صرف تعلیمات خداوندی ہی سے نورِ بصیرت حاصل کرے۔اگر وہ ان تعلیمات کو براہِ راست اخذ کرنے کی قدرت رکھتا ہو تو فبہا ورنہ اگر اُسے یہ قدرت حاصل نہ ہو تو کسی ایسے اللہ پرست مسلمان سے انہیں حاصل کرے جس کے دین وتقویٰ پر اُسے بھروسہ ہو اور جسے وہ پورے قلبی اطمینان کے ساتھ اپنا ذریعہ علم بنا سکتا ہو۔

علم اور ذریعہ علم میں انفصال درست نہیں

یہ نظریہ کہ علم الگ چیز ہے اور ذریعۂ علم الگ، اسلام اس نظریہ کو ان علوم کے بارے میں تسلیم نہیں کرتا جن کا تعلق عقیدہ کی ان تفصیلات سے ہے جو ہستی و زندگی، اخلاق واقدار، عادات و رسوم اور انسانی نفس اور اِنسانی جدوجہد سے متعلق گوشوں کے بارے میں انسان کے نقطۂ نظر پر اثر انداز ہوتی ہیں۔بلاشبہ اسلام اس حد تک تو رواداری برتتا ہے کہ ایک مسلمان کسی غیر مسلم کو یا ناخدا ترس مسلمان کو کیمسٹری

،فزکس،فلکیات،طب،صنعت وزراعت،ایڈمنسٹریشن اورایسے ہی دوسرے فنون میں اپنا ماخذعلم بنائے ،اوروہ بھی ان حالات میں جب کہ کوئی ایسا خدا پرست مسلمان نہ مل رہا ہو جوان فنون کی تعلیم دے سکے ۔بعینہٖ یہی صورت آج اگران لوگوں کودرپیش ہے جواپنے آپ کومسلمان کہتے ہیں۔یہ صورت حال اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ یہ مسلمان اپنے دین سے اوراپنے طریقِ حیات سے دُور ہو چکے ہیں،اوراسلام کے اس تصورکوفراموش کر چکے ہیں جواُس نے خلافت الٰہی کے مقتضیات کوسرانجام دینے اوران علوم وتجربات اورمختلف النوع صلاحتیوں کے بارے میں پیش کیا ہے جوامورخلافت کومنشائے الٰہی کے تحت سرانجام دینے کے لیے ناگزیر ہیں۔بہرحال علوم مجرّدہ کی حدتک تواسلام مسلمانوں کواجازت دیتا ہے کہ وہ کس غیرمسلم کواپنا ذریعہ بنالے،مگر وہ اس کواس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے عقیدہ کے اصول،اپنے تصورحیات کی اساسات،قرآن کی تفسیر،حدیث اورسیرت نبوی ﷺ کی تشریح،تاریخ کا فلسفہ،حرکت کی فلسفیانہ تعبیر،اپنے معاشرے کی عادات واطوار،اپنی حکومت کا نظام،اپنی سیاست کاڈھنگ،اپنے ادب وفن کےمحرّکات بھی غیراسلامی مآخذ سے حاصل کرے یاکسی ایسے مسلمان کوان کا ذریعہ بنائےجس کا دین ناقابل اعتماد ہواور جوتقویٰ اوراللہ خوفی سے عاری ہو۔

یہ بات آپ سے وہ شخص کہہ رہا ہےجس نے پورے چالیس سال کتب بینی میں گزارے ہیں اوراس پورے عرصہ میں اُس کا کام صرف یہ رہا ہے کہ انسانی علم وتحقیق نےمختلف گوشوں میں جونتائج مہیّا کیے ہیں اُن کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرے۔علم وتحقیق کے کچھ شعبے وہ تھے جن میں وہ تخصص (Specialise) کررہا تھااور کچھ گوشوں میں اُس نے طبعی میلان اورفطری رغبت کے تحت خاک چھانی۔اس سرمایۂ علم وآگہی کے انبارکو لے کر جب اُس نے اپنے اصل عقیدہ اورتصور کے سرچشموں کی طرف رجوع کیااوراُن کا مطالعہ کیا تو اُسے معلوم ہوا کہ جوکچھ اُس نے آج تک پڑھا ہے وہ اِن اتھاہ خزانوں کے مقابلے میں نہایت حقیر اور ہیچ میرز ہے(بلکہ اسے حقیر اور ہیچ میرز ہونا ہی چاہیے تھا)وہ اس بات پرنادم نہیں ہے کہ اُس نے اپنی زندگی کے چالیس سال کن چیزوں میں گزارے

۔کیوں کہ اس مدت میں اُسے جاہلیت کے پوست کندہ حالات معلوم کر لیے ہیں،اُس نے جاہلیت کی گمراہیوں کوبچشم سر دیکھا ہے، جاہلیت کی بے مائگی کا مشاہدہ کیا ہے، جاہلیت کی پستی کا اندازہ کیا اوراس کے کھوکھلے ہنگاموں اور مصنوعی ہنگامہٗ ہاؤہوکو دیکھا ہے،اُس کے غروروا ستکبار اور دعووں کوخوب پرکھا ہے۔اور اُسے یقین ہوگیا کہ ایک مسلمان علم کے ان دونوں (متضاد) ذریعوں (ذریعہ الٰہی اور ذریعہ جاہلیت) سے بیک وقت مستفید نہیں ہوسکتا۔

بایں ہمہ یہ میری ذاتی رائے نہیں ہے کیونکہ معاملہ اس سے کہیں بالا ہے کہ اس میں کسی شخص کی ذاتی رائے کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے،میزان الٰہی میں اس معاملے کا جو وزن ہے اُس کے مقابلے میں کسی مسلمان کی رائے پر اعتماد یا عدم اعتماد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔یہ تو اللہ اوراس کے رسول کا فرمان ہے،اوراسی فرمان کو ہم اس معاملے میں حکم ٹھیراتے ہیں۔ہم اس معاملے میں اللہ اوراس کے رسول کی طرف اُسی طرح رجوع کرتے ہیں جیسا کہ اہلِ ایمان کا شیوہ ہونا چاہیے کہ وہ باہمی اختلافات کے فیصلہ کے لیے اللہ اوراس کے رسول کی طرف رجوع کریں۔عامۃ المسلمین کے بارے میں یہود اور نصاریٰ جوشرانگیز عزائم رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اُن کو بے نقاب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوْا وَ اصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (بقرہ:۱۰۹)

اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کُفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔اپنے نفس کے حَسد کی بنا پر۔اس کے بعد کہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے۔پس تم عفو ودرگزر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کردے۔بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ

هُوَ الْهُدٰى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَ هُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَ كَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ. (بقرہ:۱۲۰)

یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔ صاف کہہ دو کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ اور اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آ چکا ہے ان (یہود ونصاریٰ) کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ كٰفِرِیْنَ. (آل عمران:۱۰۰)

اے ایمان والو! اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے کسی گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے جسے حافظ ابویعلیٰ نے بروایت حماد اور شعبی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، قرآن کے بیانات کی مزید تشریح کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا تسألوا اهل الكتاب عن شئ فانهم لن يهدوكم وقد ضلوا ، وانكم اما أن تصدقوا بباطل ، واما ان تكذبوا بحق ، وانه واللّٰه لو كان موسىٰ حيّاً بين اظهركم ما حلّ له الا أن يتبعني.

اہل کتاب سے کسی چیز کے بارے میں دریافت نہ کرو یہ تمہیں سیدھی راہ نہیں بتائیں گے، یہ تو خود راہ گم کردہ ہیں۔ اگر ان کی بات پر گئے تو یا تو تم کسی باطل کی تصدیق یا کسی صحیح بات کی تکذیب کردو گے۔ اللہ کی قسم اگر موسیٰ بھی تمہارے درمیان زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی میری اتباع کے سوا کوئی اور راستہ اختیار کرنا جائز نہ ہوتا۔

جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے بارے میں یہود ونصاریٰ کا یہ خطرناک عزم قطعی اور واضح شکل میں

بیان فرمادیا تو اس کے بعد یہ انتہائی بلادت اور کم نظری کی بات ہوگی کہ لمحہ بھر کے لیے بھی یہ خوش فہمی رکھی جائے کہ یہود ونصاریٰ اسلامی عقائد یا اسلامی تاریخ کے بارے میں جو بحث کرتے ہیں یا وہ مسلم معاشرے کے نظام، یا مسلم سیاست یا مسلم معیشت کے بارے میں جو تجویز پیش کرتے ہیں وہ کسی نیک نیتی پر مبنی ہوسکتی ہیں، یا ان سے مسلمانوں کی بہبود ان کے مدنظر ہوتی ہے، یا وہ فی الواقع ہدایت اور روشنی کے طالب ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے واضح اعلان اور قطعی فیصلے کے بعد بھی ان کے بارے میں یہ حُسن ظن رکھتے ہیں اُن کی عقل و دانش ماتم کے قابل ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ بھی طے فرمادیا ہے کہ ''قل ان ھدی اللّٰہ ھو الھدی ''(کہہ دیجئے کہ اللہ ہی ہدایت اصل ہدایت ہے)۔اس ارشاد نے یہ بات بھی متعین کردی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم ہی وہ واحد مرجع و ماخذ ہے جس کی طرف مسلمان کو اپنے سارے معاملات میں رجوع کرنا چاہیے۔ ہدایت الٰہی سے اعراض کے بعد سوائے گمراہی اور بے راہ روی کے اور کچھ نہ حاصل ہوگا۔ بلکہ اللہ کے سوا کوئی اور ایسا منبع سرے سے موجود ہی نہیں ہے جس سے ہدایت اور روشنی حاصل ہوسکتی ہو۔ مذکورہ بالا آیت میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی ہدایت ہی دراصل سچی ہدایت ہے اس صیغۂ حصر سے بیان ہی یہ ثابت کرنا ہے کہ وحی الٰہی کے بعد جو کچھ ہے ضلال وزیغ، گمراہی ٹیڑھ اور بدبختی ہی ہے۔آیت کا مفہوم یہ مفہوم و مدعا اس قدر واضح ہے کہ اس میں کسی شک اور تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

قرآن میں یہ قطعی حکم بھی وارد ہے کہ اس شخص سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے، جو اللہ کے ذکر سے رُوگردانی کرتا ہے اور صرف دنیا طلبی ہی اُس کا مطمع نظر اور مدار جستجو ہے۔قرآن نے ایسے آدمی کے بارے میں یہ وضاحت بھی کردی ہے کہ وہ صرف ظن وتخمین کا پجاری ہے اور علم ویقین کی اُسے ہوا تک نہیں لگی ہے ۔قرآن مسلمان کو ظن وتخمین کی پیروی سے منع کرتا ہے،اور جس شخص کی نگاہ حیاتِ دنیا کی ظاہری چمک دمک پر ہی اٹک کر رہ گئی ہو،قرآن کے نزدیک وہ جو ہر علم اور صحتِ نظر دونوں سے محروم ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاَعۡرِضۡ عَنۡ مَّنۡ تَوَلّٰی عَنۡ ذِكۡرِنَا وَ لَمۡ يُرِدۡ اِلَّا الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا۝ ذٰلِكَ مَبۡلَغُهُمۡ مِّـنَ الۡـعِلۡمِ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ وَ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اهۡتَدٰى ۝

(النجم:۲۹-۳۰)

جس شخص نے ہماری یاد سے منہ موڑے رکھا ہے اور وہ دنیا کی زندگی کے سوا کوئی اور خواہش نہیں رکھتا تو اُس پر دھیان نہ کر۔ان کے علم کی انتہا صرف یہاں تک ہی ہے ۔تیرا پروردگار خوب جانتا ہے اُس شخص کو جو اللہ کی راہ سے بھٹک چکا ہے اور اُس شخص کو جو راہِ راست پر چلا۔

يَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيَاةِ الدُّنۡيَا وَ هُمۡ عَنِ الۡآخِرَةِ هُمۡ غٰفِلُوۡنَ. (روم:۷)

وہ صرف دنیا کی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں۔

یہ سطح بین، ظاہر پرست اور علم حقیقی سے بے خبر وہی شخص ہوسکتا ہے جو اللہ کے ذکر سے غافل ،اور صرف ناپائیدار حیاتِ دنیا کا طلب گار ہو۔عہدِ حاضر کے تمام سائنس دان اور ماہرین فن کا یہی حال ہے۔یہ لوگ جس علم کے علمبردار ہیں یہ وہ علم نہیں ہے جس کے بارے میں ایک مسلمان اس کے حامل پر یکسوئی سے اعتماد کرسکتا ہو۔اور بے چون و چرا اُس سے اخذ واستفادہ کرتا چلا جائے۔ بلکہ اس علم کے معاملے میں مسلمان صرف اس قدر مجاز ہے کہ خالص علمی حد تک اُس سے استفادہ کرے۔لیکن اُسے زندگی کے بارے میں اور نفس انسانی اور اس کے تصوراتی متعلقات کے بارے میں اُس کی پیش کردہ تعبیر وتوجیہ پر دھیان نہ دینا چاہیے۔یہ وہ علم بھی نہیں ہے جس کی قرآن نے بار بار تعریف وتوصیف کی ہے۔ارشاد ہوتا ہے کہ:"هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون "(کیا اہل علم اور علم سے خالی لوگ برابر ہوسکتے ہیں)۔جو لوگ ایسی آیات کو سیاق وسباق سے الگ کرکے بے محل ان سے استدلال کرتے ہیں وہ یکسر غلطی پر ہیں۔علم کے بارے میں یہ فیصلہ کن اور خطِ امتیاز قائم کرنے والا بیان جس آیت میں وارد ہوا ہے وہ آیت یہ ہے:

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا یَّحْذَرُ الْاٰخِرَۃَ وَ یَرْجُوْا رَحْمَۃَ رَبِّہٖ قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُوْلُوا الْاَلْبَابِ. (زمر:۹)

کیا وہ جو اللہ کی بندگی کرتا ہے رات کے وقت سجود و قیام میں، اور آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت سے امید رکھتا ہے بتادیں کہ کیا برابر ہیں وہ لوگ جو سمجھ رکھتے ہیں اور وہ جو بے سمجھ ہیں۔ بے شک عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔

یہ بندۂ حق جو رات کی تنہائیوں میں اللہ کے آگے سرافگندہ ہوتا ہے، قیام و سجود میں اپنے خالق سے محوِ سرگوشی و مناجات ہوتا ہے، آخرت کے خوف سے لرزاں و ترساں رہتا ہے، اپنے رب سے رحمت کی اُمید سے قلب و نظر کو فروزاں رکھتا ہے، یہی وہ خوش بخت انسان ہے جو صحیح معنوں میں دولتِ علم سے بہرہ یاب ہے اور یہی وہ علم ہے جس کی طرف آیات بالا نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی ایسا علم جو اللہ کی طرف سے انسان کی رہنمائی کرتا ہے، تقویٰ و راستبازی کی نعمت سے اُسے ہمکنار کرتا ہے۔ یہ وہ علم نہیں جو انسانی فطرت کو مسخ کر دیتا ہے اور اُسے الحاد اور انکارِ اللہ کی راہ کج پر ڈال دیتا ہے۔

علم کا دائرہ صرف عقائد، دینی فرائض و واجبات اور احکام و شرائع کے علم تک ہی محدود نہیں ہے۔ علم کا دائرہ نہایت وسیع ہے، اس کا تعلق جتنا عقائد و فرائض اور شرائع سے ہے اتنا ہی قوانین فطرت اور خلافت الٰہی کی مصلحت و مفاد کے تحت ان قوانین کی تسخیر سے بھی ہے۔ البتہ جس علم کی بنیاد ایمان پر نہیں ہوتی وہ اُس علم کی تعریف سے خارج ہے جس کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے اور جس کے حاملین کی وہ مدح و ستائش کرتا ہے۔ اساس ایمان کے درمیان اور اُن تمام علوم کے درمیان جن کا تعلق نوامیس کائنات اور قوانین فطرت سے ہے۔ (مثلاً فلکیات، حیاتیات، طبعیات، کیمیا، اور طبقات الارض) ایک مضبوط رشتہ پایا جاتا ہے۔ یہ سارے کے سارے علوم وہ ہیں جو اللہ کی ہستی کا کُھلا کُھلا ثبوت پیش کرتے ہیں بشرطیکہ بھٹکی ہوئی انسانی خواہشات کے تصرف میں نہ آجائیں اور

انہیں اللہ کے تصور سے عاری نہ کر دیں۔جیسا کہ فی الواقع یورپ میں علمی ترقی کے دَور میں یہ افسوس ناک صورت حال پیش آ چکی ہے۔دراصل یورپ کی تاریخ میں ایسا دور آیا جب علماء اور ظالم و جفا کار چرچ کے درمیان انتہائی تکلیف دہ اور نفرت آ گیں اختلافات پیدا ہو گئے،جن کے نتیجے میں یورپ کی تمام تر علمی تحریک خدا بیزاری کی راہ پر چل پڑی۔اس تحریک نے یورپ میں زندگی کے ہر پہلو پر اپنے دور رس اثرات ڈالے۔بلکہ یورپ کے پُورے نظامِ فکر کا مزاج ہی بدل کر رکھ دیا۔ان زہر آ گیں اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ کہ صرف چرچ اور چرچ کے نظریات ومعتقدات کے خلاف ہی آتش غیظ وعداوت نہ بھڑکی ، بلکہ مجموعی طور پر خود مذہب کا تصور بھی نفرت وعناد کی لپیٹ میں آ گیا یہاں تک کہ یورپ نے علم و دانش کے تمام میدانوں میں جو فکری سرمایہ مہیا کیا وہ سارے کا سارا مذہب ی عداوت سے لبریز ہو گیا۔خواہ وہ ماوراء الطبیعی فلسفہ ہو یا مجرّد علمی اور فنّی تحقیقات ہوں جن کا بظاہر دین سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

یہ تو آپ نے جان لیا کہ مغرب کا اندازِ فکر اور پھر علم کے ہر میدان میں اس کی فکر کا تمام تر سرمایہ آغاز کار ہی میں جس اساس وبُنیاد پر استوار ہوا ہے اُس کی تہ میں وہ مسموم اثرات کارفرما تھے جو مذہب کی عداوت اور مذہب بیزاری کے پیدا کردہ تھے،اس کے بعد یہ جان لینا دشوار نہیں رہتا کہ مغرب کا فکری سرمایہ اور اس کے انداز میں بحیثیت مجموعی اسلام کے خلاف شدید عداوت ونفرت کے جذبات کیوں پائے جاتے ہیں۔اسلام کے خلاف اس نفرت کا مظاہرہ خاص طور پر دیدہ دانستہ کیا جاتا ہے۔اور اکثر حالات میں سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے تحت بھرپور کوشش کی جاتی ہے کہ اوّلاً اسلامی عقائد وتصورات کی پاکیزہ عمارت کو متزلزل کیا جائے اور پھر رفتہ رفتہ اُن اساسات ہی کو مسمار کر دیا جائے جو مسلم معاشرے کو دوسرے معاشروں سے ممیّز کرتی ہیں۔اس ناپاک سازش کا علم ہونے کے بعد بھی اگر ہم اسلامی تدریس میں مغربی اندازِ فکر ارمغربی سرمایۂ فکر پر تکیہ کریں گے تو اس سے بڑھ کر شرمناک تساہل اور ناقابل معافی کوتاہی کوئی نہ ہوگی۔بلکہ ہمارے لیے یہ بھی لازم ہے کہ خالص سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی

کی تعلیم حاصل کرتے وقت بھی، جسے ہم حالات حاضرہ میں مغربی آخذ سے لینے پر مجبور ہیں محتاط رہیں ،اوران علوم کوفلسفہ کی پرچھائیوں سے دُور رکھیں۔اس لیے کہ یہی وہ فلسفیانہ پرچھائیاں ہیں جو بنیادی طور پر مذہب کی بالعموم اور اسلام کی بالخصوص ضد اور نقیض واقع ہوئی ہیں۔اوران کا معمولی سا اثر بھی اسلام کے پاکیزہ وشفاف چشمہ کومکدر کرنے کے لیے کافی ہے۔

باب نہم

مسلمان کی قومیت

مسلمانوں کی اجتماعی تنظیم کی بنیاد

جس ساعتِ سعیدہ میں اسلام نے نوعِ انسانی کو اخلاق واقدار کا نیا تصور دیا، اوران اخلاق واقدار کے حصول کا نیا آستانہ بتایا۔ اُسی ساعتِ سعیدہ میں اس نے انسان کے باہمی تعلقات وروابط کا ایک نیا تصور بھی عطا کیا۔ اسلام کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ انسان اوراس کے رب کے درمیان تعلقات کو درست کرے، اورانسان کو یہ بتائے کہ پروردگارِ عالم ہی وہ واحد بااختیار ہستی ہے جس کی بارگاہِ عزت سے اُسے اپنی زندگی کی اقدار اور ردّ وقبول کے پیمانے حاصل کرنے چاہئیں۔ کیونکہ اُسی نے اُسے خلعت ہستی اورسرمایۂ حیات ارزانی فرمایا ہے۔ اپنے روابط اوررشتوں کے بارے میں بھی اُسی ذات کو مرکز ومرجع سمجھے جس کے ارادۂ کن فکاں سے وہ عدم سے وجود میں آیا ہے اورجس کی طرف اُسے آخر کارلوٹ کرجانا ہے۔ اسلام نے آکر پُوری قوت وصراحت کے ساتھ انسان کو یہ بتایا کہ اللہ کی نظر میں انسانوں کو باہم جوڑنے والا صرف ایک ہی رشتہ ہے۔ اگر یہ رشتہ پوری طرح استوار ہوگیا تو اس کے مقابلے میں خون اورمودّت والفت کے دوسرے رشتے مٹ جاتے ہیں:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْآ اٰبَآءَ هُمْ اَوْ اَبْنَآءَ هُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ. (مجادلة:۲۲)

جولوگ اللہ اورآخرت کے روز پرایمان رکھتے ہیں ان کوتم نہ دیکھو گے کہ وہ اللہ اوراس

کے رسول کے دشمنوں سے دوستی رکھتے ہیں گو وہ ان کے باپ اور بیٹے اور بھائی اور اہلِ قبیلہ ہی کیوں نہ ہو۔

دنیا کے اندر اللہ کی پارٹی ایک ہے۔اس کے مقابلے میں دوسری تمام پارٹیاں شیطان اور طاغوت کی پارٹیاں ہیں۔

اَلَّـذِیۡـنَ اٰمَـنُـوۡا یُـقَـاتِـلُـوۡنَ فِـیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ الطَّاغُوۡتِ فَقَاتِلُوۡۤا اَوۡلِیَآءَ الشَّیۡطٰنِ اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًا. (النساء:۷۶)

جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنھوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں نہایت کمزور ہیں۔

اللہ تک پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اس کے ماسوا جو راستہ ہے وہ اللہ سے دُور لے جانے والا ہے:

وَاَنَّ ھٰـذَا صِـرَاطِـیۡ مُسۡتَـقِیۡـمًـا فَـاتَّبِـعُـوۡہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمۡ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ. (انعام:۱۵۳)

یہی میرا سیدھا راستہ ہے، لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اُس کے راستے سے ہٹا کر تمھیں پراگندہ کر دیں گے۔

انسانی زندگی کے لیے صرف ایک ہی نظام حق ہے، اور وہ ہے اسلامی نظام، اس کے علاوہ جتنے نظام ہیں وہ عین جاہلیت ہیں:

اَفَـحُـکۡـمُ الۡـجَـاھِـلِیَّۃِ یَبۡـغُـوۡنَ ، وَمَـنۡ اَحۡـسَـنُ مِـنَ الـلّٰــہِ حُـکۡـمًـا لِقَوۡمٍ یُوۡقِنُوۡنَ. (المائدہ:۵۰)

تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

صرف ایک ہی شریعت واجب الاتباع ہے اور وہ ہے اللہ کی شریعت ۔اس کے سوا جتنی شریعتیں ہیں ،ہوائے نفس ہی ہیں:

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ. (جاثية:١٨)

اے نبی ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے۔لہٰذا تم اُس پر چلواوران لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔

دنیا میں حق صرف ایک ہے جس میں تعدّد وتنّوع محال ہے۔حق کے سو جو کچھ ہے وہ ضلالت اور تاریکی ہے:

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ. (يونس:٣٢)

پھر حق کے بعد گمراہی کے سوااور کیا باقی رہ گیا؟ آخر یہ تم کدھر پھرائے جارہے ہو۔

دنیا میں صرف ایک ہی ایسی سرزمین ہے جسے دارالاسلام کہا جاسکتا ہے۔اور وہ ملک ہے جہاں اسلامی ریاست قائم ہو،شریعت الٰہی کی فرماں روائی ہو۔حدوداللہ کی پاسداری ہو،اور جہاں مسلمان باہم مل کر امورِمملکت سرانجام دیتے ہوں۔اس کے علاوہ جوبھی سرزمین ہوگی وہ دارالحرب کے حکم میں داخل ہے۔دارالحرب کے ساتھ ایک مسلمان دوہی طرح کا رویّہ اختیار کرسکتا ہے: جنگ یا معاہدۂ امان کے تحت صُلح ۔معاہدملک دارالاسلام کے حکم میں ہرگزنہیں ہوگا۔اس کے اوردارالاسلام کے مابین ولایت کا رشتہ قائم نہیں ہوسکتا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْآ اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَىْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ وَ اللّٰهُ بِمَا

تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ۝ وَ الَّـذِيۡنَ كَفَرُوۡا بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ اِلَّا تَفۡعَلُوۡهُ تَكُنۡ فِتۡنَةٌ
فِى الۡاَرۡضِ وَفَسَادٌ كَبِيۡرٌ ۝ وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَ جَاهَدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ
وَ الَّـذِيۡـنَ اٰوَوۡا وَّ نَـصَـرُوۡۤا اُولٰٓـئِكَ هُـمُ الۡـمُـؤۡمِـنُوۡنَ حَقًّا لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّ رِزۡقٌ
كَرِيۡمٌ ۝ وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡم بَعۡدُ وَهَاجَرُوۡا وَجَاهَدُوۡا مَعَكُمۡ فَاُولٰٓئِكَ مِنۡكُمۡ

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے، اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام) نہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آ جائیں۔ ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُسے دیکھتا ہے۔ جو لوگ منکرِ حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں، اگر تم (اہل ایمان ایک دوسرے کی حمایت) نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جہاد کیا اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے۔ اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آ گئے اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں۔

اس روشن اور مکمل ہدایت اور اِس قطعی اور فیصلہ کن تعلیم کو لے کر اسلام دنیا میں رونق افروز ہوا۔ اور اس نے انسان کو خاک اور مٹی کے رشتوں اور خون و گوشت کے رابطوں سے نجات دے کر اُسے اعلیٰ وارفع مقام بخشا۔ اسلام کی نظر میں مسلمان کا کوئی وطن نہیں ہے۔ اگر اس کا وطن ہے تو صرف وہ خطۂ زمین

جہاں شریعت الٰہی کا علم لہرا رہا ہو، اور باشندوں کے باہمی روابط تعلق باللہ کی بنیاد پر قائم ہوں۔ اسلام کی نظر میں مسلمان کی کوئی قومیت نہیں ہے۔ اگر اس کی کوئی قومیت ہے تو وہ صرف عقیدہ ہے جس کے تحت وہ دارالاسلام کے اندر بسنے والی جماعت مسلمہ کا ایک رکن بنا ہے۔ مسلمان کی کوئی رشتہ داری اور قرابت نہیں ہے، سوائے اس کے جو ایمان اور عقیدہ کے تقاضے میں وجود میں آتی ہے اور جس کے بعد اُس کے اور اس کے دوسرے دینی ساتھیوں کے درمیان ایک نہایت مضبوط و مستحکم ناطہ وجود میں آجاتا ہے۔ مسلمان کی اپنے ماں، باپ، بھائی، بیوی، اور خاندان کے ساتھ اُس وقت تک کوئی رشتہ داری استوار نہیں ہوسکتی جب تک وہ بنیادی اور اوّلین رشتہ قائم نہ ہو جو سب کو اپنے خالق سے جوڑتا ہے، اور پھر اُسی ربانی رشتہ کی بنیاد پر اُن کے درمیان خونی اور نسلی قرابتیں بھی استوار تر ہو جاتی ہیں:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآئَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ. (نساء:۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔ اُس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو۔

لیکن ربّانی رشتہ اس امر میں مانع نہیں ہے کہ ایک مسلمان اختلاف عقیدہ کے باوجود والدین کے ساتھ معروف کی حد تک اس وقت تک حسنِ سلوک اور حسنِ معاشرت رکھے جب تک وہ اسلامی محاذ کے دشمنوں کی صفوں میں شامل نہ ہوں۔ اگر وہ کفار کی کھلم کھلا حمایت پر اتر آئیں تو ایسی صورت میں مسلمان کی اپنے والدین کے ساتھ کوئی رشتہ داری اور صلہ رحمی کا تعلق باقی نہیں رہتا۔ اور حسنِ معاشرت اور نیک برتاؤ کی تمام پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ عبداللہ بن ابیّ جو رئیس المنافقین تھا اُس کے صاحبزادے حضرت عبداللہ نے اس معاملے میں ہمارے لیے نہایت درخشاں مثال پیش کی ہے:

ابن جریر نے ان زیاد کی سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن ابیؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ کو بلا کر فرمایا: آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا باپ کیا کہہ رہا ہے؟ عبداللہ نے عرض کیا : میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں اُس نے کیا کہا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ کہتا ہے پ اگر ہم مدینہ لوٹ گئے تو وہاں عزت والا ذلت والے کو نکال باہر کرے گا! حضرت عبداللہ نے کہا: اے اللہ کے رسول اللہ کی قسم اُس نے درست کہا ہے، واللہ آپ عزت والے ہیں اور وہی ذلیل ہے۔ یا رسول اللہ! اللہ برتر کی قسم، آپ کی مدینہ تشریف آوری کے وقت اہل یثرب کو معلوم ہے کہ اس شہر میں مجھ سے زیادہ اپنے والد کا فرمانبردار کوئی شخص نہیں تھا۔ اور اب اگر اللہ اور اُس کے رسول کی خوشنودی اس میں ہے کہ میں والد کا سر اُن کی خدمت میں پیش کر دوں تو میں اس کا سر لائے دیتا ہوں۔ جناب رسالت مآب ﷺ نے فرمایا: ''ایسا نہ کرو''۔ چنانچہ جب مسلمان مدینہ پہنچے تو عبداللہ بن ابیؓ کے لڑکے حضرت عبداللہ مدینہ کے باہر اپنے باپ کے سامنے تلوار سونت کر کھڑا ہو گئے۔ اور اس سے کہنے لگے کہ کیا تو نے یہ کہا ہے کہ اگر ہم مدینہ لوٹے تو وہاں کا عزت والا ذلیل لوگوں کو نکال دے گا، اللہ بزرگ کی قسم تجھے ابھی معلوم ہو جائے گا کہ تو عزت والا ہے یا اللہ کے رسول ﷺ۔ اللہ کی قسم جب تک اللہ اور اس کے رسول اجازت نہ دیں، تجھے مدینہ کا سایہ نصیب نہیں ہو سکتا اور تو مدینہ ہرگز پناہ نہیں لے سکتا۔ عبداللہ بن ابیؓ نے چلا کر دو مرتبہ کہا: اے خزرج کے لوگو! دیکھو یہ میرا بیٹا ہی مجھے گھر میں داخل ہونے سے روک رہا ہے۔ حضرت عبداللہ اُس کے شور و ہنگامہ کے باوجود یہی کہتے رہے کہ جب تک رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اذن نہ ہو اللہ کی قسم تجھے ہرگز مدینہ میں قدم نہ رکھنے نہ دُوں گا۔ یہ شور سن کر کچھ لوگ حضرت عبداللہ کے پاس جمع ہو گئے اور انہیں سمجھایا بجھایا۔ مگر وہ اس بات پر مصر رہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے اذن کے بغیر میں اسے مدینہ میں گھسنے نہیں دوں گا۔ چنانچہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور آپ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ آپ ﷺ نے سن کر فرمایا، عبداللہ کے پاس جاؤ اور اُسے کہو: ''اپنے باپ کو گھر آنے سے نہ روکے''! چنانچہ وہ لوگ عبداللہ کے پاس آئے اور انہیں رسول اللہ

ﷺ کے ارشاد سے آگاہ کیا۔حضرت عبداللہ کہنے لگے: اگر اللہ کے نبی کا حکم ہے تو اب یہ داخل ہوسکتا ہے۔

جب عقیدہ وایمان کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے تو اس کے بعد نسب ورحم کے رشتے نہ بھی ہوں تو بھی تمام اہلِ ایمان باہم بھائی بھائی بن جاتے ہیں۔اوران میں وہ مضبوط تر رابطہ وجود میں آجاتا ہے جو انہیں ایک قالب ویک جان بنادیتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انما المؤمنون اخوۃ (تمام اہل ایمان بھائی بھائی ہیں)۔اس مختصر ارشاد میں حصر بھی ہے اور تاکید بھی۔نیز فرمایا:

اِنَّ الَّـذِيْـنَ اٰمَـنُـوْا وَهَـاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ. (انفال:۷۲)

جولوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑا اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔

اس آیت میں جس ولایت کا ذکر کیا گیا ہے وہ صرف ایک ہی وقت میں پائی جانے والی اور ایک ہی نسل تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ آئندہ آنے والی نسلوں تک بھی منتقل ہوتی رہتی ہے، اور امت مسلمہ کے اگلوں اور پچھلوں سے اور پچھلوں کو اگلوں کے ساتھ محبت ومؤدت اور وفاداری وغمگساری اور رحم دلی وشفقت کی ایک مقدس ولازوال لڑی میں پرودیتی ہے:

وَ الَّـذِيْـنَ تَبَـوَّؤُ الـدَّارَ وَ الْاِيْـمَـانَ مِـنْ قَبْـلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَ لَا يَـجِـدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْا مِـنْم بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (حشر:۹-۱۰)

اور جو لوگ مہاجرین کی ہجرت سے پہلے مدینے میں رہتے تھے اور ایمان لا چکے تھے (یعنی انصار) وہ ہجرت کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں اور مالِ غنیمت میں سے مہاجرین کو جو کچھ بھی دے دیا جائے اُس کی وجہ سے یہ اپنے دل میں اُس کی کوئی طلب نہیں پاتے اور خواہ انہیں تنگی ہی کیوں نہ ہو مگر وہ (اپنے مہاجرین بھائیوں کو) ترجیح دیتے ہیں۔ اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو اُن کے بعد آئے وہ یہ دعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو معاف فرما جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں۔ اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کے لیے کوئی کینہ نہ رہنے دے، اے ہمارے پروردگار بے شک تو بڑا شفقت رکھنے والا اور مہربان ہے۔

ہر دور میں عقیدہ ہی بنائے جمع وتفریق تھا

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب حکیم میں مومنین کے سامنے انبیائے سابقین کی برگزیدہ جماعت کی متعدد مثالیں اور قصے بیان فرمائے ہیں۔ ان انبیاء علیہم السلام نے مختلف ادوار میں ایمان کی قندیلیں فروزاں کیں ، اور ایمان وعقیدہ کے نورانی قافلوں کی قیادت فرمائی۔ ان مثالوں میں اللہ تعالیٰ نے واضح کیا ہے کہ ہر نبی کی نگاہ میں اصل رشتہ اسلام اور عقیدہ کا رشتہ تھا۔ ان کے مقابلے میں کوئی اور رشتہ اور قرابت داری کسی لحاظ سے بھی نافع ثابت نہیں ہوسکتی۔

وَ نَادٰی نُوۡحٌ رَّبَّہٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَہۡلِیۡ وَ اِنَّ وَعۡدَکَ الۡحَقُّ وَ اَنۡتَ اَحۡکَمُ الۡحٰکِمِیۡنَ ۝ قَالَ یٰنُوۡحُ اِنَّہٗ لَیۡسَ مِنۡ اَہۡلِکَ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیۡرُ صَالِحٍ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ اِنِّیۡۤ اَعِظُکَ اَنۡ تَکُوۡنَ مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِکَ اَنۡ اَسۡـَٔلَکَ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِہٖ عِلۡمٌ وَ اِلَّا تَغۡفِرۡ لِیۡ وَ تَرۡحَمۡنِیۡۤ اَکُنۡ

مِّنَ الۡخٰسِرِیۡنَ۝ (ھود:٤٥-٤٧)

اور نوح (علیہ السلام) نے اپنے رب کو پکارا۔ کہا اے رب میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تُو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے۔ جواب میں ارشاد ہوا اے نوح: وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے۔ لہٰذا تو اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر جس کی حقیقت تو نہیں جانتا میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنالے۔ نوح نے فوراً عرض کیا :اے میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا۔

وَ اِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰھٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ قَالَ لَا یَنَالُ عَھۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ. (بقرہ:١٢٤)

اور یاد کرو جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ اُن سب میں پورا پورا اتر گیا۔ تو اس نے کہا: ''میں تجھے لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں'' ابراہیم نے عرض کیا: اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے۔ اس نے جواب دیا: میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔

وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰھٖمُ رَبِّ اجۡعَلۡ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارۡزُقۡ اَھۡلَہٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنۡ اٰمَنَ مِنۡھُمۡ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ قَالَ وَ مَنۡ کَفَرَ فَاُمَتِّعُہٗ قَلِیۡلًا ثُمَّ اَضۡطَرُّہٗۤ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ. (بقرہ:١٢٦)

اور جب ابراہیم نے دعا کی: اے میرے رب! اس شہر کو امن کا شہر بنادے، اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں، انہیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے، اللہ نے فرمایا: اور جو نہ مانے دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اُسے بھی

دُوں گا، مگر آخر کار اُسے عذاب جہنم کی طرف گھسیٹوں گا اور وہ بدترین ٹھکانہ ہے۔

وَ اَعۡتَزِلُکُمۡ وَ مَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ اَدۡعُوۡا رَبِّیۡ عَسٰۤی اَلَّاۤ اَکُوۡنَ بِدُعَآءِ رَبِّیۡ شَقِیًّا. (مریم:٤٨)

میں آپ لوگوں کو چھوڑتا ہوں اور اُن ہستیوں کو بھی جنہیں آپ لوگ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا، امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ رہوں گا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر کرتے ہوئے اُن پہلوؤں کو مومنین کے سامنے خاص طور پر پیش کیا ہے جن میں مومنین کو ان کے نقشِ قدم چلنا چاہیے۔ فرمایا:

قَدۡ کَانَتۡ لَکُمۡ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیۡۤ اِبۡرَاھِیۡمَ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِھِمۡ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡکُمۡ وَ مِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ کَفَرۡنَا بِکُمۡ وَ بَدَا بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمُ الۡعَدَاوَۃُ وَ الۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَحۡدَہٗۤ. (ممتحنۃ:٤)

بے شک تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھی بہترین نمونہ ہیں جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے دوٹوک کہہ دیا کہ ہم کو تم سے اور جن کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو اُن سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم تمہارے (معبودوں اور عقیدوں) کو بالکل نہیں مانتے اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لیے کھلم کھلا عداوت اور دشمنی قائم ہوگئی ہے یہاں تک کہ تم صرف اللہ پر ایمان لے آؤ۔

وہ جواں ہمت اور جواں سال رفقاء جو اصحاب کہف کے لقب سے مشہور ہیں جب انہوں نے دیکھا کہ دین وعقیدہ کی متاعِ گراں بہا کے لیے ان کے وطن، ان کے اہل وعیال اور ان کے خاندان وقبیلہ میں کوئی گنجائش نہیں رہی تو وہ اپنے اہل وعیال کو خیرباد کہہ کر اپنی قوم سے کنارہ کش ہوگئے، وہ اپنے وطن سے ہجرت کر گئے اور متاعِ ایمان کو لے کر اپنے پروردگار کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تاکہ وہ دین

وایمان کی بنیاد پر صرف ایک اللہ کے بندے بن کر رہ سکیں:

اِنَّھُمۡ فِتۡیَۃٌ اٰمَنُوۡا بِرَبِّھِمۡ وَ زِدۡنٰھُمۡ ھُدًی ۝ وَّ رَبَطۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِھِمۡ اِذۡ قَامُوۡا فَقَالُوۡا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَنۡ نَّدۡعُوَا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اِلٰـھًا لَّقَدۡ قُلۡنَاۤ اِذًا شَطَطًا ۝ ھٰۤـؤُلَآءِ قَوۡمُنَا اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِھَۃً لَوۡ لَا یَاۡتُوۡنَ عَلَیۡھِمۡ بِسُلۡطٰنٍۭ بَیِّنٍ فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا ۝ وَ اِذِ اعۡتَزَلۡتُمُوۡھُمۡ وَ مَا یَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ فَاۡوٗۤا اِلَی الۡکَھۡفِ یَنۡشُرۡ لَکُمۡ رَبُّکُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِہٖ وَیُھَیِّیٔۡ لَکُمۡ مِّنۡ اَمۡرِکُمۡ مِّرۡفَقًا ۝ (الکھف:۱۳-۱۶)

وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔ہم نے اُن کے دل اُس وقت مضبوط کر دیے تھے جب وہ اُٹھے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے۔ہم اُسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے (پھر انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا) یہ ہماری قوم تو رب کائنات کو چھوڑ کر دوسرے الٰہ بنا بیٹھی ہے۔یہ لوگ اپنے اس عقیدے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ آخر اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوسکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ جب کہ تم ان سے اور ان کے معبودانِ غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو۔تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے لیے سروسامان مہیا کرے گا۔

حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیویوں کا ذکر قرآن میں آتا ہے۔ان برگزیدہ پیغمبروں اور ان کی بیویوں کے درمیان صرف اس بنا پر تفریق ہو جاتی ہے کہ ان کی بیویوں کا عقیدہ خاوندوں کے عقیدہ سے جُدا تھا۔اور وہ آلودۂ شرک تھیں:

ضَـرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً لِّلَّـذِیْـنَ کَـفَـرُوا امْـرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ کَانَتَا تَحْتَ عَبْـدَیْـنِ مِـنْ عِبَـادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰهُمَ فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا وَّ قِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ. (تحریم:۱۰)

کافروں کی عبرت کے لیے اللہ نوح (علیہ السلام) کی عورت اور لوط (علیہ السلام) کی عورت کی مثال دیتا ہے۔ یہ دونوں عورتیں ہمارے بندوں میں سے دو بندوں کے نکاح میں تھیں۔ ان دونوں نے ان سے خیانت کی مگر اللہ کی گرفت سے دونوں کے شوہران کو بچا نہ سکے اور دونوں عورتوں کو حکم دیا گیا کہ جاؤ دوسرے لوگوں کے ساتھ تم بھی جہنم میں داخل ہو جاؤ۔

ساتھ ہی جابر وسرکش فرمانروا فرعون مصر کی بیوی کی مثال بیان کی گئی ہے اور اہلِ ایمان کے لیے اُسوہ کے طور پر اُس کا ذکر کیا گیا ہے:

وَ ضَـرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً لِّلَّـذِیْنَ اٰمَنُوا اِمْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًـا فِـی الْـجَـنَّةِ وَ نَـجِّـنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ. (تحریم:۱۱)

اور اہلِ ایمان کی نصیحت کے لیے اللہ فرعون کی بیوی کی مثال بیان کرتا ہے جب کہ اُس نے دُعا کی: اے میرے پروردگار! میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا اور مجھ کو فرعون اور اُس کے کردار بد سے نجات دے اور مجھے ظالم لوگوں سے بھی نجات دے۔

علی ہذا القیاس اس قرآن نے ہر نوعیت کے رشتوں اور قرابتوں کے بارے میں مختلف مثالیں بیان کی ہیں۔ نوح علیہ السلام کے قصہ میں رشتۂ پدری کی مثال ملے گی، حضرت براہیم علیہ السلام کے قصے میں بیٹے اور وطن کے رشتے کی مثال بیان کی گئی ہے، اصحاب کہف کے قصے میں اعزّہ وا قارب قبیلہ و برادری اور وطن

وقوم کے رشتہ کی جامع مثال پیش کی گئی ہے، حضرت نوح اور لوط علیہما السلام کے قصے اور فرعون کے تذکرے میں ازدواجی تعلق کی مثال دی گئی ہے۔ قرآن کی نظر میں یہ تمام رشتے عقیدہ وایمان کے ابدی رشتہ اور سرمدی رابطہ کے انقطاع کے بعد نا قابلِ لحاظ قرار پاتے ہیں۔

قومِ رسول ہاشمی کی بنائے ترکیب

جب انبیاء کی برگزیدہ جماعت روابط وتعلقات اور رشتوں اور برادریوں کا حقیقی پیمانہ اور پاکیزہ تصور پیش کر چکتی ہے تو امت وسط کی باری آتی ہے۔ چنانچہ امت وسط کے اندر بھی اس نوعیت کی مثالوں اور نمونوں اور تجربوں کا وسیع اور ایمان افروز ذخیرہ ملتا ہے۔ یہ امت بھی اُسی ربّانی راستے پر گامزن نظر آتی ہے جو ازل سے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے گروہ کے لیے منتخب وپسند فرمایا ہے۔ اس امت کے اندر بھی آپ دیکھیں گے کہ جب رشتۂ ایمان ٹوٹ جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب انسان اور انسان کے درمیان اوّلین رشتہ منقطع ہو جاتا ہے تو ایک ہی خاندان اور قبیلے کے لوگ جُدا جُدا گروہوں میں بٹ جاتے ہیں، بلکہ ایک ہی گھر کے مختلف افراد میں جُدائی واقع ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْآ اٰبَآءَ هُمْ اَوْ اَبْنَآءَ هُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَ يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (المجادلة:٢٢)

جو لوگ اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں تُو انہیں ان لوگوں سے دوستی کرتے نہ پائے گا جو اللہ اور اُس کے رسول کے دشمن ہیں گو وہ اُن کے باپ، یا بیٹے یا بھائی یا

اہلِ قبیلہ ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ (اہلِ ایمان) وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کے اندر اللہ نے ایمان نقش کر دیا ہے اور فیضانِ غیبی سے اُن کی تائید کی ہے۔اور وہ ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔اللہ اُن سے خوش اور اللہ سے خوش۔ یہ اللہ کا گروہ ہے۔اور آگاہ رہو کہ اللہ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے۔

ایک طرف محمد ﷺ اور آپ کے چچا ابولہب اور آپ کے ہم قبیلہ عمرو بن ہشام (ابوجہل) کے درمیان تمام خونی اور نسلی رشتے ٹوٹ جاتے ہیں،مہاجرین مکہ اپنے اہل واقربا کے خلاف برسر جنگ نظر آتے ہیں اور معرکۂ بدر میں ان کے خلاف صف آراء ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف مکہ کے ان مہاجرین کے درمیان اور یثرب کے انصار کے درمیان عقیدہ کا سرمدی رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔اور وہ سگے بھائی بن جاتے ہیں اور خونی اور نسلی رشتے سے بھی زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔ یہ رشتہ مسلمانوں کی ایک نئی برادری کو جنم دیتا ہے اس برادری میں عرب بھی شامل ہیں اور غیر عرب بھی۔روم کے صہیب بھی اس کے رکن ہیں اور حبش کے بلال اور فارس کے سلمان بھی ان کے درمیان قبائلی عصبیت مٹ جاتی ہے ۔نسلی تعصب وتفاخر ختم ہو جاتا ہے۔وطن وقوم کے نعرے تحلیل ہو جاتے ہیں اور اللہ کا پیغمبر اُن سب سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

❁ دعوھا فانھا منتنة. (ان عصبیتوں سے دست بردار ہو جاؤ یہ متعفن لاشیں ہیں)

❁ لیس منا من دعا الی عصبیة ، ولیس منّا من قاتل علی عصبیة، ولیس منّا من مات علی عصبیة. (جو کسی جاہلیت کی طرف دعوت دیتا ہے وہ ہم میں سے نہیں، جو عصبیت کے لیے جنگ کرتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ہیں جو عصبیت پر مرتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے)

دارالاسلام اور دارالحرب

الغرض ان مردار و متعفن عصبیتوں کا چلن ختم ہو گیا۔ نسبی تعصب کا مردار لاشہ دفن کر دیا گیا، نسلی برتری کا جاہلی نعرہ پاؤں تلے روندا ڈالا گیا، قومی گھمنڈ کی گندگی زائل کر دی گئی اور اُس کا نام ونشان تک باقی نہ رہا۔ اور انسان نے گوشت اور خون کے تعفن اور زمین و وطن کے لوث سے آزاد ہو کر آفاق عالم کے عطر بیز چمنستان میں مشام جان کو معطّر کیا۔ اس دن سے مسلمان کا وطن جغرافیائی حدود اربعہ میں محدود نہیں رہا بلکہ پورا دارالاسلام اس کا وطن ٹھیرا۔ وہ وطن جہاں عقیدہ و ایمان کی حکمرانی ہوتی ہے، اور صرف شریعت الٰہی کا سکہ رواں ہوتا ہے۔ یہی وطن مسلمان کی پناہ گاہ بنا، اسی کی مدافعت کے لیے وہ کمر بستہ رہا اور اسی کے تحفظ و استحکام میں اُس نے جان کا نذرانہ پیش کیا اور اُس کی توسیع و اضافہ میں اُس نے جام شہادت نوش کیا۔ یہ دارالاسلام ہر اُس شخص کا مامَن ہے جو عقیدۂ اسلام کا قلادہ گلے میں ڈال لیتا ہے، اور شریعت اسلامی کو قانون زندگی کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے، وہ شخص بھی اس پناہ گاہ سے استفادہ حاصل کر سکتا ہے جو مسلمان تو نہیں مگر اسلامی شریعت کو نظام ریاست کی حیثیت سے قبول کرتا ہے۔ جیسا کہ ان اہلِ کتاب کا معاملہ ہے جو دارالاسلام کے اندر بود و باش رکھتے ہیں۔ مگر وہ سرزمین جس پر اسلام کی حکمرانی کا پھریرا نہ لہراتا ہو اور شریعتِ الٰہی کو نافذ نہ کیا جاتا ہو وہ مسلمان کے لیے بھی اور دارالاسلام کے معاہد ذمی کے لیے بھی دارالحرب ہے۔ مسلمان اس کے خلاف شمشیر بکف رہے گا خواہ وہ اُس کی جنم بھومی ہو، اُس سے اُس کے نسبی اور سسرالی رشتے وابستہ ہوں، اس کے اموال و املاک اُس میں موجود ہوں اور اُس کے مادّی مفادات اُس سے وابستہ ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ کے خلاف تلوار اُٹھائی حالانکہ مکہ آپ ﷺ کا پیدائشی اور آبائی وطن تھا۔ وہیں آپ ﷺ کے اعزّہ و اقارب اور خاندان کے لوگ رہتے تھے، آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کے مکانات اور جائدادیں بھی وہیں تھیں۔ جنہیں آپ ﷺ ہجرت کے وقت وہاں چھوڑ آئے تھے۔ مگر مکہ کی سرزمین اللہ کے رسول ﷺ کے لیے اور ان

کی امت کے لیے اُس وقت تک دارالاسلام نہ بن سکی جب تک وہ اسلام کے آگے سرنگوں نہیں ہوگئی اور شریعت کے عزّا کے ہاتھ اقتدار کی مسند نہیں آ گئی۔

اسی کا نام اسلام ہے، یہی نرالا تصور زندگی اسلام کہلاتا ہے، اسلام چند اشلوکوں کا نام نہیں ہے کہ بس انہیں زبان سے دُہرا دینا ہی کافی ہو، اور نہ کسی مخصوص سرزمین کے اندر جس پر اسلام کا بورڈ چسپاں ہو یا جو اسلامی نام سے پکاری جاتی ہو پیدا ہونے سے کسی آدمی کو خود بخود اسلام کا سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے، اور نہ مسلمان والدین کے گھر میں پیدا ہونے سے وراثت میں مل جاتا ہے۔

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا. (نساء:٦٥)

نہیں اے محمد، تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہوسکتے۔ جب تک اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی بھی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربسر تسلیم کرلیں۔

صرف اسی کا نام اسلام ہے، اور صرف وہی سرزمین دارالاسلام ہے جہاں اس کی حکومت ہو۔ یہ وطن ونسل، نسب وخون اور قبیلہ وبرادری کی حدبندیوں سے بالا وبرتر ہے۔

اسلام وطن اور اس کے دفاع کا اصل محرّک

اسلام نے آکر انسان کو ان تمام زنجیروں سے رہا کیا جنہوں نے اُسے زمین کی پستی سے باندھ رکھا تھا، تاکہ انسان آسمان کی پہنائیوں میں پرواز کے قابل ہوسکے۔ خون ونسب کے تمام سفلی طوق وسلاسل پاش پاش کردے تاکہ انسان آزاد ہوکر بلندترین فضاؤں میں پرواز کرسکے۔ اسلام نے بتایا کہ مسلمان کا وطن زمین کا کوئی مخصوص خطہ نہیں ہے جس کی محبت میں اُسے تڑپنا چاہیے اور جس کے دفاع میں اُسے جان کی بازی لگانی چاہیے، مسلمان کی قومیت جس سے وہ متعارف ہوتا ہے کسی حکومت کی

عطا کردہ نیشنلٹی نہیں ہے، مسلمان کی برادری جس کی وہ پناہ لیتا ہے اور جس کی خاطر لڑتا اور مرتا ہے وہ خون کے رشتہ سے ترکیب نہیں پاتی۔ مسلمان کا پرچم جس پر وہ ناز کرتا ہے اور جس کو اُونچا رکھنے کے لیے وہ جان تک کی بازی لگا دیتا ہے وہ کسی قوم کا پرچم نہیں ہے، مسلمان کی فتح یابی جس کے لیے وہ بے تاب رہتا ہے اور جس سے ہمکنار ہونے پر وہ اللہ کے سامنے سجدہ شکر ادا کرتا ہے، وہ محض فوجی غلبہ نہیں ہے بلکہ وہ فتح حق ہے جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَ الۡفَتۡحُ ۞ وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۞
فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَ اسۡتَغۡفِرۡهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۞ (سورۂ النصر)

جب آ گئی اللہ کی مدد اور فتح۔ اور تُو نے دیکھ لیا لوگوں کو اللہ کے دین میں فوج درفوج داخل ہوتے۔ سوتُو اپنے ربّ کی حمد کی تسبیح کر اور اُس سے استغفار کر، بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

یہ فتح یابی صرف پرچمِ ایمان کے تحت حاصل ہوتی ہے دوسرے کسی جھنڈے کی عصبیت اس میں شامل نہیں ہوتی، یہ جہاد دین اللہ کی نصرت اور شریعتِ حقہ کی سربلندی کے لیے کیا جاتا ہے، کسی اور مقصد اور مفاد کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ یہ اُ دارالاسلام کا دفاع ہے جس کی شرائط وخصائص ہم اُوپر بیان کر آئے ہیں، اس دفاع میں کسی اور وطنی اور قومی تصور کی آمیزش نہیں کی جاسکتی۔ فتح یابی کے بعد فاتح فوج کی تمام تر توجہ، دلچسپی اور انہماک کا مرکز مالِ غنیمت کا حصول نہیں ہوتا، اور نہ یہ جنگ کسی دنیاوی شہرت یا ناموری کے لیے لڑی جاتی ہے، بلکہ اس کا مقصد خالصتاً اللہ کی رضا ہوتا ہے اور اللہ کی رضا جوئی اور اس کی تسبیح اور استغفار اس کا اصل مقصود ہے۔ یہ جنگ وطنی حمیت اور قومی عصبیت کی بنیاد پر بھی نہیں لڑی جاتی نہ اہلِ وعیال کا تحفظ اس کی اصل غرض اور محرّک ہوتا ہے۔ البتہ ان کے تحفظ اور حمایت کا جذبہ اگر اس بنا پر شامل ہو کہ ان کے دین وایمان کو فتنہ وآزمائش سے بچایا جائے، تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص بہادری

دکھانے کے لیے لڑتا ہے، دوسرا حمیت کی خاطر لڑتا ہے اور تیسرا ریا کے لیے لڑتا ہے ان میں سے کون سا اللہ کی راہ میں لڑتا ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: جو اس لیے لڑتا ہے کہ صرف اللہ کا کلمہ بلند ہو صرف وہ اللہ کی راہ میں لڑتا ہے۔

شہادت کا مرتبہ صرف اس جنگ جوئی کے نتیجے میں نصیب ہوسکتا ہے جو صرف اللہ کی خاطر ہو۔ دوسرے مقاصد کی خاطر جو قتال آرائی ہوگی اُس میں یہ مرتبہ بلند حاصل نہ ہوگا۔

جو ملک مسلمان کے عقیدہ وایمان سے برسرِ پیکار ہو، دینی امور کو سرانجام دینے میں اُس سے مانع ہو اور اتباعِ شریعت کو معطل کر رکھا ہو وہ دارالحرب شمار ہوگا، چاہے اس میں اُس کے اعزّہ واقارب اور خاندان اور قبیلہ کے لوگ بستے ہوں، اس میں اُس کا سرمایہ لگا ہو، وراس کی تجارت وخوش حالی اُس سے وابستہ ہو، اس کے مقابلے میں ہر وہ خطہ ارض جس میں مسلمان کے عقیدہ کو فروغ وغلبہ حاصل ہو۔ اللہ کی شریعت کی عملداری ہو وہ دارالاسلام کہلائے گا خواہ اُس میں مسلمان کے اہل وعیال کی بود وباش نہ ہو، اُس کے خاندان اور قبیلہ کے لوگ وہاں نہ رہتے بستے ہوں اور اُس کی کوئی تجارت اور مادی منفعت اُس سے وابستہ نہ ہو''وطن'' اسلامی اصطلاح میں اُس دیار کا نام ہے جس میں اسلام کے عقیدہ کی حکمرانی ہو، اسلامی نظامِ حیات قائم اور برپا ہو اور شریعتِ الٰہی کو برتری حاصل ہو۔ وطن کا یہی مفہوم انسانیت کے مرتبہ و مذاق کے مطابق ہے۔ اسی طرح قومیت اسلام کی رُو سے عقیدہ اور نظریۂ حیات سے عبارت ہے، اور آدمیت کے شرف وفضل کے ساتھ جو رابطہ اور رشتہ مناسبت رکھتا ہے وہ یہی تصورِ قومیت ہوسکتا ہے۔

قومی اور نسلی نعرے جاہلیت کی سڑاند ہیں

رہی قبیلہ وبرادری اور قوم ونسل اور رنگ ووطن کی عصبیت اور دعوت تو نہ صرف یہ دعوت تنگ نظری، تنگ دامانی اور محدود الاثر ہے بلکہ انسانی پس ماندگی اور دورِ وحشت کی یادگار ہے، یہ جاہلی عصبیت ان ادوار

میں انسان پر مسلط ہوئی تھی جب اُس کی روح انحطاط اور پستی کا شکار تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے ''سڑاند'' سے تعبیر فرمایا ہے، ایسا مردار جس سے عفونت کی لپٹیں اُٹھ رہی ہوں۔ اور انسان کا ذوق نفیس کرب وکراہت محسوس کر رہا ہو۔

جب یہود نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ نسلی اور قومی بنیاد پر اللہ کی محبوب اور چہیتی قوم ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اُن کا یہ دعویٰ اُن کے منہ پر دے مارا اور ہر دَور میں ہر نسل اور قوم کے لیے اور ہر جگہ کے لوگوں کے لیے بزرگی اور تقرب الٰہی اور شرف وفضیلت کا صرف ایک ہی معیار بتایا اور وہ ہے ایمان باللہ۔ ارشاد ہوا۔

وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝ (البقرة:۱۳۵-۱۳۷)

یہودی کہتے ہیں: یہودی ہو جاؤ تو راہِ راست پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں: عیسائی ہو جاؤ تو ہدایت ملے گی۔ ان سے کہو: نہیں بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیم کا طریقہ اختیار کو اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا۔ مسلمانو! کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔ پھر اگر وہ اُسی طرح ایمان لائیں جو طرح تم لائے ہو، تو ہدایت پر

ہیں ،اور اگر اس سے منہ پھیریں ،تو کھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں ۔لہٰذا اطمینان رکھو کہ اُن کے مقابلے میں اللہ تمہاری حمایت کے لیے کافی ہے۔وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔اللہ کا رنگ کا اختیار کرو۔اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟ اور ہم اُسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔

اللہ کی محبوب اور برگزیدہ اور پسندیدہ قوم درحقیقت وہ امت مسلمہ ہے جو نسلی اور قومی اختلاف ،رنگ وروپ کی بوقلمونی اور وطن وملک کی مفارقت ک باوجود صرف اللہ کے پرچم کے نیچے مجتمع اور متحد ہوتی ہے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ. (آل عمران:۱۱۰)

تم وہ بہترین گروہ ہے جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہواور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

یہ وہ اللہ پرست اُمت ہے جس کے ہراول دستہ کی شان یہ تھی کہ اس میں عرب کے معزّز خاندان کے چشم وچراغ ابوبکر شامل تھے تو حبش کے بلال اور روم کے صہیب اور فارس کے سلمان بھی موجود تھے ۔بعد کی نسلیں بھی ہر دَور میں اِسی دل نشین انداز اور حیرت زا نظام کے جلو میں یک بعد دیگرے منصۂ شہود پر اُبھرتی رہیں۔عقیدۂ توحید اس امت کی قومیت رہی ہے، دارالاسلام اس کا وطن رہا ہے، اور اللہ کی حاکمیت اس کا امتیازی شعار رہا ہے اور قرآن اس کا دستورِ حیات رہا ہے۔

وطن وقوم عصبیتیں منافیٔ توحید ہیں

وطن وقومیت اور قرابت کا یہ پاکیزہ وارفع تصور آج داعیانِ حق کے دلوں پر پوری طرح نقش ہونا چاہیے ۔اور اس وضاحت اور درخشندگی کے ساتھ اُن کے دل ودماغ کے ریشے ریشے میں اُتر جانا چاہیے کہ اس

میں جاہلیت کے بیرونی تصورات کا شائبہ تک موجود نہ ہو اور شرک خفی کی کوئی قسم اس میں راہ نہ پا سکے ۔ ہر قسم کے شرک سے خواہ وہ وطن پرستی ہو، یا نسل پرستی ،قوم پرستی ، دنیا کے گھٹیا مفادات اور منفعتوں کی پرستش ہو، ان سب سے یہ تصور پاک وشفاف ہے ۔شرک کی یہ سب قسمیں اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں جمع کردی ہیں اور ایک پلڑے میں ان سب کو رکھا ہے اور دوسرے میں ایمان اور اُس کے تقاضوں کو رکھ دیا ہے اور پھر انسان کو اس بات کی چھٹی دے دی ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کس پلڑے کو ترجیح دیتا ہے:

> قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ نِاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ. (التوبة:٢٤)
>
> اے نبی! کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز واقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اُس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔

اسی طرح داعیانِ حق اور اسلامی تحریک کے علمبرداروں کے دلوں میں جاہلیت اور اسلام کی حقیقت اور دارالحرب اور دارالاسلام کی تعریف کے بارے میں سطحی قسم کے شکوک وشبہات پیدا نہیں ہونے چاہئیں ۔دراصل ایسے شکوک وشبہات کے راستے ہی سے ان میں اکثر کے اسلامی تصور اور یقین واذعان پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔ورنہ یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہے کہ جس ملک پر اسلامی نظام کی حکمرانی نہ

ہواور اِسلامی شریعت قائم نہ ہواس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات بھی محتاج تشریح نہیں کہ کوئی ایسا ملک دارالاسلام نہیں ہوسکتا جس میں اسلام کے لائے ہوئے طرز زندگی اور قانون حیات کو اقتدار حاصل نہ ہو۔ ایمان کو چھوڑ کر انسان کفر ہی کے نرغے میں جا تا ہے۔ جہاں اسلام نہ ہوگا وہاں لازماً جاہلیت کا چلن ہوگا اور حق سے روگردانی کے بعد اُسے گمراہی اور ضلالت کے سوا کچھ نہ نصیب ہوگا۔

باب دھم

دُوررس تبدیلی کی ضرورت

ہم اسلام کو کیسے پیش کریں

جب ہم لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کریں تو چاہے ہمارے مخاطب مسلمان ہوں یا غیر مسلم بہر حال ایک بدیہی حقیقت سے ہمیں پوری طرح باخبر رہنا چاہیے، اور یہ وہ حقیقت ہے جو خود اسلام کے مزاج اور فطرت کا نتیجہ ہے، اور اسلام کی تاریخ اس کا ثبوت فراہم کر رہی ہے۔ مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

اسلام اس زندگی اور کائنات کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ ایک نہایت درجہ جامع اور منفرد تصور ہے، اور امتیازی اوصاف کا حامل ہے۔ اس تصور سے انسانی زندگی کا جو نظام ماخوذ ہوتا ہے وہ بھی اپنے تمام اجزائے ترکیبی سمیت اپنی ذات میں ایک مستقل اور کامل نظام ہے اور مخصوص امتیازات سے بہرہ مند ہے۔ یہ تصور بنیادی طور پر اُن تمام جاہلی تصورات سے متصادم ہے جو قدیم زمانے میں رائج رہے ہیں یا دَورِ حاضر میں پائے جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تصور بعض سطحی اور ضمنی جزئیات اور تفصیلات میں جاہلی تصورات سے کبھی کبھار اتفاق کرے لیکن جہاں تک ان اصولوں اور ضابطوں کا سوال ہے جن سے یہ جزوی اور ضمنی پہلو برآمد ہوتے ہیں تو وہ ان تمام نظریات وتصورات سے مختلف اور بالکل جدا ہیں جو انسانی تاریخ کے اندر اب بھی رائج اور فروغ پذیر رہے ہیں۔ چنانچہ اسلام کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ ایک انسانی زندگی کی تشکیل کرتا ہے جو اُس کے تصور کی صحیح نمائندہ اور اس کی عملی تفسیر ہو۔ وہ

دنیا کے اندر ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ طریقہ حیات کی تصویر ہوتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو دنیا کے اندر اٹھایا ہی اس غرض کے لیے ہے کہ وہ الٰہی طریقۂ زندگی کی ترجمان بن کر رہے اور اُسے دنیا کے سامنے عمل کی زبان سے پیش کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ. (آل عمران: ١١٠)

تم وہ بہترین گروہ ہو جسے انسانوں کے لیے اٹھایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

اس امت کی وہ یہ صفت بیان کرتا ہے کہ:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ. (الحج: ٤١)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں تو یہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بُرائی سے روکیں گے۔

اسلام کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ دنیا کے اندر قائم شدہ جاہلی تصورات کے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار کرے یا جاہلی نظاموں اور جاہلی قوانین سے بقائے باہم کے اصول پر معاملہ کرے۔ یہ موقف اسلام نے اُس روز بھی نہیں اختیار کیا تھا جس روز اُس نے دنیا میں قدم رکھا تھا، اور نہ آج یہ اُس کا موقف ہوسکتا ہے اور نہ آئندہ کبھی یہ امید ہے کہ اس موقف کو وہ اپنائے گا۔ جاہلیت خواہ کسی دَور سے تعلق رکھتی ہو وہ جاہلیت ہی ہے۔ اور وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی بندگی سے انحراف اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظامِ زندگی سے بغاوت ہے۔ وہ ناخداشناس مآخذ سے زندگی کے قوانین وشرائع، قواعد واصول، عادات وروایات اور اقدار ومعیارات اخذ کرنے کا نام ہے۔ اس کے برعکس اسلام اللہ کے سامنے سرافگندگی کا نام ہے ۔اسلام کسی دور اور کسی حالت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ہر دَور کے لیے ہے اور ہر حالت کے

لیے نافع ہے۔اس کا مشن انسانوں کو جاہلیت کی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانا ہے ۔زیادہ واضح الفاظ میں جاہلیت یہ ہے کہ انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کی بندگی کریں۔یعنی کچھ انسان غالب و برتر بن کر دوسرے انسانوں کے لیے منشائے الٰہی سے ہٹ کر قانون سازی کریں اور انہیں اس سے بحث نہ ہو کہ قانون سازی کے اختیارارت کس شکل میں استعمال کیے گئے ہیں۔اور اسلام یہ ہے کہ تمام انسان صرف اللہ واحد کی بندگی کریں۔اپنے تمام تصورات وعقائد،قوانین وشرائع اور اقدار حیات اور ردّ وقبول کے معیار اللہ سے حاصل کریں اور مخلوق کی عبودیت سے آزاد ہو کر ہمہ تن خالق کی بندگی کے لیے یکسو ہو جائیں۔

یہ حقیقت خود اسلام کی فطرت کا تقاضا ہے اور اسلام کے اُس کردار سے عیاں ہوتی ہے جو دنیا کے اندر اُس نے انجام دیا ہے یا انجام دینا چاہتا ہے۔یہی حقیقت ہمیں ان تمام انسانوں کے سامنے جنہیں ہم اسلام کی دعوت پیش کریں،وہ خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم یکساں طور پر واضح کر دینی چاہیے۔

اسلام اور جاہلیت میں ہرگز مصالحت نہیں ہوسکتی

اسلام جاہلیت کے ساتھ نیمے دروں نیمے بروں نوعیت کی کوئی مصالحت قبول نہیں کرتا۔معاملہ خواہ اس کے قصور اور نظریہ کا ہو اور خواہ ااس تصور اور نظریہ پر مرتب ہونے والے قوانین حیات کا،اسلام رہے گا ،یا جاہلیت رہے گی۔تیسری ایسی کوئی شکل جس میں آدھا اسلام ہو اور آدھی جاہلیت اسلام کو قبول یا پسند نہیں ہے۔اس معاملے میں اسلام کا نقطۂ نگاہ بالکل واضح اور روشن ہے۔وہ یہ کہتا ہے کہ حق ایک ایسی اکائی ہے جس کا تجزیہ نہیں ہوسکتا۔حق نہ ہوگا تو لازماً باطل ہوگا۔حق اور باطل دونو ں میں اختلاط وامتزاج اور بقائے باہم محال ہے۔حکم یا اللہ کا چلے گا،یا جاہلیت کا۔اللہ کی شریعت کا سکہ رواں ہوگا یا پھر ہوائے نفس کی عملداری ہوگی۔اس حقیقت کو قرآن نے بکثرت آیات میں بیان کیا ہے:

وَ اَنِ احۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ وَ احۡذَرۡہُمۡ اَنۡ یَّفۡتِنُوۡكَ

عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ. (المائدہ:۴۹)

(پس اے محمد ﷺ!) آپ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کریں۔اوران کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔ان سے ہوشیار رہیں کہ کہیں یہ لوگ آپ کو فتنہ میں ڈال کر اُس ہدایت کے کچھ حصے سے منحرف نہ کردیں جواللہ نے آپ کی طرف نازل کی ہے۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ هُمْ. (شوریٰ:۱۵)

پس اس طرف دعوت دیں ۔اوراس پر جمے رہیں جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے ۔اوران کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَ هُمْ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَواهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ. (القصص:۵۰)

اور اگر آپ کے مطالبے کا جواب نہ دیں تو جان لو کہ یہ لوگ اپنی خواہشات کے پیروکار ہیں ۔اوراس شخص سے بڑھ کر گمراہ کون ہوسکتا ہے جس نے اپنی خواہش کی پیروی کی اور اللہ کی ہدایت کی پرواہ نہ کی ۔بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ۝ (الجاثیۃ:۱۸-۱۹)

اے نبی ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے۔لہٰذا تم اُسی پر چلواوران لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے ۔یہ اللہ کے سامنے تمہارے کچھ کام نہ آئیں گے۔اور بے شک ظالم ایک دوسرے کے

رفیق ہیں اور اللہ پرہیز گاروں کا دوست ہے۔

اَفَحُکْمُ الْجَاهِلِیَّةِ یَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُکْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ.

(المائدة: ٥٠)

پس کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

ان آیات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ صرف دو ہی راہیں ہیں، تیسری کوئی راہ نہیں ہے۔ یا تو اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر سر تسلیم خم کرنا ہوگا۔ اور یا بصورت دیگر خواہش نفس کی پیروی ہوگی، اللہ کا فیصلہ تسلیم کرنا ہوگا یا جاہلیت کے سر افگندگی۔ اگر اللہ کے نازل کردہ قانون کو بنائے فیصلہ نہ ٹھیرایا جائے گا تو طبعی طور پر یہ احکام الٰہی سے اعراض وانکار ہوگا۔ کتاب اللہ کے مذکورہ بالا واضح بیانات کے بعد کسی بحث ومجادلہ اور حیلہ جوئی کی گنجائش نہیں ہے۔

اسلام کا اصل مشن

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دنیا کے اندر اسلام کا فرض اولین یہ ہے کہ جاہلیت کو انسانی قیادت کے منصب سے ہٹا کر زمام قیادت خود اپنے ہاتھ میں لے اور اپنے مخصوص طریقِ حیات کو جو مستقل اور جُدا گانہ اوصاف وخصائص کا حامل ہے نافذ کرے۔ اس صالح قیادت سے اُس کا مقصد انسانیت کی فلاح وبہبود ہے جو صرف انسان کے اپنے خالق کے سامنے جھک جانے سے پیدا ہوسکتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کو اُس مقامِ رفیع پر متمکن کرے جو اللہ تعالیٰ نے اُس کے لیے تجویز کیا ہے اور خواہشاتِ نفس کے غلبہ واستیلاء سے اُسے نجات دے۔ یہ وہی مقصد ہے جسے حضرت ربیع بن عامر نے فارسی فوج کے قائد رستم کے جواب میں بیان کیا تھا۔ رستم نے پوچھا تھا کہ "تم لوگ یہاں کس غرض کے لیے آئے ہو؟ ربیع نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے

نکال کر اللہ واحد کی بندگی میں داخل کریں۔ دنیا پرستی کی تنگنائیوں سے نکال کر دنیا اور آخرت دونوں کی وسعتوں سے ہمکنار کریں، انسانی ادیان کے ظلم وستم سے نجات دے کر انہیں اسلام کے عدل میں لائیں۔''

اسلام انسان کی ان نفسانی خواہشات کی تائید وتوثیق کے لیے نہیں آیا جن کا انسان مختلف نظریات وتخیلات کے رُوپ میں گوناگوں رسم ورواج کے پردے میں اظہار کرتا رہا ہے۔ اسلام کی ابتداء کے وقت بھی ایسے نظریات ورسوم پائے گئے تھے اور آج بھی مشرق ومغرب میں انسانیت پر خواہشات نفس کا غلبہ وحکمرانی ہے۔ اسلام خواہشات کی اس حکمرانی کو مضبوط بنانے نہیں آیا، بلکہ اس لیے آیا ہے کہ وہ ایسے تمام تصورات وقوانین اور رسوم وروایات کی بساط لپیٹ دے۔ اور ان کی جگہ اپنی مخصوص بُنیادوں پر انسانی زندگی کی تعمیر نو کرے، ایک نئی دنیا تخلیق کرے، زندگی کی نئی طرح ڈالے جس کا مرکز ومحور اسلام ہو۔

جاہلیت کے ساتھ اسلام کی جزوی مشابہت

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کے بعض جزوی پہلو اُس جاہلیت کی زندگی کے بعض پہلوؤں کے مماثل ومشابہ نظر آتے ہیں جن میں لوگ عملاً گھرے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جاہلیت کے کچھ اجزاء اسلام میں پائے جاتے ہیں بلکہ یہ محض اتفاق ہے کہ بعض سطحی اور فروعی امور میں اسلام اور جاہلیت میں مشابہت پیدا ہوگئی ہے۔ ورنہ دونوں الگ الگ درخت کی مانند ہیں اور دونوں کی جڑیں اور تنے اور شاخیں ایک دوسرے سے جُدا ہیں۔ بلکہ اُن میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ایک وہ درخت ہے جسے حکمتِ الٰہی نے کاشت کیا اور سینچا ہے اور دوسرا وہ (شجر خبیث) ہے جو انسانی خواہشات کی زمین سے برآمد ہوا ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِىْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا

نَکِدًا. (اعراف:۵۸)

جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

جاہلیت خبیث اور فاسد مادہ ہے۔خواہ وہ قدیم جاہلیت ہو یا جدید جاہلیت کے خبث اور فساد کا ظاہری ہیولیٰ تو مختلف زمانوں میں مختلف روپ دھارتا رہا ہے۔مگر اس کی جڑ اور اصل ایک ہی رہی ہے اور یہ جڑ کوتاہ نظر اور جاہل انسانوں کی خواہشات میں پیوست ہوتی ہے جو اپنی نادانی اور خود بینی کے جال سے نکلنے کی سکت نہیں رکھتے، یا پھر چند افراد یا چند طبقات یا چند قوموں یا چند نسلوں کی مفاد پرستی اس کا ماخذ ہوتی ہے اور یہ مفاد پرستی عدل وانصاف، حق وصداقت اور خیر وصلاح کے تقاضوں پر غالب آجاتی ہے ۔مگر اللہ کی بے لاگ شریعت ایسے تمام مفاسد وعوامل کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔اور انسانوں کے لیے ایک ایسا قانون مہیّا کر دیتی ہے جو انسان کی دخل اندازی سے پاک ہوتا ہے۔اور اُس کے بارے میں یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں انسانی جہل کی آمیزش ہوگی یا انسانی اہواء واغراض کی ناپاکی اُس میں شامل ہوگی یا وہ کسی انسانی گروہ کی مفاد پرستی کی نذر ہو کر بے اعتدالی کا شکار ہوگا۔

اللہ کے بھیجے ہوئے نظریۂ حیات اور انسانوں کے اختراع کردہ نظریہ میں یہی بنیادی اور جوہری فرق ہے۔اور اس بنا پر دونوں کا ایک نظام کے تحت جمع ہونا محال اور دونوں میں کبھی توافق پیدا ہونا ناممکن ہے ۔اور اسی بنا پر کسی ایسے نظامِ حیات کا ایجاد کرنا بھی سعیٔ لاحاصل ہے جو آدھا تیتر اور آدھا بٹیر۔اس کا نصف اسلام سے ماخوذ ہو اور نصف جاہلیت سے۔جس طرح اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرتا اسی طرح وہ اپنے نازل کردہ نظریۂ زندگی کے ساتھ کسی اور نظریہ کی شراکت کو بھی قبول نہیں کرتا۔یہ دونوں جُرم اللہ کے نزدیک ایک ہی درجہ رکھتے ہیں۔اور دونوں دراصل ایک ہی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔

خالص اسلام کی دعوت

ہم جب لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں اور دعوت وتبلیغ کا کام سرانجام دیں تو اسلام کے بارے میں یہ مذکورہ حقیقت ہمارے ذہنوں میں اس قدر مضبوطی کے ساتھ جاگزیں اور پیوست اور واضح ہونی چاہیے کہ اس کے اظہار واعلان میں کبھی ہماری زبان نہ لڑکھڑائے اور کسی موقع پر ہم شرم محسوس نہ کریں ،اور لوگوں کو اس بارے میں کسی شک واشتباہ میں نہ رہنے دیں ،اور ان کو اس بات کا پوری طرح قائل کر کے چھوڑیں کہ اگر وہ دامنِ اسلام میں آئیں گے تو ان کی زندگیوں کی کایا پلٹ جائے گی۔اُن کے اعمال وکردار اور اُن کے اصول وضوابط بھی بدلیں گے اور اُن کے تصورات اور اندازِ فکر بھی تبدیل ہوگا۔اسی تبدیلی کی بدولت اسلام اُنہیں وہ خیر کثیر عطا کرے گا جس کی وسعتیں انسانی قیاس میں نہیں سماسکتیں وہ ان کے افکار ونظریات میں رفعت پیدا کرے گا اور انہیں اُس مقام عزت ومرتبۂ شرف سے قریب تر کرے گا جو سزاوار انسانیت ہے۔جس پست جاہلی زندگی سے وہ اب تک آلودہ رہے اُس کی کوئی آلائش باقی نہ چھوڑے گا،اِلَّا یہ کہ جاہلی دور کی کوئی ایسی جزئیات پائی جائیں جو اتفاق سے نظامِ اسلامی کی بعض جزئیات سے ہم رنگ اور ہم آہنگ ہوں ،لیکن وہ بھی اپنی اصلی حالت میں نہ رہیں گی بلکہ اسلام کی اس اصل عظیم سے مربوط ہو جائیں گی جو جاہلیت کی اس خبیث اور غیر بارآور اصل سے بنیادی طور پر مختلف ہے جن کے ساتھ وہ آج تک وابستہ تھے۔اسلام یہ انقلاب عظیم برپا کرنے کے بعد انسانوں کو علم وتحقیق کے ان شعبوں سے محروم نہیں کرے گا جو مشاہدہ واستقراء پر مبنی ہیں بلکہ وہ ان شعبوں کو مزید ترقی دے گا۔الغرض داعیانِ اسلام کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اس وہم میں نہ رہنے دین کہ اسلام بھی انسان کے وضع کردہ اجتماعی نظریات میں سے ایک نظریہ اور خودساختہ نظاموں میں سے ایک نظام ہے جو مختلف ناموں اور مختلف جھنڈوں کے ساتھ رُوئے زمین میں پائے جاتے ہیں۔بلکہ وہ خالص اور بے لاگ نظام ہے۔وہ مستقل بالذات انفرادیت کا مالک ہے،جداگانہ تصورزندگی رکھتا ہے

اور جداگانہ طرزِ حیات لے کر آیا ہے۔ وہ انسانیت کو جو کچھ دینا چاہتا ہے وہ وضعی نظاموں کی خیالی جنتوں سے ہزار درجہ بہتر وسود مند ہے۔ وہ ایک اعلیٰ وارفع نظام ہے پاکیزہ واُجلا نظریۂ حیات ہے، وہ جمال افروز ہے، وہ معتدل راہ ہے، اُس کے سوتے براہ راست اللہ برتر وعظیم کے ازلی وابدی چشموں سے پھوٹے ہیں۔

جب ہم اس انداز پر اسلام کا شعور حاصل کر لیں گے تو یہ شعور ہمارے اندر یہ فطری صلاحیت بھی پیدا کر دے گا کہ ہم اسلام کی دعوت پیش کرتے وقت پوری خود اعتمادی اور قوت کے ساتھ، بلکہ پوری ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ لوگوں سے مخاطب ہوں، اس شخص کی سی خود اعتمادی جسے یہ بھرپور یقین ہو کہ وہ جس دعوت کا حامل ہے وہ سراسر حق ہے اور اس کے برخلاف دوسرے لوگ جس راہ پر چل رہے ہیں وہ باطل کی راہ ہے، اس شخص کی سی ہمدردی جو انسانوں کو شقاوت اور بدنصیبی میں گھرا ہوا پا رہا ہو اور یہ جانتا ہو کہ انہیں آغوش سعادت میں کیونکر لایا جا سکتا ہے، اس شخص کی سی دِل سوزی جو لوگوں کو تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہوا دیکھ رہا ہو، اور جانتا ہو کہ انہیں وہ روشنی کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے جس کے بغیر وہ راہِ حق نہیں پا سکتے۔ الغرض اسلام کا سچا شعور حاصل ہو جانے کے بعد ہمیں یہ حاجت نہیں ہوگی کہ ہم چور دروازوں سے لوگوں کے ذہنوں میں اسلام کو اتاریں اور ان کی نفسانی خواہشات اور باطل اور گمراہانہ نظریات کی تھپکی دیں۔ بلکہ ہم ڈھکی چھپی رکھے بغیر صاف صاف اسلام کی دعوت ان کے سامنے رکھیں گے اور ان کو توجہ دلائیں گے کہ یہ جاہلیت جس میں تم گھرے ہوئے ہو یہ ناپاک اور نجس ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس نجاست اور گندگی سے پاک کرنا چاہتا ہے، یہ صورتِ حال جس میں تم سانس لے رہے ہو سراسر خباثت اور فساد ہے اور اللہ تمہارے لیے پاکیزہ وطیّب نظام پسند کرتا ہے، یہ طرز زیست ہے جسے تم نے اختیار کر رکھا ہے انتہائی پستی اور گراوٹ سے عبارت ہے اور اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارا مقام بلند عطا کرنا چاہتا ہے، تمہارے یہ لیل ونہار شقاوت اور ذلّت اور پس ماندگی و پژمردگی سے کُہر آلود ہو چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے آسانیاں پیدا کرے، تمہیں اپنی آغوش رحمت

میں لے اور تمہیں سعادت مندی کا تاج پہنائے ۔اسلام تمہارے نظریات وافکار کو بدل ڈالے گا ،تمہارے حالات کا پانسہ پلٹ دے گا،تمہیں نئی قدروں سے متعارف کرائے گا،تمہیں ایسی بالا و برتر زندگی سے سرفراز کرے گا کہ اس کے مقابلے میں تم اپنی موجودہ زندگی کوخود بخود ہیچ سمجھنے لگو گے ۔تمہارے لیل ونہار میں وہ ایک ایسا انقلاب برپا کردے گا کہ تم خود اپنی موجودہ عالم گیر صورتِ حال سے نفرت کرنے لگو گے وہ تمہیں ایسے تہذیبی سانچوں سے بہرہ یاب کرے گا کہ ان کو پا کر تم اپنے موجودہ تہذیبی سانچوں کو جو روئے زمین میں رائج ہیں حقیر سمجھنے لگو گے۔اگر تم اپنی حرماں نصیبی کی وجہ سے اِسلامی زندگی کی عملی صورت نہیں دیکھ سکے ہو کیونکہ تمہارے دشمن اس بات پر متحد اور صف آراء ہیں کہ زندگی کا یہ نظام دنیا میں کبھی برپا نہ ہو سکے اور جامۂ عمل نہ پہنے،تو آؤ ہم تمہیں اس کی حلاوت سے آشنا کرتے ہیں کیونکہ بتوفیق اللہ اس زندگی کا ہم اپنے قلب وضمیر کی دنیا میں مشاہدہ کر چکے ہیں،ہم اپنے قرآن،اپنی شریعت اور اپنی تاریخ کے جھروکوں سے اُس کا نظارہ کر چکے ہیں،اپنے مستقبل کے خوشنما تخیل میں جس کے آنے میں ہمیں شمہ بھر شک نہیں ہے اُسے جھانک چکے ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ اسی طرز پر اور اسی انداز سے ہم لوگوں کے سامنے اسلام پیش کریں،اسلام کی طبیعت وفطرت بھی یہی ہے اور یہی وہ اصل شکل ہے جس میں اسلام پہلی مرتبہ انسانوں سے مخاطب ہوا تھا ،جزیرۃ العرب میں،فارس میں،روم میں اور ہر اُس خطے میں جہاں اسلام نے لوگوں کو پُکارا اسی انداز اور اسی ڈھنگ سے پُکارا۔اُس نے انسانیت کو اُونچی فضا سے جھانکا اس لیے کہ یہی اس کا حقیقی مقام تھا۔اُس نے انسانیت سے درد بھری زبان میں گفتگو کی کیوں کہ یہی اُس کی فطرت تھی،اُس نے انسانیت کو کسی ابہام وتردّد کے بغیر دوٹوک الفاظ میں چیلنج کیا کیونکہ یہی اُس کا طریقہ تھا،اُس نے کبھی لوگوں کو اس خوش فہمی میں نہیں رہنے دیا کہ وہ اُن کی عملی زندگی کو،ان کے تصورات وافکار کو اور ان کی اقدار واخلاق کو مس نہیں کرے گا اور اگر کیا بھی تو محض اِکّا دُکّا تبدیلیوں کے لیے!!اسی طرح اُس نے کبھی انسانوں کے من بھاتے اصول وضوابط اور نظریات وافکار سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کیا،نہ ان

سے اپنے آپ کو تشبیہ دی ،جیسا کہ آج کل ہمارے بعض مفکرین اسلام کا شیوہ بن چکا ہے۔کبھی وہ ''اسلامی ڈیموکریسی'' کی اصطلاح وضع کرتے ہیں اور کبھی ''اسلامی سوشلزم'' کی۔اور کبھی کہتے ہیں کہ دنیا کا موجودہ اقتصادی، سیاسی اور قانونی نظاموں میں اسلام کو بس چند معمولی سی تبدیلیاں کرنے کی ضرورت ہے۔اس طرح کی چکنی چپڑی باتیں صرف اس لیے کی جاتی ہیں کہ لوگوں کی خواہشات کو تھپکی دی جائے۔

لیکن یہ اسلام ہے،خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔اسلام اُس اسلام سے بالکل مختلف ہے جو بعض مفکرین اسلام پیش کرتے ہیں۔یہ جاہلیت کا طوفان جو روئے زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہے،انسانیت کو اس سے نکال کر اسلام کے پر امن گھوارے میں داخل کرنے کے لیے دُور رس اور وسیع تبدیلی کی ضرورت ہے۔اسلام کا نقشۂ حیات جاہلیت کے اُن تمام نقشوں سے یک قلم مختلف ومتضاد ہے جو دورقدیم میں پائے گئے تھے یا عہدِ حاضر میں پائے جاتے ہیں،موجودہ انسانیت شقاوت وزَبُوں حالی کے جن تودوں کے نیچے کراہ رہی ہے وہ چند معمولی تبدیلیوں سے نہیں ہٹائے جاسکتے۔انسانیت اس شقاوت وزَبُوں حالی کی زندگی سے اگر نجات پاسکتی تو وہ صرف اسی صورت میں کہ ایک ہمہ گیر،دُور رس اور جوہری انقلاب برپا کیا جائے۔مخلوق کے وضع کردہ نظاموں کو ہٹا کر خالق کے نازل کردہ نظام کو جاری کیا جائے۔انسانی قوانین کو فارغ خطی دے کر انسانوں کے پروردگار کے قانون کو اختیار کیا جائے ۔بندوں کی حکمرانی سے نجات پا کر بندوں کے رب کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالا جائے۔یہ ہے وہ صحیح اور حقیقت پسندانہ طریقِ کار۔اس طریقِ کار کا اظہار ہمیں برملا اور دوٹوک کردینا چاہیے اور اس معاملے میں لوگوں کو کسی شک والتباس میں نہ رہنے دینا چاہیے۔

ہوسکتا ہے کہ لوگ شروع شروع میں اس طرزِ دعوت سے بدکیں،اس سے دُور بھاگیں اور خوف کھائیں ۔لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے،لوگ اُس وقت بھی اسلام کی دعوت سے ایسے ہی دور بھاگتے رہے تھے اور خوف زدہ اور متنفر تھے جب پہلی مرتبہ ان کے سامنے یہ دعوت پیش کی گئی تھی انہیں یہ شدید ناگوار گزرتا

تھا کہ محمد (ﷺ) اُن کے افکار واوہام کی تحقیر کرتے ہیں، ان کے دیوتاؤں پر نکتہ چینی کرتے ہیں، ان کے رسوم ورواج اور عادات سے بیزار ہیں اور اپنے لیے چند ماننے والوں کے لیے ان کے رسوم وروایات اور قوانین وضوابط کے برخلاف نئے اصول وضوابط اور اقدار واخلاق اختیار کرر کھے ہیں لیکن آخر کیا ہوا؟ یہی لوگ جنہیں پہلی مرتبہ حق اچھا نہیں لگا اُسی حق کے دامن رحمت میں انہوں نے پناہ لی ،جس حق سے وہ اس طرح بدکتے تھے کہ کانهم حمر مستنفرة فرّت من قسورة (گویا وہ جنگلی گدھے ہیں اور شیر کو دیکھ کر بھاگ اُٹھے ہیں) جس کے خلاف انہوں نے اپنی پوری طاقت اور ساری تدبیریں صرف کردیں، جس کے ماننے والوں کو انہوں نے مکہ کی بے بس زندگی کے دَوران طرح طرح کی اذیت ناک اور زہرہ گداز عذاب دیے اور پھر ہجرت کے بعد مدینہ کی زندگی میں بھی جب انہیں طاقت پکڑتے دیکھا تو اُن کے خلاف تند وتیز جنگیں برپا کردیں اُسی کے بالآخر وہ غلام بے دام بن کرر ہے۔

دعوت اسلامی کی کامیابی کی کلید

دعوتِ اسلامی کو آغاز میں جن حالات سے گزرنا پڑا تھا وہ آج کے حالات کی بہ نسبت حوصلہ افزا، امید بخش اور سازگار نہ تھے۔اس وقت بھی وہ ایک انجانی دعوت تھی جاہلیت اُسے جھٹلاتی تھی ،وہ مکہ کی گھاٹیوں کے اندر محصور رہی، ارباب جاہ وشوکت پنجے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑے رہے، اپنے دَور میں وہ تمام دنیا کے لیے ایک اجنبی چیز تھی ،اُسے اطراف کی ایسی عظیم اور جابر وسرکش سلطنتوں نے گھیر رکھا تھا جو اُس کے تمام بنیادی اصولوں اور مقاصد کی دشمن تھیں۔ بایں ہمہ یہ دعوت ان شدید تر حالات میں بھی اپنے پاس قوت کا غیر معمولی سرمایہ رکھتی تھی اسی آج بھی یہ اُسی قوت سے بہرہ ور ہے، اور آئندہ بھی اس کی یہ قوت قائم ودائم رہے گی۔اس کی قوت کا راز خود اس کے عقیدہ کی فطرت میں پنہاں ہے۔یہی وجہ ہے کہ بُرے سے بُرے حالات اور کٹھن سے کٹھن ماحول میں بھی اس کا کام جاری رہا ہے۔اس کی

طاقت کا منبع وہ سیدھا سادھا اور روشن ''حق'' ہے جس پر یہ دعوت قائم ہے، اس کی قوت کی کلید اس کی فطرت انسانی کے ساتھ ہم آہنگی ہے۔ اس کی قوت کا سرچشمہ اس کی حیرت انگیز صلاحیت میں پوشیدہ ہے کہ یہ ہر مرحلہ میں انسانیت کی قیادت کے اہل ہے اور اُسے ترقی و عروج پر گامزن کر سکتی ہے خواہ انسانیت اقتصادی اور اجتماعی لحاظ سے اور علمی اور عقلی پہلو سے دور انحطاط میں ہو یا ترقی بکنار، نیز اس کی قوت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ یہ واشگاف انداز میں جاہلیت اور اس کی تمام مادی طاقتوں کو چیلنج کرتی ہے، اور اس اعتماد اور جزم کے ساتھ اُس کے سامنے خم ٹھونک کر آتی ہے کہ اپنے کسی اصول میں اُسے کسی ایک شوشے کی تحریف بھی گوارا نہیں، وہ جاہلیت کی خواہشوں سے قطعاً مصالحت نہیں کرتی، اور نہ جاہلیت کے اندر سرایت کرنے کے لیے وہ چور دروازوں سے اور حیلے بہانوں کا سہارا ڈھونڈتی ہے، وہ حق کا بہ بانگِ دہل اعلان کر دیتی ہے اور لوگوں کو پُوری طرح آگاہ کر دیتی ہے کہ وہ سراسر خیر، سراسر رحمت اور سراسر برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ جو انسانوں کا خالق ہے وہ خوب جانتا ہے کہ ان کی فطرت کیا ہے اور ان کے دلوں کا روزن کہاں کہاں ہیں۔ اُسے خوب معلوم ہے کہ اگر حق کو صراحت اور قوت کے ساتھ علانیہ پیش کر دیا جائے اور اسے پیش کرنے میں کسی راز داری، نقاب پوشی اور گومگو کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے تو وہ دلوں کے اندر اُتر کر رہتی ہے۔

جزوی اسلام کی دعوت مضر ہے

انسانی نفوس ایک طرز زندگی کو چھوڑ کر دوسرا طرز زندگی اپنانے کے کی پُوری صلاحیت اور استعداد رکھتے ہیں۔ بلکہ مکمل تبدیلی ان کے لیے بسا اوقات جزوی تبدیلیوں کی بہ نسبت زیادہ آسان ہوتی ہے۔ ایک ایسے نظامِ حیات کی طرف منتقل ہونا جو پہلے سے زیادہ برتر، زیادہ کامل اور زیادہ پاکیزہ ہو خود انسانی فطرت بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ اس کے برعکس اگر اسلامی نظام خود ہی اِدھر اُدھر کی چند سطحی تبدیلیوں پر اکتفا کر لے۔ تو پھر پُورے جاہلی نظام کو چھوڑ کر پُورے اسلامی نظام کی طرف آنے کی وجہ جواز

کیا ہوگی؟ ظاہر ہے کہ ایک مانوس نظام پر جمار ہنا زیادہ قرینِ عقل ہے، اس لیے کم از کم وہ جما جمایا نظام تو ہے۔ اُسی کے اندر اصلاحات اور تبدیلیاں کی جاسکتی ہیں۔ پھر ایسے نظام کی طرف جس کی اکثر و بیشتر خصوصیات نئے نظام سے ملتی جُلتی ہوں اُسے اُٹھا کر پھینک دینے اور اُس کے بجائے ایک غیر قائم شدہ نظام کی طرف رجوع کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے؟

اسلام کو اپنی صفائی کی کوئی ضرورت نہیں

اسی طرح بعض متکلمین اسلام بھی پائے جاتے ہیں جو لوگوں کے سامنے اسلام کو اس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ گویا اسلام ایک ملزم ہے اور وہ اس کے وکیل صفائی ہیں۔ وہ اسلام کی صفائی اور دفاع جس طریقے سے کرتے ہیں وہ کچھ اس طرح کا ہے کہ ''نظامِ حاضر نے فلاں اور فلاں کام کیے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اسلام نے یہ کام کر کے نہیں دکھائے، مگر صاحبو! اسلام تو ان کاموں کو پہلے کر چکا ہے جنہیں موجودہ تہذیب ۱۴ سو سال بعد کر رہی ہے''۔ کیا گھٹیا دفاع ہے اور کیا بھونڈی صفائی ہے!! اسلام جاہلی نظاموں اور اُن کے بُرے اور تباہ کُن تصرّفات کو اپنے کسی عمل کے جواز کی دلیل ہر گز نہیں بناتا۔ یہ تہذیبیں جنہوں نے اکثر لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا ہے اور ان کے دل و دماغ ماؤف کر رکھے ہیں یہ خالصتاً جاہلی نظام کے شاخسانے ہیں۔ اور اسلام کے مقابلے میں ہر لحاظ سے ناقص، کھوکھلے، ہیچ اور پوچ ہیں، یہ دلیل قابلِ اعتبار نہیں ہے کہ ان تہذیبوں کے سائے میں بسنے والے لوگ ان لوگوں سے زیادہ خوشحال ہیں جو نام نہاد عالمِ اسلامی میں رہتے ہیں۔ ان علاقوں کے باشندے اپنی موجودہ زبوں حالی کو اس لیے نہیں پہنچے کہ یہ مسلمان ہیں بلکہ اس لیے کہ انہوں نے اسلام سے منہ موڑ رکھا ہے۔ اسلام تو لوگوں کے سامنے اپنی صداقت کی یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ وہ ناقابل قیاس کی حد تک جاہلیت سے اولیٰ اور افضل ہے، وہ جاہلیت کو برقرار رکھنے کے لیے نہیں بلکہ اُسے بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکنے کے لیے آیا ہے، وہ انسانیت کو اس آلودگی پر جسے تہذیب کا نام دیا جاتا ہے اشیر باد دینے کے لیے

نہیں آیا بلکہ وہ انسانیت کو اس درک اسفل سے نکالنے کے لیے آیا ہے۔
ہمیں اس حد تک تو شکست خوردخوردہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم رائج الوقت نظریات وافکار کے اندر اسلام کی شبہیں ڈھونڈنے لگیں، ہمیں ان تمام نظریات وافکار کو خواہ مشرق ان کا علمبردار ہو اور خواہ مغرب ،پسِ پشت ڈالنا چاہیے اس لیے کہ یہ نظریات ان اعلیٰ وارفع مقاصد کے مقابلہ میں نہایت پست، حقیر او غیر ترقی یافتہ ہیں جن کو اسلام اپنا مطمحِ نظر قرار دیتا ہے اور انسانیت کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جب ہم لوگوں کو صحیح اسلام کی بنیاد پر دعوت دیں گے اور ان کے سامنے اسلام کے جامع تصور کا اساسی عقیدہ پیش کریں گے تو خود ان کی فطرت کی گہرائیواں سے اس کے حق میں آواز اٹھے گی جو ایک تصور سے دوسرے تصور کی طرف اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوجانے کا انہیں جواز بلکہ وجوب بھی فراہم کرے گی۔لیکن یہ دلیل انہیں ہرگز متاثر نہیں کرسکتی کہ ہم اُن سے کہیں کہ رائج نظام کو چھوڑ کر ایک غیر رائج نظام کی طرف آؤ، یہ تمہارے رائج نظام کے اندر صرف ضروری تبدیلیاں کرے گا اور تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے اس لیے کہ موجودہ نظام کے اندر بھی جو کچھ تم کر رہے ہو وہی کچھ تم نئے نظام میں بھی کرسکو گے۔بس تمہیں اپنی عادات اور خواہشات اور رکھ رکھاؤ میں بعض خفیف تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔اور ان کے بعد تم جس عادت اور خواہش کے بھی رسیا ہو وہ علی حالہٖ باقی رہے گی۔اُس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا کیا بھی گیا تو یُونہی سرسری سا۔
یہ طریقہ بظاہر بڑا آسان اور مرنجان مرنج ہے مگر اپنی سرشت کے لحاظ سے کسی قسم کی کشش نہیں رکھتا ۔مزید برآں یہ حقیقت سے بھی بعید ہے۔کیوں کہ حقیقت تو یہ پکار رہی ہے کہ اسلام محض زندگی کے اصول ونظریات ہی تبدیل نہیں کرتا، محض اجتماعیہ کے قوانین وشرائع ہی دگرگوں کر کے نہیں رکھ دیتا بلکہ احساسات اور جذبات تک کی دنیا کو بھی اس طرح بنیاد واساس کے لحاظ سے بدل کر رکھ دیتا ہے کہ جاہلی زندگی کے کسی اصول کے ساتھ اس کا رشتہ باقی نہیں رہتا۔مختصر طور پر یوں بیان کر دینا کافی ہوگا کہ اسلام زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملہ سے لے کر بڑے سے بڑے تک میں انسانوں کو بندوں کی بندگی

سے نکال کر اللہ واحد کی بندگی کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اس کے بعد:

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ.

جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کا راستہ اختیار کرے اور جو کفر کرتا ہے تو بے شک اللہ تعالیٰ تمام اہلِ جہان سے بے نیاز ہے۔

یہ مسئلہ درحقیقت کفر و ایمان کا مسئلہ ہے۔ شرک و توحید کا مسئلہ ہے، جاہلیت اور اسلام کا مسئلہ ہے، اسی بنیادی حقیقت کو اظہر من الشّمس ہونا چاہیے۔ جن لوگوں کی زندگی جاہلیت کی زندگی ہے، وہ لاکھ اسلام کا دعویٰ کریں مگر وہ مسلمان نہیں ہیں۔ ان میں کچھ اگر خود فریبی میں مبتلا ہیں یا دوسروں کو دھوکہ میں ڈال رہے ہیں اور اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ اسلام ان کی جاہلیت کا ہمنوا ہوسکتا ہے تو انہیں کون روک سکتا ہے مگر ان کی خود فریبی یا جہاں فریبی سے حقیقت تو نہیں بدل سکتی۔ ان لوگوں کا اسلام نہ اسلام ہے اور نہ یہ مسلمان ہیں۔ آج اگر دعوتِ اسلامی برپا ہو تو پہلے انہی کشتگانِ جاہلیت کو اسلام کی طرف لانا اور انہیں ازسرِ نو حقیقی مسلمان بنانا ہوگا۔

ہم لوگوں کو اسلام کی طرف اس لیے نہیں بُلا رہے ہیں کہ ان سے کسی اجر کے طالب ہیں اور نہ ہم ملک میں اقتدار حاصل کرنے یا فساد برپا کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اپنی ذات کے لیے ہم سرے سے کسی منفعت کا لالچ نہیں رکھتے۔ ہمارا اجر اور ہمارا حساب لوگوں کے ذمہ نہیں اللہ کے ذمہ ہے۔ لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے پر جو چیز ہمیں مجبور کرتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ہم ان کے سچے ہمدرد اور حقیقی بہی خواہ ہیں۔ خواہ وہ ہم پر کتنے کی مصائب کے پہاڑ توڑیں۔ داعیٔ حق کی یہی فطری شاہراہ ہے اور یہی حالات اُسے مہمیز کا کام دیتے ہیں۔ لہٰذا لوگوں کو ہماری زندگیوں کے اندر اِسلام کی صحیح تصویر نظر آنی چاہیے۔ اور انہیں اُس بارگراں کا بھی صحیح اندازہ ہوجانا چاہیے جس کے اُٹھانے کا اسلام اُن سے مطالبہ کرتا ہے اور جس کے عوض انہیں وہ بھی معلوم ہوجانا چاہیے کہ جس جاہلیت میں وہ غرق ہیں اُس کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ یہ نری جاہلیت ہے، اسلام کا اس سے دور کا واسطہ نہیں ہے۔ اس کا

ماخذ چونکہ شریعت نہیں ہے اس لیے وہ سرتا پا ہوائے نفس ہے، اور چونکہ وہ حق نا آشنا ہے اس لیے وہ بلاشبہ باطل ہے۔ فماذا بعد الحق الا الضلال.

ہم جس اسلام کے علمبردار ہیں اس میں کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو ہمارے لیے کسی شرمندگی یا احساس کمتری کا موجب ہو یا جس کی صفائی کی ہمیں ضرورت ہو، اور نہ اس کے اندر کوئی ایسا نقص ہے جس کی وجہ سے ہم اُسے لوگوں تک پہنچانے کے لیے کسی طرح کی ریشہ دوانی کرنے کی ضرورت محسوس کریں۔ یا اُس کی اصلیت کے تقاضا کے تحت ڈنکے کی چوٹ پر اُس کا اعلان کرنے کے بجائے طرح طرح کی نقابیں ڈال کر اُسے پیش کریں۔ دراصل یہ روگ مغرب اور مشرق میں پھیلے ہوئے جاہلی نظاموں سے رُوحانی اور نفسیاتی شکست کھا جانے کی وجہ سے بعض ''مسلمانوں'' کو لاحق ہوگیا ہے اور وہ انسانی قوانین کے اندر ایسے پہلو تلاش کرنے میں لگے رہتے ہیں جن سے وہ اسلام کی موافقت اور تائید کرسکیں، یا وہ جاہلیت کے کارناموں کے اندران باتوں کی ٹوہ کرتے رہتے ہیں جن سے یہ دلیل فراہم کرسکیں کہ اسلام نے بھی یہ کام کر دکھائے ہیں۔

جو شخص اسلام اور اس کی تعلیمات کی صفائی کی ضرورت محسوس کرتا ہے یا معذرت خواہانہ ذہنیت رکھتا ہے تو ایسا شخص ہرگز اسلام کی صحیح نمائندگی نہیں کرسکتا۔ بلکہ یہ بیوقوف دوست ہے جو خود تو اس بودی اور کھوکھلی جاہلیت سے مرعوب و مغلوب ہو چکا ہے، جو تضاد سے بھری ہوئی ہے اور نقائص سے جس جسم داغ داغ ہے مگر وہ کم کوشش بایں ہمہ اُلٹا جاہلیت کے لیے جواز فراہم کرتا ہے۔ یہ حضرات اسلام کے دشمن ہیں اور اسلام کی خدمت کے بجائے اُسے ضعف پہنچاتے ہیں۔ بلکہ دوسروں کو بھی مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کی ژاژ خائیوں کا سدِّ باب کریں۔ ان کی باتیں سُن کر یُوں محسوس ہوتا ہے کہ اسلام مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہے اور اپنا دفاع کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے!

مغرب زدہ ذہن کی داماندگیاں

جس زمانے میں میرا قیام امریکہ میں تھا اُنہی دنوں کی بات ہے کہ اسلام کے ایسے ہی نادان دوست ہمارے ساتھ الجھتے تھے۔ہم لوگ اسلام کی طرف منسوب تھے تعداد میں کم تھے۔مخالفین اسلام کے مقابلے میں ہمارے بعض دوست مدافعانہ موقف اختیار کرتے تھے مگر میں ان سب کے برعکس مغربی جاہلیت کے بارے میں جارحانہ مسلک پر قائم تھا اور احساس کہتری میں مبتلا ہوئے بغیر مغربی جارحیت کے بودے اور متزلزل اور مذہبی عقائد پر تلخ تنقید کرتا ،مغربی جاہلیت کے انسانیت سوز معاشری اور اقتصادی اور اخلاقی حالات کو بے جھجک ننگا کرتا اور بتاتا کہ مسیحیت کے یہ اقانیم ثلاثہ،اور گناہ اور کفارہ کے نظریات عقل سلیم اور ضمیر پاکیزہ کے لیے قابل قبول نہیں ہیں ۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام اور اجارہ داری اور سُودخوری اور دوسرے ظالمانہ اور انسانیت کش حربے،اور یہ خود سر انفرادی ازادی جس میں اجتماعی کفالت اور باہمی ہمدردی کے لیے اس وقت تک کوئی گنجائش نہیں جب تک قانون کا ڈنڈا حرکت میں نہ آئے ،زندگی کا یہ مادّہ پرستانہ سطحی اور بے جان تصور، یہ چوپائیاں کی سی بے لگامی جسے آزادی اختلاط کا نام دیا جاتا ہے، یہ بردہ فروشی جسے آزادی نسواں کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ نظام وطلاق کے رکاکت آمیز، تکلیف دہ ،اور عملی زندگی کے منافی قوانین وضوابط ، یہ ناپاک اور مجنونانہ نسلی امتیاز یہ سب کچھ عقلِ سلیم کے خلاف اور انسانیت کے لیے باعثِ عار ہے،اسی کے ساتھ ہی میں ان کو یہ بھی بتاتا تھا کہ اسلام کس قدر عقلی و علمی نظریہ ہے، کس قدر بلند نگاہ، انسانیت نواز اور شاداب وزرخیز نظام ہے،اُن اُفقوں تک اپنی کمندیں پھینکتا ہے جن تک انسان پرواز کرنا چاہتا ہے مگر آج پہنچے سے عاجز ہے۔اسلام عملی زندگی کا نظام ہے اور یہ زندگی کی تمام گتھیوں کو انسان کی فطرت سلیم کے تقاضوں کی روشنی میں سلجھاتا ہے۔

مغرب کی زندگی کے یہ عملی حقائق تھے جن سے ہم سب کو پالا پڑا تھا۔اور جب اسلام کی روشنی میں ان

حقائق کا جائزہ لیا جاتا تھا تو ان کے متوالوں کے سر بھی شرم سے جُھک جاتے تھے۔لیکن اس کے باوجود اسلام کے ایسے دعویدار بھی موجود ہیں جو اس نجاست سے مرعوب ہو چکے ہیں جس میں جاہلیت لت پت ہے اور وہ مغرب کے اس کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کے اندر اور مشرق کی شرمناک اور کریہہ النظر مادّہ پرستی کے اندر وہ چیزیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں جن کی اسلام سے مشابہت ثابت کرسکیں یا اسلام کو ان کے مشابہ و مماثل قرار دے سکیں!!

داعیانِ حق کے لیے صحیح طرزِ عمل

اس کے بعد مجھے یہ کہنے کی حاجت محسوس نہیں ہوتی کہ ہمیں یعنی دعوتِ اسلامی کے علمبرداروں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم جاہلیت کا کس پہلو سے ساتھ دیں، جاہلیت کے کسی نظریہ کے ساتھ یا جاہلیت کے کسی نظام کے ساتھ یا جاہلیت کی کسی روایت کے ساتھ کسی نوعیت کی سودا بازی کریں، چاہے ہم پر کوہ غم ہی ٹوٹ پڑے۔اور جبر وتشدد کا نظام ہمارے خلاف آزمائشوں کا طوفان برپا کر دے۔

ہمارا اوّلین کام یہ ہے کہ ہم جاہلیت کو مٹا کر اُس کی جگہ اسلامی نظریات اور اسلامی اقدار وروایات کو براجمان کریں۔یہ منشا جاہلیت کی ہمنوائی سے اور آغازِ سفر میں چند قدم اُس کا ساتھ دینے سے پُورا نہیں ہو سکے گا۔ہمارے بعض دوست اس کی باتیں بالفعل سوچ رہے ہیں مگر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اوّل قدم ہی پر اپنی شکست کا اعلان کر دیا۔

بے شک رائج الوقت اجتماعی تصورات اور فروغ پذیر معاشرتی روایات کا دباپ نہایت شدید اور کمر شکن ہے، بالخصوص عورت کے معاملے میں یہ دباؤ اور بھی زیادہ ہے۔بے چاری مسلمان عورت اس جاہلیت کے طوفان میں بڑے سنگدلانہ دباؤ اور بھیانک مخالفت سے دوچار ہے۔لیکن امر محتوم سے کوئی مفر نہیں ہے۔لازماً ہمیں پہلے ثابت قدمی اور جگرداری کا ثبوت دینا ہوگا اور پھر حالات پر غلبہ حاصل کرنا ہوگا۔اس طرح ہمیں جاہلیت کے اُس گہرے کھڈ کے حدود اربعہ کا مشاہدہ بھی کرانا ہوگا جس میں وہ

اب رگری پڑی ہے اور مقابلتاً دنیا کو اُس اسلامی زندگی کے وہ نور افگن اور بلند و بالا افق دکھانے ہوں گے جس کے ہم داعی ہیں۔

اتنا عظیم کام یوں سر انجام نہیں پا سکتا کہ ہم چند قدم جاہلیت کے دوش بدوش چلیں اور نہ اس طرح سے انجام پا سکتا ہے کہ ہم ابھی سے جاہلیت کا یکسر مقاطعہ کر دیں اور اس سے الگ تھلگ ہو کر گوشۂ عزلت میں جا بیٹھیں۔ یہ دونوں فیصلے غلط ہیں۔ ہم جاہلیت کے ساتھ ہم آمیز تو ہوں مگر اپنا تشخص باقی رکھ کر، جاہلیت کے ساتھ لین دین کریں مگر دامن بچا کر، حق کا واشگاف اعلان کریں مگر سوز و محبت کے ساتھ، ایمان و عقیدہ کے بل پر اُونچے رہیں مگر انکساری اور تواضع کے جلو میں، اور آخر میں یہ حقیقت نفس الامری ہمارے قلب و ذہن پر پوری طرح ثبت ہونی چاہیے کہ: ہم جاہلی فضا میں زندگی بسر کر رہے ہیں، اس جاہلیت کے مقابلے میں ہماری راہ زیادہ راست اور سیدھی ہے، ہمارا مشن ایک دُور رس تبدیلی برپا کرنا ہے، یعنی انسانیت کو جاہلیت کی تاریکیوں سے نکال کر اسلام کی روشنی میں داخل کرنا ہے۔ جاہلیت اور اسلام کے مابین ایک وسیع و عریض وادی ہے جس پر کوئی پُل اس غرض کے لیے کھڑا نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں بین بین آ کر مل سکیں، بلکہ ایسا پُل اگر قائم کیا جا سکتا ہے تو صرف اس غرض کے لیے کہ اہلِ جاہلیت اُسے عبور کر کے آغوشِ اسلام میں آ پناہ لیں خواہ وہ مبینہ اسلامی وطن کے رہنے والے مدعیانِ اسلام ہوں یا اس کے باہر کے لوگ ہوں۔ تا کہ وہ اندھیروں سے نکل کر اُجالے میں آئیں، اور اس زَبُوں حالی سے نجات پائیں جس میں سرتاپا غرق ہیں اور اُس "خیر" سے مستفید ہو سکیں جس سے وہ گروہ شاد کام ہو چکا ہے جس نے اسلام کو پہچان لیا ہے اور جو اسلام ہی کے سائے میں جینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اگر کسی کو یہ دعوت پسند نہیں ہے تو ہمیں اس سے وہی کرنا چاہیے جس کا حکم اللہ نے اپنے رسول کو دیا تھا: لکم دینکم ولی دین (تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین) سورۃ الکافرون۔

باب یازدھم

ایمان کی حکمرانی

ارشاد باری ہے:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحزَنُوا وَاَنتُمُ الاَعلَونَ اِن كُنتُم مُؤمِنِينَ. (آل عمران:۱۳۹)

شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔

ایمان باللہ کا ہمہ گیر استیلاء

اس آیت سے بظاہر جو مفہوم متبادر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں اللہ کی طرف سے جو ہدایت دی گئی ہے اُس کا تعلق صرف جہاد سے ہے جس میں قتال ہوتا ہے۔ لیکن اس ہدایت کی اصل روح اور اس کا دائرہ اپنے پورے پس منظر اور محرکات کی رُو سے قتال کی مخصوص حالت سے کہیں زیادہ وسیع اور جامع ہے۔ یہ ہدایت دراصل اُس دائمی کیفیت کا نقشہ پیش کرتی ہے جو ہر آن مومن کے احساسات واعصاب پر، مومن کے ذہن وفکر پر اور اشیاء واشخاص اور واقعات واقدار کے بارے میں مومن کے نقطۂ نظر پر حاوی رہنی چاہیے۔ بالفاظ دیگر یہ ہدایت نفسیاتی تفوق واستیلاء کی اُس حالت کی نشان دہی کرتی ہے جس پر مومن کو ہمیشہ قائم رہنا چاہیے، خواہ کیسی ہی دعوت اور کیسے ہی حالات اسے اُس کا مقابلہ ہو، کیسے ہی لوگ اُس کی راہ میں حائل ہوں اور کیسی ہی اقدار اور پیمانوں کے خلاف وہ نبرد آزما ہو۔

ایمان کی یہ بلندی اور بالاتری اُن تمام اقدار کے بارے میں ظاہر ہونی چاہیے جو چشمۂ ایمان کے سوا کسی اور ماخذ ومنبع سے ماخوذ ہوں، دُنیا ان کی طاقتوں کے بارے میں بھی شاہراہِ ایمان سے منحرف ہیں

اور اُن دنیاوی پیمانوں کے بارے میں جو شجرِ ایمان سے نہیں پُھوٹے۔اسی طرح اس کا اظہار دنیا کی روایات کے بارے میں بھی ہونا چاہیے جو ایمان کے رنگ میں نہیں رنگی گئی ہیں اور دنیا کے ان قوانین واضوابط کے بارے میں بھی جن کی ساخت ایمان کے ہاتھوں نہیں ہوئی ہے۔ایمان کی یہ کیفیت ان تمام نظامہائے حیات کے بارے میں بھی نمایاں ہونی چاہیے جن کا خمیر بصیرت ایمانی نے تیار نہیں کیا ہے۔اس کا عکس مادّی کمزوری،عددی قلت اور ناداری میں بھی نظر آنا چاہیے اور مادّی طاقت،عددی کثرت اور خوش حالی کی حالت میں بھی۔ایمان کی طاقت بڑے سے بڑے سرکش اور منحرف طاقت سے بھی مات نہیں کھاتی،اور نہ کسی معاشرتی روایت اور باطل قانون کے آگے گھٹنے ٹیکنا جانتی ہے،یہ کسی ایسے نظام کے آگے سرِتسلیم خم بھی نہیں کرسکتی جو چاہے لوگوں میں کتنا ہی ہر دل عزیز ہو مگر نورِ ایمان سے محروم ہو،جہاد کے دوران ثابت قدمی اور پامردی اور صف شکنی کا مظاہرہ ایمانی قوت کے ان مختلف مظاہر میں سے صرف ایک کیفیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ کے اندر بیان فرمائی ہیں۔

ایمان کی بدولت پیدا ہونے والی طاقت اور قدرت محض ایک وقتی عزم اور ارادہ کا نتیجہ نہیں ہوتی،نہ یہ کسی عارضی جذبہ کے تحت بھڑک اٹھنے والی نخوت وحمیت کا کرشمہ ہے،اور نہ کسی ہنگامی جذبے کا کمال ہے ،بلکہ یہ طاقت وتفوق کی ایک ابدی کیفیت ہے اور اس غیر متزلزل اور دائمی حق پر مبنی ہے جو کائنات کے فطرت کے رگ وپے میں سمایا ہوا ہے۔اور جو طاقت کی منطق،ماحول کے تصور،معاشرے کی اصطلاح اور انسانی عرف سے زیادہ پائیدار اور طاقت ور ہے کیونکہ وہ اُس زندہ اللہ سے مربوط ہے جسے فنا نہیں۔

ایمانی قوت کے اثرات

معاشرے کے کچھ افکار ونظریات کی حکمرانی ہوتی ہے،کچھ ہمہ گیر روایات کا چلن ہوتا ہے،جن کی پشت پر اُس کا سخت گیرانہ دباؤ اور مضبوط معاشرتی زنجیریں ہوتی ہیں۔یہ حالات اُس شخص کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں جسے کسی طاقت ورہستی کی پناہ حاصل نہ ہو اور جو بغیر کسی مضبوط سہارے کے

معاشرے کو چیلنج کرتا ہے۔غالب افکار اور نظریات کے اپنے مخصوص اثرات اور تقاضے ہوتے ہیں جن سے اُس وقت تک چھٹکارا پانا دشوار ہوتا ہے جب تک کسی ایسی اعلیٰ وارفع حقیقت سے انسان کا رشتہ استوار نہ ہو جائے جس کی پناہ میں آجانے کے بعد یہ تمام افکار ونظریات اسے پرکاہ نظر آنے لگیں، اور جب تک کسی ایسے ذریعہ سے طاقت (Energy) حاصل نہ کی جائے جو ان افکار ونظریات کے ماخذ سے بالا دست، بااثر اور زیادہ قوی ووقادر ہو۔ جو شخص معاشرے کے عام بہاؤ کے مخالف رُخ پر کھڑا ہو جاتا ہے، معاشرے کے حکمران منطق کو چیلنج کرتا ہے، معاشرے کے عرف عام، اس کے مروجہ قوانین واقدار اور افکار ونظریات اور اُس کی گمراہیوں اور کجرویوں کے خلاف نبرآزما ہوتا ہے، وہ جب تک کسی ایسی ہستی کا سہارا نہیں لے گا جو انسانوں سے زیادہ قوی، پہاڑ سے زیادہ اٹل اور زندگی سے زیادہ عزیز ہو تو اُسے نہ صرف اپنی ناتوانی کا شدید احساس ہوگا بلکہ اس بھری پُری دنیا میں وہ اپنے آپ کو بالکل اجنبی اور بے کس بھی پائے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی شفیق ورحیم ذات مومن کو اس طرح میدان میں نہیں اتار دیتی کہ وہ یکّہ وتنہا معاشرے کا دباؤ سہتا رہے، اُس کے بوجھ تلے کراہتا رہے، رنج وملال اور بے کسی وبے بسی میں گھِرا رہے بلکہ اس کی طرف سے مومن کو یہ پیغام جانفزا پہنچتا ہے کہ: وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُم مُؤْمِنِيْنَ. یہ تعلیم اور ہدایت اُس کی دل شکستگی اور رنج دونوں کا مداوا بن کر آتی ہے۔ یہ دونوں وہ احساسات ہیں جو نامساعد حالات میں انسان پر بالعموم طاری ہو جاتے ہیں۔ لیکن مردِ مومن ان دونوں احساسات کو مجرد صبر وثبات سے نہیں بلکہ ایک جذبہ برتری اور نگاہ بلند سے دبا دیتا ہے۔ وہ ایک ایسے مقام بلند پر متمکن ہوتا ہے جہاں سے اسے طاغوتی طاقتیں، غالب اقتدار ، فروغ یافتہ افکار، دنیاوی دساتیر وقوانین اور رچی بسی عادات ورسوم اور گمراہی پر جمع ہونے والے عوام پست نظر آتے ہیں۔

مومن ہی غاصب و برتر ہے، اپنے سہارے کے لحاظ سے بھی اور ماخذ کے نقطۂ نظر سے بھی۔ اس کے نزدیک ملک وسلطنت کوئی وقعت رکھتے ہیں، نہ بڑی بڑی شخصیتیں کوئی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ مقبول

عام اقدار ومعیارات جنہیں ملک کے اندر عروج حاصل ہے اُس کی نگاہ میں ہیچ ہیں، عوام میں مقبول ومروّج نظریئے اور خیالات اُسے خیرہ نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے وہ اعلیٰ ترین ہستی ہے، وہ ہمیشہ اللہ کے سرمدی چشمہ سے اکتساب ہدایت کرتا ہے، وہ ہر معاملے میں اللہ کی طرف لپکتا ہے، اور ہر دم اُس کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن رہتا ہے۔

اِسلامی عقیدہ کی افضلیت وجامعیت

کائنات کی معرفت وادراک میں بھی مومن دوسروں سے اونچا اور فائق ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ایمان باللہ اور نظریۂ توحید اپنی اُس صورت میں جس میں اسلام انہیں پیش کرتا ہے کائنات کی عظیم حقیقت کی معرفت حاصل کرنے کی شاہ کلید ہے۔ چنانچہ نظریۂ توحید کائنات کی جو تصویر پیش کرتا ہے وہ اس قدر درخشاں، اجلی حسین اور متناسب ہے کہ جب ہم اُس کا موازنہ اُن تصورات وعقائد کے انباروں سے کرتے ہیں جو کائنات کے بارے میں ماضی وحال کے مرعوب کُن نظریات سے عبارت ہیں یا جو مشرکانہ مذاہب اور محرّف آسمانی ادیان کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں، یا جنہیں مکروہ مادہ پرستانہ تحریکوں نے جنم دیا ہے تو اسلامی عقیدہ کی عظمت ورفعت بالکل نکھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ چنانچہ جو لوگ کائنات کے بارے میں اس طرز کی معرفت کے حامل ہیں، لاریب وہ کائنات کی ساری مخلوقات سے اعلیٰ وافضل اور بالا وبرتر ہونے ہی چاہئیں۔

مومن اپنے اُس تصور میں دوسروں سے اُونچا اور فائق ہوتا ہے جو زندگی کی ان قدروں اور پیمانوں کے بارے میں وہ رکھتا ہے جن سے حیات اضافی، اس کے احوال ووقائع اور اشیاء واشخاص کی قیمت اور حیثیت متعین کی جاتی ہے۔ جو عقیدہ اللہ شناسی (ان الٰہی صفات کی روشنی میں جو اسلام بیان کرتا ہے) کی اساس پر قائم ہو اور اقدار ومعیارات کے اُن حقائق سے آگاہی کے نتیجے میں ظاہر ہو جو زمین کے اس چھوٹے سے کرّہ تک ہی محدود نہیں بلکہ پوری کائنات کو محیط ہیں ایسا عقیدہ فطرتاً مومن کو

قدروں اور پیمانوں کا ایک ایسا تصور عطا کرتا ہے جو ان ناقص اور غیر متوازن پیمانوں سے کہیں زیادہ اعلیٰ، پاکیزہ اور ٹھوس ہوتا ہے جو عام انسانوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں اور جن کا علم انتہائی محدود ہوتا ہے، اور جو ایک ہی نسل میں کئی بار اپنے پیمانے بدلتے ہیں، بلکہ ایک ہی قوم کے اندر بار بار بدلتے رہتے ہیں، بلکہ ایک ہی نعرہ کے بارے میں ان کے پیمانے صبح کچھ ہوتے ہیں اور شام کچھ اور۔

مومن اپنے احساس وضمیر اور اخلاق ومعاملات میں بھی نہایت راستباز اور انتہائی بلندیوں پر فائز ہوتا ہے۔ وہ جس اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ اسماء حسنیٰ اور بہترین صفات سے متصف ہے۔ یہ عقیدہ بذاتِ خود مومن کے اندر عظمت و رفعت، پاکیزگی وطہارت، اور عفت وتقویٰ کا احساس ابھارتا ہے۔ اور عمل صالح اور خلافت الٰہی کا صحیح مفہوم اس کے ذہن نشین کرتا ہے۔ مزید برآں یہ عقیدہ مومن کو یہ یقین محکم بھی عطا کرتا ہے کہ آخرت ہی اصل دارالجزاء ہے۔ اور وہاں نیک اعمال اور پاکیزہ زندگی کا جو اجر ملے گا اُس کے مقابلے میں دُنیا کی تکالیف وآلام ہیچ ہیں۔ یہ مومن کے ضمیر میں اطمینان وسکون کی ایک ایسی بہار پیدا کیے رکھتی ہے کہ اگر وہ عمر بھی دنیاوی مال ومتاع سے کلیتاً محروم رہے تو بھی اُسے کوئی شکایت نہیں ہوتی۔

مومن اپنے قانون اور نظامِ زندگی کی رُو سے بھی اعلیٰ وافضل ہے۔ انسان نے عہدِ قدیم سے لے کر آج تک جو شریعتیں اور جتنے نظامہائے زندگی وضع کیے ہیں مومن جب اُن کا جائزہ لیتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں برس کی یہ انسانی کاوشیں اسلام کی شریعت اور جامع نظام کے سامنے بچوں کے کھیل اور اندھوں کے ٹامک ٹوییے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ چنانچہ وہ اپنے اس مقام بلند پر کھڑا ہو کر جب بھٹکی ہوئی انسانیت کی بے چارگی اور شقاوت پر محبت آمیز اور درد بھری نگاہ ڈالتا ہے، تو اس کو سوائے اس بات کے کوئی اور چارہ نظر نہیں آتا کہ انسان کی سوختہ نصیبی اور گمراہی پر قابو پانے کے لیے اسے کچھ کرنا چاہیے۔

جاہلی نقطۂ نظر اور مومنانہ نقطۂ نظر

یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو صدرِ اوّل کے مسلمانوں نے جاہلیت کے ان تمام کھو کھلے مظاہر اور طاقتوں اور ان قوانین وروایات کے مقابلے میں اختیار کیا تھا جنہوں نے دورِ جاہلیت میں انسانوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ جاہلیت تاریخ کے کسی مخصوص دور کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص حالت کا نام ہے۔ اور ماضی اور حال میں جب کبھی انسانی سوسائٹی اسلام کی راہ راست سے منحرف ہوتی ہے جاہلیت کی یہ حالت عود کر آتی ہے۔ اور آئندہ جب بھی انسانیت راہ راست سے منحرف ہوگی، یہی حالت پیش آئے گی۔

جنگ قادسیہ میں ایرانی سپاہ کے نامور قائد رستم کے کیمپ میں جب حضرت مغیرہ بن شعبہ گئے اور انہوں نے وہاں جاہلیت کے رنگ ڈھنگ اور جلال وشکوہ کو دیکھا، اور اُس کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا ابو عثمان نہدی نے اُسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''جب مغیرہ بن شعبہ دریا کے پُل کو پار کر کے ایرانی فوج میں پہنچ گئے تو ایرانی سپاہیوں نے مغیرہ کو پاس بٹھالیا۔ اور رستم سے ان کی ملاقات کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے اپنی شکست کو چھپانے کے لیے اپنی زیب وزینت میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ مغیرہ آگے بڑھے۔ سب لوگوں نے اپنی مخصوص وردیاں پہن رکھی تھیں۔ سروں پر تاج تھے۔ سونے کے تاروں سے بُنا ہوا لباس زیب تن تھا۔ غالیچے چار چار سو قدم کے فاصلے تک بچھے ہوئے تھے۔ چار سو قدم غالیچوں تک چلنے کے بعد رستم تک پہنچا جاسکتا تھا۔ مغیرہ خیمے میں داخل ہوئے۔ ان کے بال چار حصوں میں گندھے ہوئے تھے۔ اندر پہنچتے ہی وہ رستم کے تخت پر چڑھ کر اُس کی مسند پر بیٹھ گئے۔ درباری یہ دیکھ کر فوراً مغیرہ پر جھپٹے اور انہیں نیچے گرا دیا۔ مغیرہ نے کہا: ہم تک تمہاری دانشمندی کی خبریں پہنچا کرتی تھیں مگر تم میں سے زیادہ کوئی بیوقوف نہیں ہوگا۔ ہم عربوں میں یہ اونچ نیچ نہیں ہے۔ ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو اپنا غلام نہیں بناتا اِلَّا یہ کہ وہ جنگ پر اتر آئے اور گرفتار ہو جائے۔ میرا گمان تھا کہ تم بھی اپنی قوم کی اُسی طرح مواسات کرتے ہوگے جس

طرح ہم کرتے ہیں۔تم نے جوحرکت اب کی ہےاس سےتو بہتر تھا کہ تم مجھے پہلے ہی یہ اطلاع کر دیتے کہ تم میں کچھ لوگ تمہارے لیے رب کا مقام رکھتے ہیں۔اور تمہارا نظام گڑ بڑ ہے۔میں تمہارے پاس خود سے نہیں آیا ہوں، بلکہ تمہارے بلانے پر آیا ہوں۔ یہاں آ کر آج مجھے معلوم ہوا کہ تمہارا نظام اضمحلال کا شکار ہے۔اور تم شکست کھا کر رہنے والے ہو۔ بے شک ایسے سلوک اور اس طرح کی ذہنیتوں کے بَل پر بادشاہت قائم نہیں رہا کرتی۔''

ربعی بن عامر نے بھی جنگ قادسیہ سے پہلے رستم اور اس کے درباریوں کے سامنے اس جراءت ایمانی اور بلند نگاہی کا رویہّ اختیار کیا تھا (ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں بیان کیا ہے):

''حضرت سعد ابی وقاص نے رستم کے پاس جو ایرانی افواج کا سپہ سالار تھا ربعی بن عامر کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ربعی بن عامر پہنچے تو دربار فرش فروش سے آراستہ تھا۔رستم یاقوت اور بیش بہا موتی زیب بدن کیے،بیش قیمت لباس پہنے،تاج سر پر رکھے سونے کے تخت کے سامنے بیٹھا تھا،ربعی بن عامر پھٹے پرانے لباس میں پہنچے،مختصر سی ڈھال،چھوٹا سا گھوڑا یہ ان کی حیثیت تھی،وہ گھوڑے پر سوار فرش کو روندتے ہوئے بڑھتے چلے گئے اور پھر گھوڑے سے اترے،قیمتی گاؤ تکیہ سے گھوڑا اے کو باندھ دیا،اور خود رستم کے پاس جانے لگے،آلات حرب کے ساتھ،سر پر خود اور جسم پر زرہ تھی۔لوگ بولے جنگی لباس تو اتار دو،کہنے لگے میں خود سے نہیں آیا ہوں، مجھے بلایا گیا ہے،اگر تم کو منظور نہیں تو ابھی واپس چلا جاتا ہوں۔رستم نے کہا: آنے دو،وہ اِسی فرش پر نیزہ ٹیکتے ہوئے بڑھے۔نیزے کی نوک نے فرش کو جابجا کاٹ دیا۔لوگ بولے تمہارا کیسے آنا ہوا۔بولے: ہم کو اللہ نے اسی لیے بھیجا ہے کہ جس کی مرضی ہو اس کو بندوں کی بندگی سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہنچادیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے چھٹکارا دلا کر اسلام کے عدل کے سایہ تلے لے آئیں۔''

اس کے بعد ایک انقلاب آتا ہے،اور مسلمان کا نقطۂ نگاہ مغلوبانہ اور مادّی طاقت سے تہی شخص کا ہوجاتا ہے۔مگر احساس برتری سے وہ محروم نہیں ہوتا۔اور اگر اس کے دل میں ایک شمعِ ایمان اب بھی روشن

ہے تو وہ غالب اقوام کو اپنے فروتر ہی دیکھے گا، اور اسے پختہ یقین ہوگا کہ مادّی محکومی ایک عارضی مرحلہ ہے جو آج نہیں تو کل ختم ہو جائے گا، ایمان کا لشکر بالآخر پانسہ پلٹ کر رکھ دے گا اور اُسے لازماً فتح حاصل ہوگی۔ اور بالفرض اگر یہ مرحلہ جان لیوا ثابت بھی ہو تو اپنی کمزوری کے باوجود مومن اس کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے گا۔ وہ اس یقین سے سرشار ہوتا ہے کہ دوسرے انسان تو معمول کی موت مرتے ہیں ، مگر اُسے شہادت کی موت نصیب ہوگی، وہ اس دنیا سے کُوچ کرے گا تو سیدھا اپنے رب کی جنت میں داخل ہوگا۔ جو لوگ آج اس پر غالب وقاہر ہیں وہ جب دنیا سے رُخصت ہوں گے تو عبرتناک جہنم اُن کا ٹھکانہ ہوگا۔ دونوں کے اس انجام میں زمین وآسمان کا بُعد ہے۔ انہی احساسات میں وہ مستغرق ہوتا ہے کہ اُسے اپنے ربّ کریم کا یہ فرمان سنائی دیتا ہے:

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ لٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ۝ (آل عمران:۱۹۶-۱۹۸)

ملکوں میں اللہ کے نافرمان لوگوں کی چلت پھر تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ محض چندروزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے، پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ کی طرف سے یہ سامانِ ضیافت ہے ان کے لیے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لیے وہی سب سے بہتر ہے۔

نگاہ بلند وسخنِ دلنواز

معاشرے پر ایسے عقائد وافکار واصول کو غلبہ ہوتا ہے جو مومن کے عقیدہ وفکر اور پیمانہ ومیزان کے منافی بلکہ شدید مخالف ہوتے ہیں۔مگر یہ احساس اس سے کبھی جدا نہیں ہوتا کہ وہ اعلیٰ وارفع مقام پر متمکن ہے اور یہ تمام دنیا پرست اور عیش کوش لوگ اس سے کہیں زیادہ فروتر مقام پر ہیں۔وہ اپنے اس بلند مقام سے ان لوگوں پر جب نگاہ دوڑاتا ہے تو ایک طرف وہ اپنی حد تک عزت نفس اور خودداری اور خود پسندی سے مملو ہوتا ہے اور دوسری طرف ان کے بارے میں اُس کا دل ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات سے لبریز ہوتا ہے۔اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ ہدایت کی جو روشنی اسے اللہ نے ارزاں فرمائی ہے انہیں بھی نصیب ہو اور جس اُفق بلند پر وہ خود محو پرواز ہے اُن کو بھی وہاں تک اُٹھا لائے۔

باطل ایک ہنگامہ محشر برپا کرتا ہے، ہاؤ ہو کا غلغلہ بلند کرتا ہے، گرجتا اور دھاڑتا ہے۔سینہ تانتا اور موچھوں کو تاؤ دیتا ہے، اُس کے چاروں طرف (تملق اور خوشامدیوں کی طرف سے) یا ایسا مصنوعی ہالہ قائم کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے انسانوں کی بصارت اور بصیرت دونوں پر پردہ پڑ جاتا ہے اور وہ یہ دیکھ ہی نہیں پاتا کہ اس خیرہ کن ہالہ کے پیچھے کیا گھناؤنی روح اور قبیح تصویر مستور ہے اور کیسی منحوس اور تاریک ''صبح'' پنہاں ہے!!۔مومن اپنے مقام بلند سے باطل اور اس کی ہنگامہ آرائیوں کو دیکھتا ہے ۔فریب خوردہ انسانی جماعتوں پر نظر ڈالتا ہے مگر وہ کسی احساسِ ضعف کا شکار نہیں ہوتا اور نہ اُسے کوئی رنج وغم لاحق ہوتا ہے۔اور نہ ہی حق پر اس کی ثابت قدمی میں کوئی کی، اور راہِ مستقیم پر اس کی استقامت میں کوئی تزلزل پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ گم کشتگان اور راہ فریب خوردہ انسانوں کی ہدایت کے لیے اُس میں جو تڑپ اور بے تابی پائی جاتی ہے اس میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

معاشرہ پست اور ذلیل خواہشوں میں ڈوبا ہوتا ہے۔سفلی جذبات کی رَو میں بہہ رہا ہوتا ہے، گندگی اور کیچڑ سے آلودہ ہوتا ہے، اس خیالِ خام میں مگن ہوتا ہے کہ وہ لذائذ زندگی سے محفوظ ہو رہا ہے اور بندھنوں سے آزاد ہو رہا ہے۔نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ معاشرے کے اندر پاکیزہ تفریح اور لقمۂ حلال کمیاب ہے بلکہ نایاب ہو جاتا ہے۔گندگی کے جوہڑوں کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہتی، جدھر دیکھو

غلاظت اور فضلات کے ندی نالے بہہ رہے ہوتے ہیں۔مومن کیچڑ کے اندر غرق ہونے والوں اور غلاظت سے چمٹے ہوئے انسانوں کو اُوپر سے جھانکتا ہے اور بایں ہمہ کہ وہ اس پُورے ماحول میں یکہّ وتنہا ہوتا ہے اُس کے حوصلوں میں کوئی احساسِ شکست اور اس کے قلب وجگر میں کوئی غم جاگزیں نہیں ہوتا۔اور اُس کے نفس میں یہ کبھی اکساہٹ پیدا نہیں ہوتی کہ اپنا پاکیزہ وبے داغ لباس اُتار کر وہ بھی ننگوں کے اس حمام میں ننگا ہوجائے اور اس متعفن تالاب میں غوطے لگانے لگے۔مومن جس نشۂ ایمان اور لذت یقین سے سرشار ہوتا ہے اُس کی بدولت وہ اپنے آپ کو بہت اعلیٰ وارفع مقام پر محسوس کرتا ہے۔

ایک ایسے معاشرے کے اندر جو دین سے باغی ہو، مکارم وفضائل سے عاری، اور اعلیٰ وبرتر قدروں سے خالی اور شریفانہ مہذب تقریبات سے ناآشنا ہو۔الغرض ہر اُس پہلو سے بے گانہ ہو چکا ہوتا ہو جو پاکیزگی وحسن اور طہارت ونفاست کی تعریف میں آسکتا ہے۔ایسے معاشرہ کے اندر مومن اپنے دین کا دامن اُسی طرح تھامے رکھتا ہے جس طرح کوئی شخص آگ کا انگارہ مُٹھّی میں لیے ہو۔رہے دوسرے لوگ تو وہ اس کی اس جراءت مندی پر پھبتیاں کستے ہیں، اس کے افکار کا تمسخر اڑاتے ہیں، اس کی محبوب اقدار کو نشانہ استہزاء بناتے ہیں۔مگر مومن ہے کہ یہ سب کچھ سنتا ہے، اور سہتا ہے مگر دون ہمتی اور کم حوصلگی کا شکار نہیں ہوتا، وہ احساس برتری کے ساتھ ان چھچھوروں پر نظر ڈالتا ہے اور اُس کی زبان پر وہی کلمات جاری ہوجاتے ہیں جو اس برگزیدہ گروہ کے ایک فرد حضرت نوح علیہ السلام کی زبان پر جاری ہوئے تھے جو تاریخ کی پُر خار اور طویل وادیوں میں ایمان وعشق کے نورانی اور غیر منقطع کارواں کے ہمراہ گزر چکے ہیں۔آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے تمسخر اڑانے والوں سے فرمایا تھا:

اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ. (هود:۳۸)

آج اگر تم ہماری ہنسی اڑاتے ہو تو ہم بھی تمہاری ہنسی اڑائیں گے جس طرح تم ہنسی اڑاتے ہو۔

مومن کو اس نورانی کارواں اور اس کے بالمقابل بدقسمت وسوختہ نصیب قافلہ دونوں کے انجام کا نقشہ اللہ تعالیٰ کے اس بیان میں نظر آ جاتا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اَجۡرَمُوۡا کَانُوۡا مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یَضۡحَکُوۡنَ ۝ وَ اِذَا مَرُّوۡا بِہِمۡ یَتَغَامَزُوۡنَ ۝ وَ اِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰۤی اَہۡلِہِمُ انۡقَلَبُوۡا فَکِہِیۡنَ ۝ وَ اِذَا رَاَوۡہُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوۡنَ ۝ وَ مَاۤ اُرۡسِلُوۡا عَلَیۡہِمۡ حٰفِظِیۡنَ ۝ فَالۡیَوۡمَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنَ الۡکُفَّارِ یَضۡحَکُوۡنَ ۝ عَلَی الۡاَرَآئِکِ یَنۡظُرُوۡنَ ۝ ہَلۡ ثُوِّبَ الۡکُفَّارُ مَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ ۝ (المطففین:۲۹-۳۶)

بے شک مجرم (دنیا میں) ایمان والوں کے ساتھ ہنسی کیا کرتے تھے۔ اور جب اُن کے پاس سے ہو کر گزرتے تو ان سے آنکھیں مارتے۔ اور جب اپنے اہل کی طرف لوٹ کر جاتے تو (مسلمانوں کے تذکروں کا) مشغلہ بناتے۔ اور جب مسلمانوں کو دیکھتے تو بول اُٹھتے کہ بے شک یہ لوگ گمراہ ہیں۔ حالانکہ انہیں (مسلمانوں پر) داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ آج (آخرت میں) مسلمان کافروں پر ہنسیں گے اور تختوں پر بیٹھے نظارہ کر رہے ہوں گے۔ کیا کافروں نے اب کیے کا بدلہ پا لیا؟

اس سے پہلے بھی قرآن کریم نے ہمارے سامنے کافروں کا یہ قول نقل کیا ہے جو وہ اہلِ ایمان سے کہا کرتے تھے:

وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا ۙ اَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ خَیۡرٌ مَّقَامًا وَّ اَحۡسَنُ نَدِیًّا. (مریم:۷۳)

ان لوگوں کو جب ہماری کُھلی کُھلی آیات سنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں: بتاؤ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلسیں زیادہ شاندار ہیں۔

یعنی دونوں فریقوں میں سے کون سا فریق اچھا ہے وہ مکھیا اور سردار اور مالدار لوگ جو محمد (ﷺ) پر ایمان نہیں لاتے یا وہ نادار اور بے کس لوگ جو آنجناب ﷺ کے گرد جمع ہیں، نصر بن حارث، عمرو بن ہشام ، ولید بن مغیرہ اور ابوسفیان بن حرب جیسے اکابر قوم یا بلال، عمار، صہیب اور خبّاب جیسے بے سہارا افراد؟ اگر محمد (ﷺ) کی دعوت کوئی بھلی دعوت ہوتی تو کیا آپ کے پیروکار ایسے ہی بدحال لوگ ہوتے جنہیں قریش کے اندر کوئی دبدبہ اور وقار حاصل نہیں؟ آپس میں مل بیٹھنے کے لیے ایک معمولی سے مکان (دارارقم) کے سوا انہیں کوئی اور جگہ بھی میسر نہیں، جب کہ اُن کے مخالفین ایک عظیم الشان اور پرشکوہ چوپال کے مالک ہیں۔ جاہ وجلال ان کے قدم چومتا ہے، قوم کی ناخدائی ان کو حاصل ہے۔ یہ ہے دُنیا پرستوں کا نقطۂ نگاہ اور ان لوگوں کا طرز فکر جن کی نگاہوں پر ہر زمانے اور ہر جگہ میں پردے پڑے رہے اور بلندیوں کو دیکھ نہ سکے۔ یہ حکمت الٰہی کا فیصلہ ہے کہ عقیدہ وایمان دنیاوی زیب وزینت اور ظاہری مینا کاری اور سجاوٹ سے محروم اور اسباب تحریص وترغیب سے پاک رہے گا۔ اسے قبول کرنے کا محرّک کسی حاکم کا تقرّب، کسی جاہ واقتدار کی حرص۔ کوئی مرغوب نعرہ اور کسی خواہش کی تسکین نہ ہوگی۔ بلکہ جہد ومشقت، جانکاہی وجہاد اور سردھڑ کی بازی لگا دینے کا جذبہ اس کا اصل محرک ہوگا۔ تاکہ جو اس کوچہ میں آئے وہ اس یقین کے ساتھ آئے کہ وہ اس نظریئے کو بحیثیت عقیدہ قبول کررہا ہے، وہ اس کو کسی انسان کی خوشنودی کے لیے نہیں بلکہ خالصتاً اللہ کی رضا جوئی کے لیے قبول کرے اور ان تمام لالچوں اور داعیات سے بری ہو جن پر عام انسان فریفتہ ہوتے ہیں۔ تاکہ اس عقیدہ کو کوئی ایسا شخص اپنانے کی جراءت ہی نہ کر سکے جو دنیاوی منفعتوں کا طالب ہو، بندۂ حرص وآزاد ہو، جاہ وحشمت اور ٹھاٹھ باٹھ کا پُجاری ہو، اور جس کے نزدیک انسانی تصورات اللہ کی مرضی اور خوشنودی کے مقابلے میں زیادہ وقیع ہوں، خواہ اللہ کے نزدیک وہ قطعاً بے وقعت ہوں۔

مومن کی شان

مومن اپنی اقدار ونظریات اوراپنے پیمانے اور باٹ انسانوں سے نہیں لیتا کہ اُسے انسانوں کے اندازوں کے پیچھے پیچھے چلنے کی حاجت محسوس ہو۔ بلکہ وہ انسانوں کے ربّ سے لیتا ہےاور وہی اُس کے لیے کافی ووافی ہوتا ہے۔ وہ مخلوق کی مرضی اور خواہشات کو بھی اپنے لیے معیار نہیں بناتا کہ اُسے مخلوق کی خواہشات کے ساتھ لڑھکتے رہنے کی ضرورت ہو، بلکہ اس کا ماخذ وہ میزان حق ہوتی ہے جس میں کوئی تغیر نہیں ہوتا اور جو کبھی اِدھر اُدھر ڈانوں ڈول نہیں ہوتی ۔ وہ ان سب چیزوں کو اس محدود فانی دنیا سے نہیں لیتا بلکہ یہ ان ابدی چشموں سے اُبل کر اس کے ضمیر کو منور کرتی ہیں جہاں سے ساری کائنات کا خلعت وجود ملا ہے۔ تو پھر وہ اپنے اندر کوئی کمزوری اوراپنے دل میں کوئی حزن وملال کیوں کر محسوس کرسکتا ہے جب اس کا سررشتہ پروردگارِ عالم سے، میزانِ حق سے اور سرچشمۂ کائنات سے استواراور وابستہ ہے؟

وہ حق پر ہے۔ حق کو چھوڑنے کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا اس کے ہاتھ لگ سکتا ہے؟ ضلال کے پاس اگر جاہ واقتدار اور دبدبہ وطنطنہ ہے۔ اگر طبلچی اور ڈھنڈورچی اور عوام کے غول اس کے جلو میں ہیں، تو ہوا کریں ان سے حق میں رائی بھر بھی تغیر واقع نہیں ہوسکتا۔ مومن حق پر ہے، حق کو چھوڑ کر سوائے ضلال کے کچھ نہیں مل سکتا۔ پس مومن اگر کھرا مومن ہے تو وہ ہرگز حق کے بجائے باطل کا انتخاب نہیں کرسکتا ۔اور حق کے عوض ضلال کا سودا نہیں کرسکتا۔ حالات چاہے کچھ ہوں، مومن سے یہ توقع کہ وہ حق کے بجائے باطل کا انتخاب کرے گا، عبث ہے:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّاب ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّارَيْبَ فِيْهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۝ (آل عمران: ٨-٩)

اے ہمارے پروردگار! جب تو ہمیں سیدھے رستہ پر لگا چکا ہے، تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجیو۔ ہمیں اپنے خزانہ فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاض حقیقی ہے۔ اے پروردگار تو یقیناً سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنے والا ہے، جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ بے شک اللہ ہرگز اپنے وعدہ سے ٹلنے والا نہیں ہے۔

❀❀❀❀❀

باب دوازدھم

وادیٔ پرخار

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ، وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ، وَشَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ، قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ، النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ، اِذْهُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ،وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ، وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّا اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ، اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوْا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ، اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ، ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ، اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ، اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ، وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ، ذُوْالْعَرْشِ الْحَمِيْدُ، فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ. (البروج:۱تا۱۹)

قسم ہے بُرجوں والے آسمان کی۔قسم ہے اُس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔قسم ہے گواہی دینے والے کی اوراس کی جس کے مقابلے میں گواہی دی گئی۔کہ مارے گئے خندقوں والے ،آگ کی خندقیں جن میں انہوں نے بہت سا ایندھن جھونک رکھا تھا۔اور وہ خندقوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور اہل ایمان کے ساتھ جو (ظلم وستم)وہ کررہے تھے اُس کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔وہ اہلِ ایمان کی اس بات سے برافروختہ تھے کہ وہ اُس اللہ پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اورسزاوارحمد ہے۔اوراُس کی

بادشاہت ہے آسمانوں اور زمینوں کی،اور اللہ ہر چیز کے حال سے واقف ہے۔ بے شک جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذائیں دیں اور پھر توبہ نہ کی ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے۔البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اُن کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ بے شک تیرے رب کی گرفت بڑی سخت ہے ۔وہی ہے جو اوّل بار پیدا کرتا ہے اور وہی ہے جو (قیامت کے روز) دوبارہ پیدا کرے گا۔اور وہ بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے۔عرش کا مالک ہے اور عالی شان ہے۔ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔

قصہ اصحاب الاخدود کے اسباق

اصحاب الاخدود کا قصہ جو سورۃ البروج میں بیان ہوا ہے، اِس لائق ہے کہ اس پر وہ تمام اہلِ ایمان غور وتدبر کریں جو دنیا کے کسی بھی خطے میں اور تاریخ کے کسی بھی عہد میں دعوت اِلی اللہ کا کام کر رہے ہوں ۔قرآن نے اس قصہ کو جس طرح بیان کیا ہے،جس انداز سے اس کی تمہید قائم کی ہے اور پھر اس پر جو تبصرے کیے ہیں اور ساتھ ساتھ جو تعلیمات اور فیصلے بیان کیے ہیں ان سب باتوں کے ذریعہ قرآن نے درحقیقت وہ بنیادی خطوط اجاگر کیے ہیں جو دعوت الی اللہ کی فطرت ،اس دعوت کے بارے میں انسانوں کے رویے اور ان امکانی حالات کی نشان دہی کرتے ہیں جو اس کی وسیع دنیا میں جس کا رقبہ کرہ ارضی سے زیادہ وسیع اور جس کا عرصہ دنیاوی زندگی سے زیادہ طویل ہے۔پیش آسکتے ہیں ۔قرآن نے اس قصہ میں اہلِ ایمان کے سامنے اُن کے راستے کے نمایاں نقوش بھی واضح کر دیئے ہیں،اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ وہ اس راہ میں پیش آنے والی ہر امکانی مصیبت کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کریں جو پردۂ غیب میں مستور و پنہاں، حکمت الٰہی کے تحت تقدیر کی طرف سے صادر ہو۔

اہل ایمان کی فتح

یہ ایک ایسی جماعت کا قصہ ہے جو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئی تھی اور اُس نے اپنے سچے ایمان کا صاف صاف اظہار کرنا چاہا۔ مگر اُسے جابر اور سخت گیر دشمنوں کے ہاتھوں شدید مصائب کا نشانہ بننا پڑا جو انسان کے اس بنیادی حق کو پامال کرنے پر تُلے تھے جو اُسے عقیدۂ حق اختیار کرنے اور خدائے عزیز وحمید پر ایمان رکھنے کے لیے حاصل ہے۔ اور انسانوں کے اُس شرف کی دھجیاں اُڑا رہے تھے جس سے اللہ نے انسان کو خاص طور پر نواز رکھا ہے تا کہ وہ دنیا میں ایک کھلونا بن کر نہ رہ جائے کہ ظالم وسنگدل حکام اُس کو عذاب دے دے کر اُس کی آہوں اور چیخوں سے اپنا دل بہلائیں، اُسے آگ میں بھونیں اور اپنے لیے تفریح اور لطف اندوزی کا سامان پیدا کریں۔ یہ نفوس قدسیہ ایمان وعقیدہ کے جس جذبہ سے سرشار تھے اُس کی بدولت وہ اس آزمائش میں پورے اُترے اور جس امتحان میں انہیں ڈالا گیا اُس میں بالآخر فانی زندگی نے عقیدے کے ہاتھوں شکست کھائی۔ چنانچہ یہ لوگ ان جباروں اور ظالموں کی کسی دھمکی اور دباؤ سے مرعوب ومتأثر نہیں ہوئے۔ آگ کے عذاب میں جل کر موت کی آغوش میں چلے گئے مگر اپنے دین سے سرمو ہٹنے کے لیے بھی تیار نہ ہوئے۔ درحقیقت یہ پاکیزہ نفوس دُنیا کی حیات مستعار کی محبت وپرستش سے آزاد ہو چکے تھے۔ اسی لیے بہیمانہ موت کا بچشم سر مشاہدہ کرنے کے باوجود زندہ رہنے کی خواہش انہیں ترک عقیدہ کی ذلت قبول کرنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ وہ عالم سفلی کی بندشوں اور اسباب کشش سے نجات پا کر عالم علوی کی طرف پرواز کر گئے۔ یہ فانی زندگی پر ابدی عقیدہ کی فتح کا کرشمہ تھا۔

اصحاب الاخدود کا جانوروں سے بدتر گروہ

ان ایمان سے معمور بلند فطرت، صالح اور پیکر شرافت نفوس کے بالمقابل باغی، سرکش، لئیم اور مجرم انسانوں کی منڈلی تھی جو آگ کے الاؤ کے پاس بیٹھ کر ان کے جلنے کا تماشہ دیکھ رہی تھی کہ اہلِ ایمان

کیسے تڑپتے اور کیسے دکھ سہتے ہیں۔ وہ اس منظر سے لُطف اندوز ہورہے تھے کہ آگ جیتے جاگتے انسانوں کو کس طرح چاٹتی ہے اور اس طرح یہ گروہ شرفاء چشم زدن میں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوتا ہے۔

جب کسی نوجوان یا دوشیزہ، بچی یا بوڑھی، کمسن یا سال خوردہ مومن کو آگ میں لاکر جھونکا جاتا تو ان درندوں کی بدمستی بڑھ جاتی اور خون کے فواروں اور گوشت کے ٹکڑوں کو دیکھ کر وہ پاگلوں کی طرح ناچتے اور شور مچاتے۔ یہ انسانیت سوز واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ ان بدبخت ظالموں کی جبلت اس حد تک مسخ اور خاک آلودہ ہوچکی تھی کہ ان کے لیے یہ بہیمانہ اور خوفناک عذاب سامان لطف ووجۂ لذت تھا۔ گراوٹ کی یہ وہ انتہاء ہے کہ جنگل کا کوئی درندہ بھی اب تک اس حد تک نہیں پہنچ سکا۔ اس لیے کہ وہ درندہ اگر شکار کرتا ہے تو خوراک حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے نہ کہ اپنے نیم جان **نخچیر** کو پھڑ پھڑاتا دیکھ کر لذت حاصل کرنے کے لیے۔ اور ساتھ ہی یہ واقعہ اس امر کا پتہ بھی دیتا ہے کہ اللہ پرست اہلِ ایمان کی رُوحوں نے اس آزمائش میں کس طرح اس اوج کمال تک کو جا چھوا اور ہر زمانے میں انسانیت کا نقطۂ عروج سمجھا گیا ہے۔

اس معرکے کس کو فتح نصیب ہوئی

دنیا کے پیمانے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ظلم نے عقیدہ پر فتح پائی اور صالح وصابر اور اللہ پرست گروہ کی ایمانی قوت جو بلاشبہ نقطۂ کمال تک پہنچ چکی تھی اس ظلم وایمان کے معرکے میں بے وزن وبے وقعت ثابت ہوئی۔ نہ ہی قرآن یہ بتاتا ہے اور نہ وہ روایات ہی یہ بتاتی ہیں جو اس واقعہ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان ظالموں کو بھی ان کے جرم شدید کی اسی طرح سزا دی ہو، جس طرح قوم نوح علیہ السلام، قوم ہود علیہ السلام، قوم صالح علیہ السلام، قوم شعیب علیہ السلام اور قوم لوط علیہ السلام کو دی ہے یا جس طرح فرعون اور اس کے لشکریوں کو پوری قاہرانہ ومقتدرانہ شان کے ساتھ پکڑا

تھا۔ گویا دنیا پرست کے نقطۂ نظر سے اس واقعہ کا اختتام بڑا افسوس ناک اور الم انگیز ہے۔
مگر کیا بات صرف یہیں پر ختم ہو جاتی ہے؟ کیا ایمان کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ جانے والی اللہ پرست جماعت ان زہرہ گداز آلام کے نتیجے میں آگ کی خندقوں میں راکھ بن کر ملیا میٹ ہوگئی اور گروہ مجرمین جو رذالت اور کمینگی کی آخری حد کو پھلانگ چکا تھا، وہ دنیا میں سزا سے صاف بچ گیا۔ جہاں تک دنیاوی حساب کا تعلق ہے اس افسوس ناک خاتمے کے بارے میں دل میں کچھ خلش سی اُٹھتی ہے۔ مگر قرآن اہلِ ایمان کو ایک دوسری نوعیت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کے سامنے ایک اور ہی حقیقت کی پردہ کُشائی کرتا ہے۔ وہ ان کو ایک نیا پیمانہ دیتا ہے جس سے وہ اشیاء کا صحیح وزن جانچ سکیں اور حق و باطل کے جن معرکوں سے دوچار ہوتے ہیں ان کی اصل حقیقت اور اصل میدان سے آگاہ ہو سکیں۔

کامیابی کا اصل معیار

دنیا کی زندگی اور اس کی آسائشیں اور تکلیفیں، کامرانیاں اور محرومیاں ہی کارزارِ حیات میں فیصلہ کن نہیں ہیں۔ یہی وہ مال نہیں ہے جو نفع اور نقصان کا حساب بتا سکے۔ نصرت صرف ظاہری غلبہ کا نام نہیں ہے بلکہ یہ نصرت کی بے شمار صورتوں میں سے محض ایک صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی میزان فیصلہ میں اصل وزن عقیدہ کا ہے۔ اور اللہ کی منڈی میں جس مال کی کھپت ہے وہ صرف ایمان کی متاع ہے۔ نصرت کی اعلیٰ ترین شکل یہ ہے کہ روح مادہ پر غالب آجائے، عقیدہ کو رنج و محن پر کامیابی حاصل ہو اور آزمائش کے مقابلے میں ایمان فتح یاب ہو جائے۔ چنانچہ اصحاب الاخدود کے واقعہ میں اہلِ ایمان کی روح نے خوف و کرب پر دنیا کی ترغیبات پر زندگی کی محبت پر اور کڑی آزمائش پر وہ عظیم فتح پائی ہے کہ رہتی دنیا تک وہ بنی نوع انسان کے لیے طرۂ افتخار رہے گی یہی ہے اصل کامیابی۔

مومن کی موت بجائے خود اعزاز ہے

سب انسان موت کی آغوش میں جاتے ہیں۔ مگر اسباب موت مختلف ہوتے ہیں، لیکن سب انسانوں کو

کامیابی نصیب نہیں ہوتی، نہ سب اتنا اونچا معیارِ ایمان پیش کر سکتے ہیں، نہ ہی اس حد تک کامل آزادی حاصل کر سکتے ہیں، اور نہ وہ اتنے اُونچے اُفق تک پرواز کر سکتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہوتا ہے کہ وہ ایک مبارک گروہ کو اپنے بندوں میں سے چھانٹ لیتا ہے جو مرنے میں تو دوسرے انسانوں کے ساتھ شریک ہوتا ہے مگر ایسا شرف و اعزاز اس کو نصیب ہوتا ہے جو دوسرے لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہ شرف و اعزاز اُسے ملاءِ اعلیٰ میں ملتا ہے۔ بلکہ اگر پے در پے آنے والی نسلوں کے نقطۂ نظر کو بھی حساب میں شامل کر لیں تو خود دنیا کے اندر بھی ایسا مبارک گروہ شرف و اعزاز کا مرتبۂ بلند حاصل کر لیتا ہے۔

ان مومنین نے انسانی نسل کی لاج رکھی ہے

مؤمنین ایمان ہار کر اپنی جانوں کو بچا سکتے تھے۔لیکن اس میں خود ان کا اپنا کتنا خسارہ ہوتا اور پُوری انسانیت کو کس قدر خسارہ پہنچتا، یہ کتنا بڑا خسارہ تھا کہ اگر وہ اس روشن حقیقت کو پامال کر دیتے کہ زندگی ایمان سے خالی ہو تو وہ ایک کوڑی کی بھی نہیں رہتی ،نعمتِ آزادی سے تہی ہو تو قابلِ نفرین ہے اور اگر ظالم و نافرمان لوگ اس حد تک جری ہو جائیں کہ جسموں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد دلوں اور رُوحوں پر بھی حکمرانی کرنے لگیں تو یہ زندگی انتہائی گراوٹ ہے!! یہ وہ پاکیزہ حقیقت ہے جسے اہلِ ایمان نے اسی وقت پا لیا تھا جب کہ وہ ابھی دنیا میں موجود تھے، جب آگ ان کے جسموں کو چُھو رہی تھی تو وہ اس عظیم حقیقت اور پاکیزہ اصول پر کاربند تھے۔ان کے فانی جسم آگ سے جل رہے تھے اور یہ عظیم اور پاکیزہ اصول کامیابی کا لوہا منوا رہا تھا بلکہ آگ اسے مزید نکھار کر کُندن بنا رہی تھی۔

حق و باطل کی کشمکش کا فریق اور میدان

حق و باطل کے معرکہ کا میدان صرف اس دنیا کا اسٹیج نہیں ہے۔اور زندگی صرف اسی دنیاوی زندگی کا نام نہیں ہے۔شرکائے معرکہ صرف وہ لوگ ہی نہیں ہیں جو اس نسل سے تعلق رکھتے ہوں جس میں معرکہ برپا ہو۔دنیا کے تمام واقعات میں خود ملاءِ اعلیٰ شریک ہوتے ہیں، ان کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ان پر گواہ

رہتے ہیں، انہیں اسی میزان میں تولتے ہیں جو کسی خاص وقت اور نسل کی دنیاوی میزان سے مختلف ہوتی ہے، بلکہ پوری انسانی نسل کی میزانوں سے وہ مختلف ہے۔ایک وقت میں دنیا میں زمین پر جتنے انسان پائے جاتے ہیں ملاء اعلیٰ اُس سے کئی گناہ زیادہ مبارک ارواح پر مشتمل ہیں۔پس بلا شبہ لشکرِ حق پر ملاء اعلیٰ کی ستائش و تکریم اہلِ دنیا کے فیصلوں ،اندازوں اور عزت افزائیوں سے کہیں زیادہ عظیم اور وزنی ہوتی ہے۔

ان تمام مراحل کے بعد آخرت بھی ہے یہ اصل اور فیصلہ کُن میدان ہے۔دنیا کا اسٹیج اسی میدان سے متصل ہے، منفصل نہیں ہے،امر واقع کے اعتبار سے بھی اور مومن کے احساس وشعور کے لحاظ سے بھی ۔پس معرکۂ حق و باطل دنیا کے اسٹیج پر ہی تمام نہیں ہوجاتا،اس کے حقیقی خاتمہ کا مرحلہ تو ابھی آیا ہی نہیں ۔دنیا کے اس اسٹیج پر اس معرکے کا جو حصہ پیش کیا گیا ہے صرف اُس پر حکم لگانا صحیح اور منصفانہ نہیں ہے ۔اس لیے کہ اس کا اطلاق معرکے کے صرف چند معمولی ادوار پر ہوگا۔

اہلِ ایمان کے اِنعامات

پہلی قسم کی نگاہ (جس کے نزدیک ہر چیز کا فیصلہ دنیا کے اسٹیج پر ہی ہوتا ہے) کوتاہ، سطح بین اور محدود ہے۔یہ عجلت پسند انسان کی نگاہ ہے۔دوسری قسم کی نگاہ دُور اندیش حقیقت شناس، جامع اور وسیع تر ہے ،قرآن اہلِ ایمان کے اندر یہی نگاہ پیدا کرتا ہے۔یہی نگاہ اس حقیقت کی صحیح ترجمان ہے جس پر صحیح ایمانی تصور کی عمارت قائم ہے۔اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے ایمان واطاعت میں ثابت قدم رہنے' آزمائش وامتحان میں کامیاب اُترنے اور زندگی کی فتنہ پردازیوں پر فتح پانے پر جس صلہ اور ایمان کا وعدہ فرما رکھا ہے، وہ اہلِ ایمان کے لیے طمانیت قلب کا سامان فراہم کرتا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ ، اَلَا بِذِکْرِاللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ. (الرعد)

''جولوگ ایمان لائے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے

۔آ گاہ رہو، اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے''۔

وہ صلہ رحمان کی خوشنودی اور محبت کے وعدہ پر مشتمل ہے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجۡعَلُ لَهُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا. (مریم:٩٦)

''جولوگ ایمان لے آئے اور انھوں نے عمل صالح کیے عنقریب رحمان اُن کے لیے

دلوں میں محبت پیدا کر دے گا''۔

وہ ملاء اعلیٰ کے اندر ذکر خیر کا وعدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی بندے کا بچہ مر جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے دریافت فرماتا ہے کہ تم نے میرے فلاں بندے کے بچے کی روح قبض کر لی ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں: ''ہاں'' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تم نے میرے بندے کے لختِ جگر کی روح قبض کر لی ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں: ''ہاں اے پروردگار'' اللہ تعالیٰ اُن سے پوچھتا ہے کہ: ''اس موت پر میرے بندے نے کیا کہا؟ فرشتے کہتے ہیں: اُس نے آپ کی حمد فرمائی اور ''اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيۡهِ رَاجِعُوۡن '' کہا۔ یہ سن کر اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ میرے اس بندے کے لیے جنت میں ایک گھر بنادو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔ (ترمذی)

نیز رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے۔ میں اپنے بندے کے لئے وہی کچھ ہوں جو میرے بارے میں وہ گمان رکھتا ہے۔ جب وہ میرا ذکر کرتا ہے تو میں اُس کے ساتھ ہوتا ہوں، اگر وہ اپنے دل میں مجھے یاد کرتا ہوں تو میں بھی دل میں اُسے یاد کرتا ہوں، اور اگر وہ لوگوں کے اندر میرا ذکر کرتا ہے تو میں اُن سے بہتر گروہ میں اُس کا ذکر کرتا ہوں۔ اگر وہ ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے تو میں ایک ہاتھ اُس کے قریب ہوتا ہوں، اگر وہ ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے تو میں اُس کی طرف ایک قدم بڑھتا ہوں۔ اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اُس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں۔ (بخاری ومسلم)

یہ وعدہ ہے اس بات کا کہ ملاء اعلیٰ اہلِ ایمان کے لیے دعا گو ہیں اور اُن کے ساتھ گہری دلچسپی اور ہمدردی رکھتے ہیں۔

اَلَّذِیۡنَ یَحۡمِلُوۡنَ الۡعَرۡشَ وَمَنۡ حَوۡلَهٗ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ وَیُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ وَیَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا رَبَّنَا وَسِعۡتَ كُلَّ شَیۡءٍ رَّحۡمَةً وَّ عِلۡمًا فَاغۡفِرۡ لِلَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَاتَّبَعُوۡا سَبِیۡلَكَ وَقِهِمۡ عَذَابَ الۡجَحِیۡمِ. (المؤمن:۷)

''عرش الٰہی کے حامل فرشتے، اور وہ جو عرش کے گردوپیش حاضر رہتے ہیں، سب اپنے ربّ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائیں مغفرت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب، تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے، پس معاف کردے اور عذاب دوزخ سے بچالے ان لوگوں کو جنھوں نے توبہ کی اور تیرا راستہ اختیار کرلیا ہے''۔

یہ وعدہ ہے اس بات کا کہ شہداء کے لئے اللہ کے پاس زندگی جاوید ہے۔

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ، فَرِحِیۡنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ وَ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ خَلۡفِهِمۡ اَلَّا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ، وَیَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِنِعۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضۡلٍ وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ. (آل عمران:۱۶۹ تا ۱۷۱)

''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مُردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں۔ اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اُس پر خوش وخرم ہیں۔ اور مطمئن ہیں۔ کہ جو اہلِ ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے

۔وہ اللہ کے انعام اوراس کے فضل پر شاداں وفرحاں ہیں اوران کو معلوم ہو چکا ہے کہ
اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا''۔

باغیوں کا انجام

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پے در پے یہ وعید سُنائی ہے کہ وہ جھٹلانے والوں ،ظالموں اور سرکشوں اور مجرموں کو آخرت میں پکڑے گا اور دُنیا میں ایک مدّت مقرر تک ان کی رسی ڈھیلی چھوڑے گا اور انہیں مہلت دے گا۔اگر چہ ان میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ نے کبھی کبھی دنیا میں بھی پکڑ لیا ہے۔لیکن اصل سزا کے لیے آخرت ہی پر زور دیا گیا ہے:

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاوٰهُمْ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمِهَادُ. (آل عمران:١٩٦ تا ١٩٧)

''ملک کے اندر اللہ کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکہ میں نہ ڈالے ۔یہ چند روزہ زندگی کا لُطف ہے' پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا جو بہت بُری جائے قرار ہے''۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ، اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ، مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌ.

''یہ ظالم لوگ جو کچھ کررہے ہیں اللہ کو تم اس سے غافل نہ سمجھو۔اللہ تو انہیں ٹال رہا ہے اُس دن کے لیے جب یہ حال ہوگا کہ آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئی ہیں۔سر اُٹھائے بھاگے چلے جارہے ہیں،نظریں اُوپر جمی ہیں اوردل اڑے جاتے ہیں''۔

فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ، يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ

مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰی نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ، خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِیْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ.(معارج:۴۲تا۴۴)

''انہیں بے ہودہ باتیں اور کھیل کرنے دو یہاں تک کہ آخرکار وہ دن آموجود ہو جس کا وعدہ ان سے کیا گیا ہے۔وہ دن جب کہ یہ قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے اور اس طرح دوڑ رہے ہوں گے کہ گویا وہ کسی استھان کی طرف لپک رہے ہیں۔ان کی نظریں جُھکی ہوں گی ذِلّت چہروں پر چھارہی ہوگی،یہی تو وہ دن ہوگا جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا''۔

علیٰ ہذاالقیاس انسانی زندگی کا ملاءاعلیٰ کی زندگی سے رشتہ قائم ہے۔اور دُنیا کا آخرت سے۔لہٰذا خیر وشر کا معرکہ حِق وباطل کی آویزش اور ایمان وبغاوت کی کشمکش کا سارامدار صرف دنیا کے اسٹیج پر نہیں ہے،اور نہ یہ معاملہ دنیاوی زندگی کے اندر ہی انجام پذیر ہوتا ہے۔اور نہ دنیاوی زندگی ہی کے اندر اس کا فیصلہ سُنایا جاتا ہے۔دنیاوی زندگی اور اس سے وابستہ تمام راحتیں اور تکلیفیں یا لذتیں اور محرومیاں ہی اللہ کی میزان فیصلہ کا اصل وزن نہیں ہیں۔اس حقیقت کی رُو سے معرکۂ خیر وشر کا میدان بھی بڑا وسیع ہے،اور عرصہ بھی بڑا وسیع ہے۔اور کامیابی اور ناکامی کے پیمانے اور اوزان کا دائرہ بھی بڑا وسیع ہے۔اسی بنا پر مومن کے فکر ونظر کے آفاق میں غیر معمولی پھیلاؤ آجاتا ہے اور اس کی دلچسپیاں اور توجہات بھی اونچے درجے کی ہوجاتی ہیں۔اور یہ دنیا اور اس کی رعنائیاں اور یہ زندگی اور اس کے لوازم اُس کی نگاہ میں حقیر اور بے وقعت ہوکر رہ جاتے ہیں۔اور جس قدر اُس کے فکر ونظر کے زاویے بلند ہوتے جاتے ہیں اُس کے درجات میں بلندی ہوتی جاتی ہے۔ایسا وسیع ہمہ گیر اور پاکیزہ وبلند تر ایمانی تصور پیدا کرنے کے لیے اصحاب الاخدود کا قصہ چوٹی کی مثال ہے۔

مکذبین کے مختلف انجام

اصحاب الاخدود کے قصہ اور سورۂ بروج سے دعوت الیٰ اللہ کے مزاج اور ہر امکانی صورتِ حال کے بارے میں داعی کے موقف پر ایک اور پہلو سے بھی روشنی پڑتی ہے۔ دعوت الیٰ اللہ کی تاریخ نے دنیا کے اندر دوسری گوناگوں اور بوقلموں ودعوتوں کے مختلف خاتمے دیکھے ہیں۔

اس نے قوم نوح علیہ السلام، قوم ہود علیہ السلام، قوم شعیب علیہ السلام اور قوم لوط علیہ السلام کی ہلاکت و بربادی دیکھی ہے۔ اور معدودے چند اہل ایمان کی نجات بھی دیکھی ہے۔ مگر قرآن نے یہ نہیں بتایا کہ نجات پانے والوں نے بعد میں دُنیا اور دُنیاوی زندگی کے اندر کیا پارٹ ادا کیا۔ ان اقوام کی تباہی کی یہ مثالیں بتاتی ہیں کہ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ مکذوبین اور ظالمین کو دُنیا کے اندر ہی عذاب کا ایک حصہ چکھا دیتا ہے۔ باقی رہی کامل سزا تو وہ صرف آخرت پر اُٹھا رکھی گئی ہے۔ اس دعوت نے فرعون اور اس کے لشکریوں کی غرقابی کو بھی دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا کہ کس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو بچالیا گیا۔ اور پھر اُسے مُلک کے اندر اقتدار کی مسند پر بٹھایا گیا۔ اور یہ وہ دور تھا جب یہ قوم اپنی پوری تاریخ میں نسبتاً صالح ترین قوم تھی ۔ اگرچہ وہ کبھی بھی استقامت کاملہ کے مرتبہ تک ترقی نہ کرسکی، اور اُس نے دُنیا کے اندر دین الٰہی کو زندگی کے جامع نظام کی حیثیت سے برپا نہ کیا۔ یہ نمونہ پہلے نمونوں سے مختلف ہے۔ تاریخ دعوت نے اسی طرح ان مشرکین کی لاشوں کے انبار بھی دیکھے جنھوں نے ہدایت سے منہ موڑا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے انکار کیا اور یہ بھی دیکھا کہ جب اہلِ ایمان کے دلوں پر عقیدہ کی حیرت انگیز حد تک حکمرانی قائم ہوگئی تو دنیا کے اندر نصرتِ کاملہ نے کس طرح آگے بڑھ کر ان کے قدم چومے۔ اور پہلی مرتبہ تاریخ انسانی نے یہ منظر بھی دیکھا کہ اللہ کا نظام انسانی زندگی کے اصل حاکم کی حیثیت سے عملاً قائم ہوا ۔ یہ ایک ایسی صورت تھی کہ انسانی تاریخ نے نہ اس سے پہلے کبھی اس کا مشاہدہ کیا تھا اور نہ بعد میں ۔ اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں دعوتِ اسلامی کی تاریخ نے اصحاب الاخدود کا نمونہ بھی دیکھا ہے۔ علاوہ

ازیں تاریخ نے قدیم اور جدید زمانے میں اور بھی کئی مناظر دیکھے ہیں۔ جو تاریخ ایمان کے دفتر میں زیادہ نمایاں جگہ نہیں پا سکے۔ اور ابھی تک اُس کی آنکھ طرح طرح کے نمونے دیکھ رہی ہے جو انہی انجاموں میں سے کسی نہ کسی انجام سے دوچار ہوتے جا رہے ہیں جو صدیوں سے تاریخ کے سینے میں محفوظ چلے آ رہے ہیں۔

اصحاب الاخدود کا جُدا گانہ انجام اور اہلِ ایمان کے لیے اس واقعہ میں اصل عبرت

دوسرے نمونوں کا ذکر بھی بے شک ضروری ہے مگر اُس نمونے کے ذکر کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے جس کی نمائندگی اصحاب الاخدود کرتے ہیں۔ یہ وہ ناگزیر نمونۂ عبرت ہے جس میں اہل ایمان کو نجات نہیں ملتی ، اور اہل کفر کی بھی دنیا میں گرفت نہیں ہوتی۔ یہ اس لیے ہے کہ تاکہ اہلِ ایمان اور داعیانِ حق کے شعور میں یہ بات پوری طرح اُتر جائے کہ راہِ حق میں انہیں بھی ایسے ہی انجام سے دوچار کیا جا سکتا ہے، اس بارے میں اُن کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ ان کا اور ان کے ایمان کا معاملہ سراسر اللہ کے سپرد ہے ۔ ان کی ذمہ داری بس یہ ہے کہ وہ اپنے فرض کو سرانجام دیں اور رخصت ہو جائیں، ان کا فرض یہ ہے کہ وہ صرف اللہ کو اپنے لیے پسند کر لیں، زندگی پر عقیدہ کو ترجیح دیں اور آزمائش میں ڈالیں جائیں تو ایمان کی مدد سے اس پر غلبہ پائیں، زبان اور نیت سے بھی اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ اور اُن کے دشمنوں کے ساتھ جو چاہے کرے اور اپنے دین اور اپنی دعوت کے لیے جو مقام چاہے منتخب کر لے۔ وہ چاہے تو ان کو اُن انجاموں میں سے کسی انجام کے حوالے کرے جن سے اہلِ ایمان وعزیمت تاریخ میں دوچار ہوتے رہے ہیں، یا اُن کے لیے کوئی ایسا انجام پسند فرمائے جسے وہ خود ہی جانتا اور دیکھتا ہے۔

مومنین اللہ کے اجیر اور کارندے ہیں

اہلِ ایمان اللہ کے اجیر اور کارندے ہیں۔ وہ جو کچھ ان سے کام لینا چاہتا ہے، جہاں اور جب چاہتا ہے

،اور جس انداز سے چاہتا ہے،ان کا کام اُسے انجام دینا اور طے شدہ معاوضہ لینا ہے۔دعوت کا کیا انجام ہوتا ہے یہ ان کی ذمہ داری میں شامل نہیں ہے اور نہ یہ اُن کے بس کی بات ہے۔یہ مالک کی ذمہ داری ہے،مزدور اور کارکن کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

اہلِ ایمان اپنی مزدوری کی پہلی قسط دنیا ہی میں وصول کر لیتے ہیں۔یہ قسط ہے زندگی بھر طمانیت قلب ،احساس وشعور کی بلندی ،تصورات کا حُسن اور پاکیزگی ،سفلی ترغیبات اور گھٹیا خواہشوں سے آزادی ،خوف وقلق سے نجات دوسری قسط بھی وہ اسی محدود دنیا کے اندر ہی وصول کر لیتے ہیں۔جو انہیں ملاء اعلیٰ میں ستائش ،ذکر خیر اور تکریم کی شکل میں ملتی ہے وہ اللہ کی خوشنودی ہے،اور اللہ کی یہ عنایت ہے کہ اُسی نے انہیں اس مقصد کے لیے منتخب کرلیا ہے کہ دست قضا میں صورت شمشہ ہوں،اور اللہ کی قدرت وحکمت کی ڈھال بنیں تا کہ وہ دنیا کے اندران کے ذریعہ سے جو چاہے کرشمہ سازی کرے۔

صدر اوّل کے اہلِ ایمان

قرآن کریم نے صدر اوّل میں اہل ایمان کی برگزیدہ جماعت کو ترتیب دی تھی وہ ارتقاء وکمال کے اسی درجۂ بلند کو پہنچی ہوئی تھی۔چنانچہ انہوں نے اپنی انفرادیت کو کلیۃً فنا کر دیا،اور کارِ دعوت میں انہوں نے ''انا'' کو ہمیشہ لیے فارغ خطی دے دی،وہ صرف صاحب دعوت کے لیے مزدور اور کارکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔وہ بہرحال اور ہر بات میں اللہ کے اس انتخاب اور فیصلے پر راضی رہے ۔نبوی ترتیب ان کے دلوں اور نگاہوں کو جنت کی طرف متوجہ کر رہی تھی اور انہیں تلقین کر رہی تھی کہ جو پارٹ ان کے لیے پسند کیا گیا ہے وہ اسے ثابت قدمی کے ساتھ اس وقت تک ادا کرتے رہیں جب تک اللہ تعالیٰ اپنا وہ فیصلہ نہیں نازل فرما دیتا جو دنیا میں اسے مطلوب ہے اور آخرت کے لحاظ سے بھی اُسے محبوب ہے۔آنجناب ﷺ مکہ میں حضرت عمار اور ان کی والدہ اور ان کے والد رضی اللہ عنہم کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ انہیں شدید عذاب دیا جا رہا ہے،مگر آپ اس سے زیادہ کچھ نہ فرماتے:صبراً یا

آلِ یـاسـر، مـوعـدكـم الجنة . (اے آل یاسر! صبر کرو کا دامن نہ چھوٹنے پائے ،تم سے جنت کا وعدہ ہو چکا ہے) حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے سائے میں چادر کی ٹیک لگائے آرام فرما رہے تھے کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور عرض کیا: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سے ہماری نصرت کیوں نہیں مانگتے ،اور ہمارے لیے دعا کیوں نہیں کرتے ؟'' آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:تم سے پہلی امتوں کا یہ حال تھا کہ ایک آدمی کو پکڑ لیا جاتا اور اُس کے لیے زمین میں گڑھا کھود کر اس کو اس میں اُتار دیا جاتا، پھر آری لا کر اُسے سر سے نیچے تک دوٹکڑوں میں چیز ڈالا جاتا۔اُن کے جسموں پر گوشت اور ہڈیوں کے درمیان لوہے کی کنگھیاں پھیری جاتیں۔لیکن یہ سب کچھ انہیں دین سے نہ ہٹا سکتا۔اللہ کی قسم ،اللہ اس دین کو مکمل کر کے چھوڑے گا اور وہ وقت آئے گا کہ ایک سوار صنعاء سے حضرموت تک اکیلا سفر کرے گا مگر اُسے کوئی خوف نہ ہوگا ،صرف اللہ کا خوف ہوگا یا بکریوں پر بھیڑیے کے حملے کا۔لیکن تم لوگ جلد بازی کرتے ہو۔'' (بخاری)

مومن اور اللہ کی حکمت بے پایاں

ہر کام اور ہر حال کی تہ میں اللہ کی حکمت کارفرما ہے۔وہی پوری اس کائنات کی تدبیر کر رہا ہے۔اس کے آغاز وانتہا سے باخبر ہے۔اس دنیا کے اندر جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا ہے وہی اس کی تنظیم کرتا ہے، پردۂ غیب میں جو حکمت ومصلحت پوشیدہ ہے صرف وہی اُس کو جانتا ہے۔یہ حکمت ومصلحت تاریخ کے پورے سفر میں اُس کی مشیت کے تابع چلی آرہی ہے۔بعض اوقات اللہ تعالیٰ کئی صدیوں اور نسلوں کے گزر جانے کے بعد ایک ایسے واقعہ کی حکمت سے پردہ اُٹھاتا ہے جسے عہد واقعہ کے لوگ نہ سمجھتے تھے ۔اور شاید وہ اسی ٹوہ میں رہے ہوں گے کہ یہ واقعہ کیوں پیش آیا اور اپنے پروردگار سے سوال کرتے رہے ہوں گے کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔یہ سوال ہی بجائے خود ایک جہالت ہے جس سے مومن بچتا رہتا ہے ۔اُسے پہلے ہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ہر فیصلے میں حکمت پنہاں ہے۔مومن کا وسیع تصور اور زمان

ومکان اور اوزان واقدار کے بارے میں اُس کی ژرف نگاہی اُسے یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ یہ سوال سوچ بھی سکے۔ چنانچہ وہ قافلۂ قضاوقدر کا پورے اطمینان اور تسلیم ورضا کے عالم میں ہمسفر رہتا ہے۔

قرآن کی اصل تربیت

قرآن ایسے قلوب پیدا کررہا تھا جو بارامانت (اشارہ ہے خلافت الٰہی کے قیام کی طرف) اٹھانے کے لیے تیار ہوجائیں اور ضروری تھا کہ یہ قلوب اتنے ٹھوس اور مضبوط اور پاکیزہ وخالص ہوں کہ اس راہ میں اپنی ہر چیز نچھاور کردیں اور ہر آزمائش کا خیر مقدم کریں اور دوسری طرف دنیا کے مال ومتاع میں سے کسی چیز پر نظر رکھنے کے بجائے صرف آخرت کو اپنا مطمحِ نظر بنائیں اور صرف رضائے الٰہی کے طلب گار رہیں۔ گویا ایسے بے نظیر قلوب ہوں جو سفرِ دنیا کو تادم آخریں تکلیف وتنگی، محرومی وکم نصیبی، عذاب وجانکاہی اور سرفروشی وایثار پیشگی کے اندر گزارنے کے لیے تیار ہوں، اور اس دنیا کے اندر کسی عاجلانہ جزا کی اُمید نہ رکھیں خواہ یہ جزا دعوت کے فروغ، اسلام کے غلبہ اور مسلمانوں کی شوکت کی شکل میں ہی کیوں نہ ظاہر ہو بلکہ ظالموں کی ہلاکت اور ان کی عبرت ناک پکڑ کی صورت ہی کیوں نہ اختیار کرے ۔جیسا کہ پچھلے مکذبین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔

ضروری نہیں کہ اہل ایمان کو دنیاوی غلبہ حاصل ہو

جب اس پائے کے قلوب وجود میں آ گئے جو اس یقین سے سرشار تھے کہ دنیا کے سفر میں کسی اجر ومعاوضہ کے بغیر انہیں ہر خدمت اور ہر قربانی انجام دینی ہے، اور جو سمجھتے تھے کہ صرف آخرت ہی حق وباطل کے درمیان اصل فیصلہ ہوگا۔ جب ایسے کھرے قلوب مہیا ہوگئے، اور اللہ تعالیٰ نے دیکھ لیا کہ انہوں نے جو سودا کیا ہے اس میں وہ سچے اور مخلص ہیں تب اللہ تعالیٰ نے زمین میں اُن پر نصرت نازل فرمائی اور زمین کی امانت انہیں سونپ دی۔ مگر یہ امانت اس لیے انہیں نہیں دی کہ وہ اسے ذاتی تصرف میں لائیں بلکہ اس لیے دی کہ وہ نظام حق برپا کریں۔ اس گراں بارامانت کو اُٹھانے کی اہلیت واستحقاق

انہیں اُسی روز حاصل ہوگیا تھا جب کہ اُن سے دنیا کے اندر کسی کامیابی اور فائدہ کا وعدہ نہیں کیا گیا تھا جس کا وہ تقاضا کرتے، اور نہ خود ان کی نگاہیں دنیاوی غنائم پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ صحیح معنوں میں اُسی روز سے اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہو چکے تھے جس روز سے اُن کی نگاہوں کو رضائے الٰہی کے سوا کسی اجر و مزد کی تلاش نہ رہی۔

قرآن کی جن آیات میں نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے، یا مغانم کا ذکر ہوا ہے یا یہ اطلاع دی گئی ہے کہ مشرکین کو دنیا کے اندر ہی اہل ایمان کے ذریعہ کیفرِ کردار تک پہنچا دیا جائے گا۔ ایسی تمام آیات مدنی دور میں نازل ہوئی ہیں۔ یہ تب نازل ہوئی ہیں جب یہ تمام چیزیں اہلِ ایمان کے پروگرام سے خارج ہو چکی تھیں، اور انہیں ان میں سے کسی چیز کا انتظار رہا تھا اور نہ طلب۔ نُصرتِ الٰہی خود بخود نازل ہوئی اور اس لیے نازل ہوئی کہ مشیتِ الٰہی کا یہ تقاضا تھا کہ نظامِ حق انسانی زندگی کے اندر عملی پیکر بن کر نمودار ہو کر ایسی جیتی جاگتی تصویر بن جائے جسے انسان بچشم خود دیکھ لیں۔ یہ نصرت اہلِ ایمان کی محنت و مشقت اور ان کی سرفروشیوں اور قربانیوں کا انعام نہیں تھا۔ بلکہ یہ اللہ کا ایک فیصلہ تھا جس کے بطن میں اللہ کی وہ حکمتیں اور مصلحتیں چھپی ہوئی تھیں جنہیں ہم آج دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

دنیاوی غلبہ مشیتِ الٰہی کے تحت ہوگا نہ کہ صِلہ کے طور پر

دعوت کا یہ وہ پہلو ہے جس پر ہر ملک اور ہر قوم اور نسل کے داعیانِ حق کو پورا غور و تدبر کرنا چاہیے۔ صرف یہی ایک پہلو انہیں راہِ حق کے تمام نشانات اور خطوط کو صاف صاف کسی ابہام و غموض کے بغیر دکھا سکتا ہے۔ اور اُن بندگانِ صدق و صفا کو ثابت قدمی بخش سکتا ہے جو یہ ارادہ کر چکے ہیں کہ وہ راہِ حق کو اس کی انتہاء تک طے کریں گے خواہ یہ انتہا کیسی کچھ ہو۔ اور اللہ نے اپنی دعوت کے لیے اور ان کے لیے جو کچھ بھی مقدر فرما رکھا ہے وہ درست ہے۔ اس پر آشوب اور خون آشام راستے کو جو کاسۂ ہائے سر سے پٹا ہوا ہے طے کرتے وقت وہ کبھی نصرت و غلبہ کے لیے چشم براہ نہیں رہیں گے یا اِسی دنیا کے اندر حق

وباطل کے درمیان فیصلہ کے لیے بے تاب نہ ہوں گے۔البتہ اگر خود ذات الٰہی اپنی دعوت اور اپنے دین کی مصلحت کی خاطر ان سے ایسا کوئی کام لینا چاہے گی تو اسے پورا کر کے رہے گی۔مگر یہ ان کی قربانیوں اور جانفشانیوں اور آلام ومصائب کا صلہ ہرگز نہ ہوگا۔ یہ دنیا دارالجزا نہیں ہے۔ بلکہ یہ اللہ کی مشیت اور فیصلے کی تنفیذ ہوگی جو وہ اپنی دعوت اور اپنے نظام کے بارے میں طے فرمائے گا۔اور جس کے لئے اپنے کچھ بندوں کو منتخب فرمائے گا تا کہ ان کے ذریعے وہ اپنی مشیت کو پورا کرے۔ان کے لیے یہی شرف کافی ہے کہ قرعہ فال ان کے نام نکل آیا۔اس شرف کے آگے دنیا کی زندگی اور اس میں پیش آنے والی آسائشیں اور تکلیفیں ہیچ اور حقیر ہیں۔

اہل ایمان کی جنگ سیاسی نہیں ہے بلکہ عقیدہ کی جنگ ہے

یہاں ایک اور حقیقت قابل غور ہے جس کی طرف قرآن نے اصحاب الاخدود کے واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ذیل کی آیت میں اشارہ کیا ہے:

وَمَا نَقَمُوا مِنهُم اِلَّا اَنْ یُّؤمِنُوا بِاللّٰهِ العَزِیزِ الحَمِیدِ ۔

''اور وہ اہل ایمان سے صرف اس وجہ سے چڑے کہ وہ اللہ عزیز وحمید پر ایمان لا چکے تھے''۔

اس حقیقتِ قرآن پر بھی داعیانِ حق کو ہر دور اور ہر ملک کے داعیانِ حق کو گہری نگاہ سے غور وتأمل کرنا چاہیے۔اہلِ ایمان اور ان کے حریفوں کے درمیان جو جنگ برپا ہے یہ درحقیقت عقیدہ وفکر کی جنگ ہے،اس کے سوا اس جنگ کی اور کوئی حیثیت قطعاً نہیں ہے۔ان مخالفین کو مومنین کے صرف ایمان سے عداوت ہے اور ان کی تمام برافروختگی اور غیض وغضب کا سبب وہ عقیدہ ہے جسے مومنین نے حرز جاں بنا رکھا ہے۔ یہ کوئی سیاسی جنگ ہرگز نہیں ہے۔نہ یہ اقتصادی یا نسلی معرکہ آرائی ہے۔اگر اس نوعیت کا کوئی جھگڑا ہوتا تو اسے با آسانی چکایا جا سکتا تھا۔اور اس کی مشکلات پر قابو پایا جا سکتا تھا لیکن یہ تو اپنے

جو ہر وروح کے لحاظ سے خالصتہً ایک فکری جنگ ہے۔ یہاں امر متنازع فیہ یہ ہے کہ کفر رہے گا یا ایمان جاہلیت کا چلن ہوگا یا اسلام کی حکومت!

مشرکین کے سرداروں نے رسول اللہ ﷺ کو مال ودولت ،حکومت اور دوسرے ہر طرح کے دنیوی مفادات پیش کیے اور ان کے مقابلے میں صرف ایک چیز کا مطالبہ کیا اور وہ یہ کہ آپ عقیدہ کی جنگ ترک کردیں ،اور اس معاملے میں اُن سے کوئی سودے بازی کرلیں۔ اور اگر اللہ نخواستہ آپ اُن کی یہ خواہش پُوری کردیتے تو آپ کے ان کے درمیان کوئی جھگڑا باقی نہ رہتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایمان وکفر کا مسئلہ ہے اور اس کشمکش کی تمام تر بنیاد عقیدہ پر ہے۔ مومنین کو جہاں کہیں اعداء سے سامنا ہو یہ بنیادی حقیقت ان کے دل ودماغ پر منقش رہنی چاہیے۔ اس لیے کہ اعداء کی تمام تر عداوت وخفگی کا سبب صرف یہ عقیدہ ہے کہ ''وہ اس اللہ پر ایمان رکھتے ہیں جو غالب اور حمید ہے'' اور صرف اسی کی اطاعت کرتے ہیں اور اُسی کے آگے سر افگندہ ہیں۔

دشمنانِ اسلام اس جنگ کو دُوسرے معنی پہناتے ہیں

اعداء یہ ہتھکنڈہ بھی استعمال کرسکتے ہیں کہ عقیدہ ونظریہ کے بجائے کسی اور نعرہ کو اس جنگ کا شعار بنادیں۔ اور اسے اقتصادی یا سیاسی یا نسلی جنگ ثابت کرنے کی کوشش کریں تاکہ مومنین کو اس معرکہ کی اصل حقیقت ے بارے میں گھپلے میں ڈال دیں اور عقیدہ کی جو مشعل ان کے سینوں میں فروزاں ہے اُسے بجھادیں۔ اہلِ ایمان کو اس بارے میں کسی دھوکے کا شکار نہ ہونا چاہیے۔ اور انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اعداء کے یہ الجھاوے ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہیں۔ اور جو اس جنگ میں کوئی اور نعرہ بلند کرتا ہے تو دراصل وہ یہ چاہتا ہے کہ اہلِ ایمان کو اس ہتھیار سے محروم کردے جو ان کی کامیابی وظفرمندی کا اصل راز ہے، یہ کامیابی جس شکل میں بھی ہو۔ چاہے اُس روحانی بلندی اور آزادی کے رنگ میں ہو جو اخدود کے واقعہ میں اہلِ ایمان کو نصیب ہوئی یا اس بلندی کی بدولت حاصل ہونے

والے مادی غلبہ کی صورت میں جس سے صدر اول کے مسلمان سرفراز ہوئے۔

مقصدِ جنگ اور شعار معرکہ کو مسخ کرنے کی مثال آج ہمیں بین الاقوامی عیسائیت کی اس کوشش میں نظر آتی ہے، جو ہمیں اس فکری جنگ کے بارے میں طرح طرح کے فریبوں میں مبتلا کرنے کے لئے صرف ہورہی ہے اور تاریخ کو مسخ کرکے یہ افترا پردازی کی جارہی ہے ہ صلیبی جنگوں کے پس پردہ سامراجی حرص کارفرما تھی، یہ سراسر جھوٹ ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سامراج جس کا ظہور ان جنگوں کے بہت بعد ہوا ہے وہ صلیبی روح کا آلہ کار بنارہا ہے۔ کیونکہ یہ صلیبی روح جس طرح قرون وسطٰی میں کھل کر کام کرتی رہی ہے اس طرح اب وہ بغیر نقاب کے نہیں آسکتی تھی۔ یہ عقیدۂ اسلام کے ان معرکوں میں پاش پاش ہوچکی تھی جو مختلف النسل مسلمان رہنماؤں کی قیادت میں برپا ہوئے۔ ان میں صلاح الدین اور خاندانِ عمالیک کے توران شاہ کُردی تھے۔ ان لوگوں نے اپنی قومیتوں کو فراموش کرکے صرف عقیدہ اور نظریہ ہی کو یاد رکھا۔ اور عقیدہ ہی بدولت وہ ان کامیابیوں سے ہم کنار ہوئے۔

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّا اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ـ

اللہ تعالٰی کا فرمان بالکل سچا ہے، اور یہ جعل ساز اور فریب پیشہ لوگ جھوٹے ہیں۔

مسلم ورلڈ ڈیٹا پروسیسنگ پاکستان

http://www.muwahideen.tk

info@muwahideen.tk